مقالات سید العلماء

علامہ سید علی نقی النقوی

حصہ دوم

حضرت فاطمه زهرا
صلوة الله علیها
حضرت امام حسن علیه السلام
حضرت امام علی علیه السلام
حضرت امام حسین علیه السلام
حضرت امام جعفر صادق علیه السلام
حضرت امام محمد باقر علیه السلام
حضرت امام زین العابدین علیه السلام
حضرت امام محمد تقی علیه السلام
حضرت امام علی رضا علیه السلام
حضرت امام موسی کاظم علیه السلام
حضرت امام زمان
حضرت امام حسن عسکری علیه السلام
حضرت امام علی نقی علیه السلام

زین العابدین
علیه السلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

پیغام بنام محمد وصی خاں

صدر مرکزی تنظیم عزا رجسٹرڈ کراچی

بلعالی خدمت، والا مرتبت، کیوان رفعت، برجیس حشمت، کوکب تابندہ بخت فصاحت۔ ماہ درخشندہ جبین بلاغت، نیّر اعظم سپہر خطابت تاجدار ذی وقار اقلیم طلاقت، سلطان المتکلمین، صدر المجتہدین العمادی والاعمادی سرکار سید العلماء سید علی نقی صانہ اللہ الباری الہادی نے مقالات سید العلماء کی اشاعت کے سلسلے میں مرتّب مقالات جناب محمد وصی خاں کو بذریعہ خط علیگڑھ سے ایک پیغام ارسال فرمایا ہے۔

مجتہد العصر سرکار علامہ نقن صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے لکھا ہے کہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؁

۱۶؍ شعبان ۱۴۰۰ھ

سلام مسنون!

آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا ہے وہ موزوں و مناسب ہی ہوگا اور اس سلسلے میں آپ نے خدمت دین و ملّت کی نیّت سے جو کوشش فرمائی ہے وہ قابل قدر ہے۔ خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے لئے اصل چیز عادل حکیم کا انتخاب ہے اگر کوئی ایک جملہ، کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار رضا پر پورا اُترے تو وہ میرے لئے ذخیرۂ آخرت بن سکتا ہے۔

واللہ ولی التوفیق

علی نقی النقوی

اصل تحریر متذکرہ بالا کا عکس صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۶ ذی قعدہ ۱۴۰۱ھ

محبّی جناب محمد حسن خان صاحب صدر مرکز تنظیم عزا

سلام مسنون۔ آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا ہے

وہ عمدہ اور مناسب ہوگا اور اس سلسلہ میں آپ نے

خدمت دین و ملت کی حیثیت سے جو کوشش فرمائی ہے،

وہ قابل قدر ہے،

خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے

میرے لئے اصل چیز عادل حکم کا انتخاب ہے۔ اگر

کوئی ایک جلد کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار

مکمل
رضا پر پورا اترے تو وہ ذریعہ ذخیرۂ آخرت ہے

واللہ ولی التوفیق

علی نقی النقوی

مذکورہ بالا سطور کو آپ اپنا تقریظ بنا سکتے ہیں۔

مضمون تصویر جو میری بیماری اور اس دوران جو کھینچی گئی تھی

وہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے آپ مقصل میں بھی چھاپیں۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	انتساب عقیدت	۵
۲	کتاب کے بارے میں	۶
۳	حقیقت اسلام	۷
۴	خدا کا ثبوت	۲۶
۵	جبر و اختیار	۳۶
۶	تقیہ	۵۱
۷	تدوین حدیث	۷۷
۸	حدیث حوض	۱۱۱
۹	شیعیت کا تعارف	۱۳۶
۱۰	مذہب شیعہ ایک نظر میں	۱۶۴
۱۱	مذہب شیعہ اور تبلیغ	۱۹۱
۱۲	بنی امیہ کی عداوت اسلام کی ایک مختصر تاریخ	۲۱۳
۱۳	خلافت یزید سے متعلق آزاد رائیں اور ضمیر کی آوازیں	۲۲۵
۱۴	واقعہ کربلا کی اہمیت	۲۳۵
۱۵	اسیران اہل حرم	۲۳۹
۱۶	ہلاکت اور شہادت	۲۷۱
۱۷	واقعہ کربلا کی تبلیغی شان حسینؑ کے خون کا ہر قطرہ ایک مبلغ مذہب تھا	۲۸۹
۱۸	مقصود کعبہ حیرت انگیز ولادت اور عقول کی حیرت انگیز ٹھوکریں	۲۹۸
۱۹	معراج انسانیت سیرت مرتضویؑ کی روشنی میں	۳۱۱

maablib

انتسابِ عقیدت

میری شہرت کا سبب مدحتِ حیدر ہے وصیؔ
ورنہ اربابِ سخن میں میرا رتبہ کیا ہے

ساری حمد و مدحت سزاوار ہے اس خالقِ عالم واجب بے پایاں الوجود علیم و کلیم و قدیر پروردگار کے لئے جس کا کوئی شریک و نظیر نہیں۔ بے پنہاں درود و سلام ہے اس ہادی اعظم سرورِ عالم پیغمبر خاتم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے لئے جن کی عترت اطہار کے ائمہ ابرار عصمت و طہارت جو اس درود و سلام میں ان کے شریک و سہیم ہیں اس لئے میں اپنے دل کی تمام گہرائیوں دماغ کی تمام وسعتوں روح کی تمام بالیدگیوں اور عقیدت و محبت اور شوق کی تمام ایمانی کیفیتوں کے ساتھ اس ہدیہ ولا اور نذرانہ عقیدت کو سید الشہداء لختِ جگر علیؑ و فاطمہؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام نامی واسم گرامی سے معنون کرتا ہوں اور مستدعی ہوں کہ اس ہدیہ حقیر فقیر عاصی پر معاصی کو شرفِ قبولیت بخشا جائے تاکہ قبولِ عام ہو اور مجھ گنہگار کی آخرت کا توشہ ہو کر مغفرت کے کام آئے۔

مولا حسینؑ میرے والد محمد عسکری خان اور حاجی حسن علی ابن رحمت اللہ بانی رحمت اللہ ٹریک ایجنسی کی شفاعت فرمائیے اور جنتِ الفردوس میں قرب ائمہ اہلبیت اطہار علیہم اسلام جگہ عطا فرمائے۔

میرے مولا و آقا آپ کے ماننے والوں میں آجکل جو اختلاف اور رنجشیں بڑھتی جارہی ہیں اس کو دور فرما دیجئے ان کو تسبیح فاطمہؑ کے دانوں کی طرح ایک تسبیح میں پرو دیجئے اور دشمنوں کے شر سے اپنی امان میں رکھیئے۔

(وصی خان)

کتاب کے بارے میں

یہ کتاب "مقالات سید العلماء جلد دوم" جس کی اشاعت رحمت اللہ بک ایجنسی کراچی نے کی ہے۔

اس جلد میں بھی جلد اوّل کی طرح آیت اللہ صدر المجتہدین سرکار سید العلماءؒ سید علی نقی صاحب قبلہ کے نایاب معلوماتی مضامین کا ایک نایاب علمی خزانہ ہے جس کو مختلف اخبارات۔ رسائل اور کتابوں سے حاصل کر کے یکجا کیا ہے۔

اس کتاب میں بڑے قیمتی اور معلوماتی مضامین ہیں جن کو علامہ علی نقی صاحب قبلہ کی زندگی میں امامیہ مشن لکھنؤ (انڈیا) اور امامیہ مشن لاہور (پاکستان) نے شائع کیا تھا اس کے علاوہ انڈیا اور پاکستان سے شائع ہونے والے مذہبی رسالے اور اخبارات کی بھی زینت بنتے رہے ہیں

خادم نے اجرِ رسالت اور خدمتِ دین سمجھتے ہوئے ان جملہ مضامین کو یکجا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے ساتھ ہی ساتھ میرے عزیز دوست اکبر حسین ابن حاجی حسن علی رحمت اللہ مالک رحمت اللہ بک ایجنسی نے اس کی اشاعت اپنے ذمہ لی ہے۔

علامہ علی نقی صاحب قبلہ نے ان مضامین میں مذہب حقہ کی صداقت کو جس طرح اجاگر کیا ہے اس کی تعریف توصیف میرا جیسا کم علم شخص نہیں کر سکتا لیکن مومنین کرام سے گذارش ضرور کروں گا کہ اس کتاب کو ضرور خریدیں اور اپنے بچوں کو اس کے مضامین سے ضرور روشناس کروائیں۔

وصی خانؔ

حقیقتِ اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلوٰۃُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ۔

"اسلام" گویا ایک "خواب" تھا جسے کثرتِ تعبیر نے پریشان بنا دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام فقط کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا نام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص شہادتین کا اقرار کرتا ہو اور ان عبادات کا پابند ہو تو وہ سچا مسلمان ہے، چاہے اپنے اخلاق میں وہ کتنا ہی پست اور دوسروں سے معاملات میں کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو۔ اسلام کی اسی تعبیر کی بنا پر آج مردم شماری کی بنیاد ہے اور ہیں بھی اسلام کے رسمی احکام کے لحاظ سے اسے مان لونگا مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ قانونی طور پر مسلمانوں کے خانہ میں نام درج ہو جانا اور چیز ہے اور حقیقی مسلمان ہونا دوسری چیز ہے۔ کیا ایسے ہی مسلمان وہ ہو سکتے ہیں کہ جنہیں خدا نے دنیا کی آبادی کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ان ہی لوگوں سے وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (تم سب سے بلند رہو گے) کا وعدہ پورا ہو سکتا ہے اور یہی وہ ہیں جو زمین کے حاکم اور مالک بنائے جا سکیں؟

اس خیال کا ردِعمل یہ تھا کہ بعض لوگوں کو اس کا احساس شدید پیدا ہو گیا کہ یہ چیزیں اسلام کی بنیاد اساسی نہیں ہو سکتیں۔ انہوں نے اسلام کی تعبیر غلبہ و اقتدار سے کر لی اور ذوقِ جہانبانی و شوقِ حکمرانی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور نظامِ عسکریت کو اس کا اصل اصول قرار دیا گیا۔ کیا یہ اسلام کی صحیح تفسیر ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اسے صحیح مانا جائے تو بڑے بڑے ظالم سلاطین جنہیں یہ ذوقِ ملک گیری بہت شدید تھا سچے مسلمان سمجھے جائیں۔ مسلمان کا نام محدود ہو جائے نپولین، تیمور اور نادر میں اور آج ہٹلر اور مسولینی سب سے بڑے مسلمان ہوں مگر کیا "اسلام" کی پاکدامنی اور صلح پسندی اس تعبیر کی متحمل ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

کیا ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں، مسجد کی محرابوں میں، بازارِ تجارت میں سچے مسلمانوں کا وجود نہیں ہو سکتا۔ کیا رسول اللہ کی مسجد کے اصحابِ صفہ اور سلمان، ابوذر کے ایسے لوگ جو میدانِ جنگ کے شہسوار نہیں تھے۔ اسلام سے محروم سمجھے جائیں گے۔

کیا بے موقع اور بے محل اقدامِ جنگ بھی اسلام کی حقیقی روح ہو گا۔ اور کیا زمانۂ امن و صلح میں بھی نظامِ عسکری ہی مذہب کا مستقل آئین سمجھا جائیگا۔

کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ اطاعتِ حاکم اور ذوقِ انقیاد کو بڑی چیز سمجھا اور اسے اسلام کے اصول میں خاص اہمیت دے دی۔

مگر کیا ہر حاکم کی اطاعت اسلام کا مقصد ہو سکتا ہے اور ہر ایک کے سامنے سر جھکا دینا اس کا نصب العین بن سکتا ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان تمام لوگوں نے اسلام کے وسیع و مکمل مفہوم میں سے ایک ایک جزو لے لیا ہے اور اسی کو سب کچھ قرار دے کر حد سے بڑھا دیا ہے۔

"حقیقت اسلام" ایک بلند اور کامل نصب العین ہے جس میں کلمہ نماز اور روزہ حج اور زکوٰۃ بھی داخل ہیں۔ بلند مقاصد کی حفاظت کیلئے سرفروشی و جانبازی بھی اسکا ایک جزو ہے۔ نظام عسکری بھی ان مقاصد کے تحفظ کے لئے ضروری ہے اور اطاعت حاکم بھی ان اصولوں کے ماتحت جو حقائق اسلامی کے محافظ ہوں ضروری قرار دی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے وہ شعبے ہیں جو مذکورہ حدود میں داخل نہیں ہوتے۔

"اسلام مجموعہ ہے عقائد اور اعمال کا۔ عقائد وہ جو عمل کا احساس پیدا کرنے والے ہیں' اعمال وہ جو عقیدہ پر چلا کرنے والے ہیں' عقائد وہ جو تمام خلائق کے مقابلہ میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے والے اعمال وہ جو دنیا کی شیرازہ بندی کرنیوالے اور اجتماعی نظام کو قوت پہنچانے والے عقائد وہ جو اصلاح کی دعوت دینے والے' اعمال وہ جو اصلاح کے مقصد کی تکمیل کرنیوالے ہیں۔ اسلام کی حقیقت کے لئے اگر ہم ایک جامع لفظ تلاش کرنا چاہیں تو وہ صرف "فرض شناسی" ہے۔ اسکی وسعت دیکھئے تو عقائد اور اعمال کی پوری دنیا آجائے۔

تمام عقائد اسی فرض شناسی کے جذبہ کو بیدار کرنے والے اور تمام اعمال اسی فرض شناسی کے خارجی مظاہرے ہیں ٥

اسی فرض شناسی میں حقوق اللہ داخل ہیں۔ اسی میں حقوق الناس اسی

میں اچھائیوں کی پابندی بھی مضمر ہے۔ اسی میں برائیوں سے علیحدگی۔

اسی میں حاکم کی اطاعت درج ہے اور اسی میں نظام اجتماعی کا استحکام اور مرکز کا متحد ہونا بھی مشترک فرائض کی تکمیل کی ایک لازمی شرط ہے۔

یہ خیال کرنا کہ اسلام بس کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں مکمل ہو جاتا ہے درست نہیں ہے۔ آخر سچائی، انصاف، امانتداری، حفاظت شناسی کا بھی تو کوئی درجہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ بھی تو کوئی چیز ہے۔

اسی طرح یہ سمجھنا کہ اسلام بس غلبہ واقتدار اور نظام عسکری کی تشکیل کا نام ہے، یہ بھی غلط ہے اس کے ساتھ رحم وکرم مواسات وایثار اور خدا کی بندگی کے انفرادی فرائض اور حقوقِ خلق کا لحاظ بھی تو ضروری ہے۔

وہ مسلمان کیا کریں جنہیں ناسازگار فضا میں رہنا ہو جہاں حصولِ اقتدار کا کوئی موقع نہ ہو اور نظام عسکری کا وجود نہ ہو سکے۔ کیا یہ لوگ اپنے تئیں مسلمان نہ سمجھیں اسلئے کہ اسلام کی طرف سے اب ان کے لئے کوئی نصب العین باقی نہیں رہا۔

وہ مسلمان جو تقسیم عمل کی بنا پر دوسرے اقتصادی اور علمی کام انجام دیتے ہیں اور فوجی نظام میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیا وہ اپنے تئیں حقیقت اسلام سے بیگانہ سمجھ لیں اور کیا جس وقت مستقل امن قائم ہو جائے اور نظام عسکری کی ضرورت باقی نہ رہے اس وقت کیلئے اسلام کا کوئی نظام نہیں ہے اور کیا اُس وقت خود اسلام کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حاکم کی اطاعت فرض ہے مگر بڑا غلط خیال ہے یہ کہ مسلمانوں کا ہر بادشاہ امام اور اسکی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔

مسلمانوں کے بادشاہوں میں ایسے اشخاص بھی ہوسکتے ہیں۔ جو قرآنی تعلیمات کے خلاف احکام نافذ کریں ایسے بادشاہ بھی ہوسکتے ہیں جو قرآن کو فراموش کردینا چاہیں بلکہ ایسے بادشاہ بھی ہوسکتے ہیں جو خدا پرستی کے بجائے عملی طور سے اپنی پرستش کی طرف دعوت دیں کیا ایسے بادشاہوں کی اطاعت خدا کی طرف سے فرض ہوگی؟ کیا اسلامی بادشاہ اگر نمرودیت فرعونیت اور شدادیت کا مجسمہ بن جائیں تب بھی سچے مسلمان ان کی اطاعت کو ضروری سمجھیں اور کیا ابراہیمیت اور موسویت کی طاقتوں کو اس وقت محوِ خواب ہی رہنا چاہیئے؟

اس صورت میں تو اسلام کا دنیا میں کوئی نصب العین اور مقصد ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ نام ہوگا مختلف بادشاہوں کی متضاد سیاستوں کا جو زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور جس میں ہر ظلم نا انصافی بے باکی اور غلط کاری کی گنجائش ہے۔

اگر حقیقت اسلام ان میں سے ہر ایک کی اطاعت کا نام ہے تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ بسا اوقات: اسلام نام ہوگا۔ سفاکی کا، ظلم کا قتل و غارت کا، ہوس رانی کا، اور نہ معلوم کا ہے کا ہے کا جن باتوں پر انسانیت لعنت کرتی ہے اور تمدن و تہذیب جنہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں؛

مرکز کو مضبوط کرنا نظام اجتماعی کیلئے یقیناً ضروری ہے مگر مرکز کے انتخاب میں بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے اگر مرکزی نقطہ کی تعیین میں غلطی ہوگی تو پورا دائرہ اجتماعی غلط ہوجائیگا اور اسلام کا تمام نظام اپنے محور سے ہٹ جائیگا

ایک مجلس قانون ساز کو مرکزی حقوق کا سپرد کر دینا اسی وقت صحیح رہنمائی کا ضامن ہو سکتا ہے جب اس کے افراد ہوا و ہوس، خواہشِ نام و نمود، بیجا ضد اور بے محل حفاظتِ دستار کے جذبات سے بالاتر ہوں، ورنہ دنیا میں بہت سی مجلسیں بنتی ہیں جو اشخاص کے ذاتی اقتدار کا آلۂ کار ہوتی ہیں اور جمہور کو دھوکا دے کر انکے سر پر مسلط ہوتی اور ان کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتی ہیں۔

مرکز کی شخصی یا مجلسی مطلق العنانی کا سدِباب قرآن کے ذریعہ سے ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن خود تعبیرات کا پابند ہے۔ اسلئے مرکز یا مجلس قانون ساز جیسی چاہے گا ویسی اسکی تعبیر کر دے گا، چاہے حقیقتاً وہ صحیح ہو یا غلط۔ جب تک مرکز خود ایسا نہ ہو جو تعلیمات اسلامی کی روح کا محافظ ہو اس وقت تک قرآنی دستورالعمل بالکل ناکافی ہے۔

اسوقت ہم آپکے سامنے اسلام کے اصول اور فروع کے متعلق ایک واضح بیان پیش کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے اس سے آپکو "حقیقت اسلام" کا سراغ مل سکے۔

اصولِ دین

اسلامِ حقیقی کے اصول حسب ذیل ہیں :-

(۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت (۵) معاد

اب آپ ان میں سے ہر ایک پر غور فرمائیے۔

توحید

یہ اصل اصول اور بنیاد اساسی ہے۔ اس میں تمام عالم انسانیت کو ایک مشترکہ نقطہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو سب کا مرکز قرار پائے۔ ہزار در ہزار نسل، وطن، قوم اور رنگ کے تفرقوں کے باوجود دنیا منسلک ہو جاتی ہے۔ ایک نظام میں اس ایک ہستی کے اقرار سے جو سب کا خالق اور معبود ہے۔[1] اسمیں احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ انسان مطلق العنان نہیں ہے اگر سب ذاتی خواہشوں کے غلام ہوتے تو ہر ایک کی طبیعت اور خواہش کے اختلاف سے عمل اور مقصد میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا[2] مگر یہ سب ایک حاکم کے فرمانبردار ہیں اسلئے ان کا آہنگ عمل اور مقصد ایک ہونا چاہیئے۔ یہ حاکم کیسا ہے؟ حاضر و ناظر ہے[3]۔ ہر جگہ موجود ہے اور ہر بات کو جانتا ہے[4]۔ اسلئے انسان کو ہوشیار رہنا چاہیئے کہ کوئی بات خلاف قانون نہ بجا لائے کسی کام کو چوری چھپے کر کے مطمئن نہ ہو جائے کہ کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ اس نے دیکھ لیا جس کے ہاتھ میں جزا اور سزا ہے[5]۔ وہ ایک اکیلا ہے کوئی اسکا شریک و مقابل نہیں اسلئے بس اسی کی رضامندی کی فکر رہنا چاہیئے اور اسی کی ناراضگی سے اندیشہ کرنا چاہیئے[6]۔ اسکی طاقت

---

۷ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ

[1] مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ [2] وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ [3] عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ [4] إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ [5] يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا [6] تَخْشَوْنَ النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

ہر ایک پر غالب ہے[1]۔ اسلئے نہ ناحق کسی کی طاقت سے مرعوب ہو وہ ہر بات پر قادر ہے[2]
اسلئے کسی بات کو ناممکن نہ سمجھو وہ ہر کمزوری کا آخری سہارا ہے۔ اس لئے اپنی
کمزوری سے کبھی ناامید نہ ہو[3]۔

اس عقیدہ سے ایک وسیع انسانی برادری کی تشکیل ہوتی ہے جس میں سے ہر فرد دوسرے کے ساتھ اتحاد و مساوات کا احساس رکھتی ہو۔ اور سب ایک نصب العین پر گامزن ہوں سب اپنی خواہشوں کو مشترک اصول اور مقصد میں فنا کردیں اور سب اپنے واحد حاکم کی رضامندی کے خلوت اور انجمن ہر حالت میں طلبگار رہیں اور کسی وقت قانون کے احترام کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس جماعت کے افراد میں خودداری ہو کہ وہ کسی مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکائیں بلند حوصلگی ہو کہ کسی دشوار مقصد کو ناممکن نہ سمجھیں اور اعتماد ہو جس سے کبھی اپنے دل میں یاس کا گزر نہ ہونے دیں۔

دیکھئے تو یہی وہ عناصر ترقی ہیں جو بلند مرتبہ اقوام کے شایانِ شان ہیں۔

عدل

یہ دراصل توحید ہی کا ایک شعبہ ہے۔ خدا کی بلند و برتر ذات کے افعال کو کیسا ہونا چاہیے؟ جیسے اسکی ذات کامل ویسے ہی اسکے افعال۔ ان میں نقصان فساد خرابی اور برائی کا گزر نہیں ہو سکتا۔ اس کا قانون جو اس کے تمام

---

[1] وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهِ

[2] إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

[3] لَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ

کامل ہیں جاری ہے عدالت ہے[1]۔ یعنی ہر کام اس کا حکمت اور مصلحت کے موافق ہے کسی کی حق تلفی کسی پر ظلم[2] اور کوئی کام عبث اور بیکار نہیں کرتا۔ اسکی عدالت ہی بندوں سے بھی انصاف اور عدالت کی طالب[3] ہے۔ اس نے ہمیں ایک امانت دی ہے جس کا نام ہے اختیار ہمیں اس اختیار کو قانون عدالت کے مطابق صرف کرنا چاہئیے۔ عدل کا مقابل ہے ظلم۔ ظالموں پر خدا نے لعنت[4] کی ہے اسلئے کہ وہ خدا کے قانون کو توڑنے والے ہیں[5]۔

اس عقیدے سے اس برادری میں جو انسانیت کے حدود میں قائم کی گئی ہے تبادلۂ حقوق اور انصاف و مساوات کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس برادری کے افراد ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے[6]۔ کیونکہ یہ ظلم ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر اس دنیا میں فوقیت جو نظر آتی ہے یہ بالکل وقتی اور عارضی ہے۔ خالق کی نگاہ میں سب یکساں ہیں اور وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کریگا۔ گناہ اگر غریب کریگا تو سزا ملے گی اور امیر کریگا تو سزا پائے گا۔ وہاں اسکی دولت اور تونگری کچھ کام نہ آئے گی نہ یہ رشوت دیکر اپنے بچاؤ کا سامان نکال سکے گا اور اچھا کام اگر امیر کریگا تو انعام پائیگا اور غریب کریگا تو انعام پائیگا۔ اسکی غربت اس کی کس مپرسی کا باعث نہ ہوگی۔ اسطرح ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے

---

[1] وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ
[2] إِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ [3] إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ
[4] أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ [5] وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ [6] لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى أَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ

اعمال کی جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ افراط اور تفریط۔ اسراف اور کنجوسی سب ظلم ہیں اور ہر چیز میں وسط کا نقطہ عدالت کا مرکز ہے۔ انسانی کمالات کی دنیا اسی اعتدال کے نقطہ پر بستی ہے۔

خدا کو عادل سمجھنا اس اعتدال کی پابندی کا واحد محرک ہے اور اسی لئے جو اس اعتدال پر قائم رہیں انہیں عادل کہا جاتا ہے اور سچے مسلمان وہی ہیں جو عدالت کی صفت سے ممتاز ہوں۔[1]

نبوت

یہ تیسرا اصول ہے۔ حاکم مطلق یعنی خدائے واحد کے احکام و قوانین کو رعایا تک پہنچانے والا اس کے فرمانوں کا اجراء کرنے والا اسکے پیغام کا پہنچانے والا رسول ہوتا ہے جو اپنے اخلاق اور سیرت میں ایک معیاری اور اعلیٰ مثال ہوتا ہے۔[2] سب پر اسکی اطاعت لازم ہے کیونکہ وہ عام خلائق میں خدائے احکم الحاکمین کا نمائندہ ہوتا ہے اسکے احکام خدا کے احکام ہوتے ہیں۔[3] کسی کو اس کے مقابلہ میں رائے زنی عقل آرائی اور طبع آزمائی کا حق نہیں ہے نہ اسکے فیصلے کے بعد کسی کو چون وچرا کا موقع۔[4]

طرفداری، جاہ طلبی، خود غرضی، انانیت، جبروت اور نفسانیت سے پیدا شدہ کشمکش جو جماعت کے افتراق کا باعث ہوتی ہے محو ہو جانا چاہیے

---

[1] وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

[2] لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

[3] مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا

[4] وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

اس اختیار و اقتدار کے نیچے جو رسول کو حاصل ہے اور اسی خود مختارانہ اقتدار میں جماعت کی تنظیم و ترتیب اور نظم و اجتماع کا راز مضمر ہے۔

امامت

رسول کی زندگی دنیا میں محدود ہے، اُن کے دُنیا سے اُٹھ جانے کے بعد اگر عام۔ عمایا کو ان کی رائے، خواہش اور مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہی مطلق العنانی، خود غرضی بر سرِ کار آ جائیگی اور جذبات کی حکومت ہو جائیگی جس کا نتیجہ سوائے افتراق و انتشار اور ابتری کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو نظم و شیرازہ رسول کی خود مختار آمریت سے قائم ہوا تھا۔ وہ پریشان ہو جائیگا۔ اگر اُنکے بعد افراد اور جماعتوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور اُنکے لئے کوئی واحد مرکز مقرر نہ کیا جائے۔

عقیدۂ امامت اس اجتماعی انتشار کا سدِباب ہے وہ یہ تسلیم کراتا ہے کہ نبی کے بعد بھی خداوندی قانون پر دُنیا کو چلانے کیلئے مرکز موجود ہے وہ مرکز ایک ایسا شخص ہے جو خود قانون پر عمل کا بہترین نمونہ ہے، اور قانون کے جزئیات پر پورے طور سے مطلع۔ تاکہ اسکی پیروی کر کے لوگ صحیح اصول سے ہٹنے نہ پائیں۔ جماعت کا انتظام اور شیرازہ بندی ایسی ہستی کے وجود پر موقوف ہے اسکی اطاعت رسول کی اطاعت کی طرح ضروری ہے[1]۔ کیونکہ جس طرح رسول خدا کا نمائندہ تھا۔ اُس طرح یہ اس رسول کا جانشین ہے وہی تمام امتِ اسلامیہ کیلئے مرکز بن سکتا ہے اور اگر کسی وقت میں جیسا کہ آجکل ہے اس تک دسترس نہ ہو تو وہی اشخاص

---

[1] اَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

جو رسولؐ اور ائمہ کے تعلیمات کے حامل ہوں مرکزِ امت قرار پا سکتے ہیں
انکے ہدایات پر عمل کرنا جو کتاب وسنت کے ماتحت ہوں تمام مسلمانوں
کا فرض ہوگا اور جو نظام ان تعلیمات پر مبنی ہو وہی اسلامی نظام سمجھا جاسکیگا
اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے خلق کے لئے ایک مرکز کی
ضرورت تسلیم کی ہے مگر یہ مرکز مادی حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ روحانی
حیثیت رکھتا ہے۔ اس مرکز میں اصلی حکومت خدا کی ہے[۱]۔ اور اسکی
نمائندگی میں رسولؐ اور اسکے جانشین یا اُن کے تعلیمات کے حامل افراد
دنیا کیلئے مرکزِ اتباع ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جسکا اصلی دارالسلطنت دل
ہے اور دلوں پر حکومت کر کے افعال واعمال کو پابند بنایا جاتا ہے۔ اسلام
میں سلطنت خدا کی ہے۔ دنیوی بادشاہت کوئی چیز نہیں ہے۔

بادشاہ کی اطاعت اپنی حفاظت جان ومال کیلئے ایک مجبورانہ فعل ہے[۲]
جو امن وامان قائم رکھنے کیلئے۔ تبعی حیثیت سے ضروری ہے مگر اسے کوئی
مستقل حیثیت اور حقانیت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

اسلام کسی شہنشاہیت کی بنیاد قائم نہیں کرتا بلکہ انسانیت کا نظام
بناتا ہے اور ایک قوم کی تشکیل کرتا ہے جو انسانیت کا صحیح نمونہ ہو اور اس
نظام انسانیت کیلئے ایک محافظ قرار دیتا ہے جو ان تمام انسانوں کا واحد مرکز
ہو۔ یہ اپنے زمانہ میں رسول ہے اور رسول کے بعد اس کے نامزد کردہ
جانشین یعنی امام اور اگر امام براہِ راست رہنمائی سے مجبور ہوں تو ایسے افراد جو ان

---

[۱] إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ
[۲] إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ۔

کی تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ مطلع اور عامل ہوں۔

معاد

خدائے واحد کے مقرر کردہ نظام کی پابندی، اس کے نمائندہ خصوصی یعنی رسولؐ کے پیغام کی قبولیت اور ان کے جانشینوں کے احکام کی اطاعت کیلئے جزا و سزا کا نفاذ ضروری ہے۔ یہ خدا کی عدالت کا لازمی تقاضا ہے[1]۔ اور اسی سے طاعت گزار اور نافرمان اشخاص میں امتیاز قائم ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصول دین ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جن میں سے ایک کڑی بھی نکال دی جائے تو نظام برہم ہو جائے گا اور تمام اصول کا مقصد یہ ہے کہ خدا کی حکومت کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔

اس کے مقابلہ میں کسی کی اطاعت نہ کی جائے اس کے قانون کی پابندی ہو اور اس قانون کے جاری کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے اور اس کے قائم رکھنے والوں کی اطاعت کی جائے۔ اس قانون پر عمل کے لئے جزا اور اس قانون کو توڑنے کیلئے سزا مقرر ہے جس کا نام معاد ہے۔

فروع دین

قانون الٰہی کے تحت میں کچھ احکام جاری کئے گئے ہیں اور فرائض قرار دیئے گئے ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ترقی کے لئے ضروری

---

[1] وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

ہیں۔ ان کا نام فروع دین ہے ان پر عمل کرنا ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے اور بغیر ان پر عمل کئے اسلام کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

۱۔ نماز ۲۔ روزہ	انفرادی تکمیل کیلئے
۳۔ حج ۴۔ زکوٰۃ ۵۔ خمس ۶۔ جہاد ۷۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر	اجتماعی زندگی کی تکمیل کے لئے

نماز

حاکم اصل یعنی مرکز احدیت کے ساتھ ارتباط کا احساس پیدا کرنے والی اسکے دربار میں ہر روز حاضری کا تخیل قائم کرنے والی اور اس کے ساتھ اپنے رشتہ عبودیت کی برابر یاد دلانے والی ہے۔

اس کا اصل جوہر ہے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو بھول کر اپنے خدا کی طرف خالص توجہ کا حاصل کرنا۔ مادی ماحول کو عبور کر کے مرکز حقیقت پر نگاہ کو قائم رکھنا۔ بار بار کی ریاضت سے اگر یہی چیز دماغ میں راسخ ہو گئی تو انسان اپنے تمام فرائض کا احساس رکھیگا اور کوئی ایک بھی اخلاقی یا اجتماعی جرم اس سے صادر نہیں ہو سکتا[1]

[1] اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

روزه

ضبطِ نفس کی عملی مشق۔ خواہشوں سے مقابلہ کی ورزش اور جہاد نفس کی تیاری کا میدان ہے۔ قانون کی خلاف ورزیاں تمام انسانی جذبات اور خواہشوں سے ہوتی ہیں۔ اگر جذبات پر قابو حاصل ہو جائے تو انسان فرائض کو نظر انداز نہ کرے، روزہ ان ہی جذبات کے مغلوب کرنے کا عملی ذریعہ ہے۔ اسی سے تقوے کی صفت پیدا ہوتی ہے[1] جس کا دوسرا نام ہے احساس فرائض۔ سب سے زیادہ کامل انسان وہی ہے۔ جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو[2]

حج

فرض کے احساس میں وطنی زندگی، راحت اور آرام اور اس کے ساتھ ساتھ مال کی قربانی کرنا ہے۔ مختلف ممالک کے قومی اور وطنی امتیازات کو بھلا کر سب کے ایک نقطہ پر مجتمع ہونے کا مظاہرہ ہے[3]۔ اور یہ بتلانا ہے کہ مشترک مقصد کے حاصل کرنے میں آپس کے نسلی اور وطنی امتیازات سدِّ راہ نہیں ہیں۔

---

[1] كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ [2] إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔
[3] جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ

اس کے علاوہ مسلمانوں کی وسیع برادری میں میل جول پیدا کر کے ان کو اجتماعی زندگی کے فوائد سے روشناس بنانا ہے اور ان کو ایک جگہ جمع کر کے جماعتی مفاد کے تدابیر سوچنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع دینا ہے ۔

زکوٰۃ وخمس

دولتمند طبقہ میں ایثار و ہمدردی کا احساس پیدا کرنا اسلامی جماعت سے محتاج افراد کی احتیاج کو دُور کر کے جماعت کو مضبوط بنانا اور مخصوص سرمایہ سے مشترک مقاصد کے حصول کا سامان مہیا کرنا ۔

جہاد

انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی کے مفاد پر قربان کر دینا اور بیرونی خطرات سے جماعت کو محفوظ رکھنا ۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

خداوندی حکومت کا رضا کارانہ فرض خلق خدا کی بہبودی اور مفاد عامہ کی حفاظت اور قانون خداوندی کے احترام کو قائم رکھنے میں ہر مسلمان کو ایک سپاہی کی حیثیت سے حصہ لینا اور ہمدردی کے ساتھ ہر غلط راستہ چلنے والے کو

ٹھیک راستے پر لانے کی کوشش کرنا[1]

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ فروع دین بھی ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن کا مقصد ہے عادل مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت کا قائم کرنا جو فرائض کا احساس رکھنے کے ساتھ بیرونی خطرات سے محفوظ ہوں اور جن میں کا ہر فرد محتاجی سے آزاد ہو کر پوری توجہ سے مفاد عام میں کوشاں ہو اور شخصی مفاد کو اجتماعی مصلحت پر قربان کرنے کے لیئے تیار ہو۔

اصُول وفروع کا مجموعی خلاصہ

اب آپ ایک نظر سے اگر اصُول اور فروع دونوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا مقصد ہے ایک ایسی قوم کا پیدا کرنا جو خدا کی بادشاہت کو تسلیم کرے۔ اس کے مقرر کردہ حاکم (رسول) اور اس کے نائبین (اولوالامر یعنی ائمہ معصومینؑ) کے احکام پر وفاداری کے ساتھ عمل کرے۔ تشتت وافتراق اور باہمی اختلافات سے بچتے ہوئے سب اسی ایک رشتہ میں منسلک ہوں۔ فرائض کا احساس رکھیں۔ کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہ ہوں، نہ کسی لالچ کے فریب میں مبتلا ہوں۔

---

[1] وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

اپنے مالک کی طاقت پر بھروسا رکھیں۔ کبھی ہمت نہ ہاریں نہ کبھی نا امید ہوں۔ آپس میں اتحاد و مساوات کا خیال کریں قانون عدالت کے پابند رہیں۔ باہمی حقوق کا لحاظ رکھیں اور اپنے تمام افعال میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی کوشش کریں۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کے سامنے اپنے اختیارات خصوصی اور حقوق امتیازی کا دعویٰ نہ کریں۔ اپنی مرضی کو قانون کے ماتحت رکھیں، اور احکام رسولؐ کا تابع قرار دیں، اپنے مرکز سے کبھی منحرف نہ ہوں اور خود سری و سرکشی کے مرتکب نہ ہوں، دنیا کی وقتی کامیابی و ناکامی کے آگے ایک آخری انجام کا یقین رکھیں اور اپنے اعمال و فرائض میں آخرت کو ہمیشہ مدِ نظر رکھیں۔ قانون کی پابندی کو فرض سمجھیں اور اپنی ذاتی خواہشوں اور نفسانی تقاضوں کو اپنے قابو میں رکھیں۔ اچھے افعال کے پابند ہوں اور بُرے افعال سے کنارہ کشی کریں، فرائض کی بجا آوری میں جسمانی مشقت اور مالی قربانی کو برداشت کر سکیں اور ضرورت ہو تو جان تک دینا گوارا کر لیں۔ آپس میں اجتماعی رشتہ کو مضبوط و مستحکم رکھیں اور کمزور افراد کو اپنے سرمایہ اور طاقت سے فائدہ پہنچا کر مشترک مقصد کو قوت پہنچائیں۔

یہ جماعت اپنی فرض شناسی، ایثار اور تنظیم کی وجہ سے ایسی طاقتور ہو کہ بیرونی حملوں کا خطرہ نہ پیدا ہو اور ان میں سے ہر فرد

بلاکسی خارجی رکاوٹ کے اپنی داخلی اصلاح اور قومی تربیت اور ناواقف افراد کی رہنمائی اور ناقص اجزاء کی تکمیل میں ہمہ تن سرگرم ہو۔

یہ ہوں گے حقیقی مسلمان اور جس دنیا میں ایسے آدمی بس جائیں وہ ہوگا واقعی "دارالسلام"

کیا رسولؐ کے بعد ظاہری مسلمانوں نے کبھی اس پر غور کیا اور ہوس ملک گیری کے پیچھے اس طرح کی جماعت کی تشکیل کی بھی کوشش ہوئی؟

اسی کا نتیجہ تھا کہ (وَاَنتُمُ الاعلون) کا وعدہ ختم ہوگیا اور "مسلمان" دنیا میں محکوم ہوگئے۔

کاش اب بھی آنکھیں کھلیں اور سمجھیں کہ ہماری تمام ترقیاں "مسلمان" بننے میں مضمر ہیں۔

مردم شماری میں اضافہ سے کوئی حاصل نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں "حقیقت اسلام" کا جوہر پیدا نہ ہوگا۔ اور "پاکستان" کی مثالی ترقی مفلوج ہو جائے گی جبکہ اس میں وہ مسلمان نہ ہوں گے جو اپنے اوصاف سے دنیا بھر کو فتح کرسکتے ہوں۔

خدا کا ثبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وللہ الحمد والصلوٰۃ علیٰ رسولہٖ وآلہٖ

خدا کا تصور شروع میں جس طرح بھی پیدا ہوا ہو بہرحال پیدا ہوا اور اب جب کہ یہ تصور ذہن انسانی میں موجود ہی ہے۔ تو اس تصور کو تو ختم کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ اور بات ہے۔ کہ کسی کوشش کے ساتھ اس کی تصدیق کو شک کے ساتھ مخلوط کر دیا جائے اس تصور کا بقاء۔ اور پھر اس تصدیق کے مقابلہ میں جاری کوششیں جو ایک طبقہ کی طرف سے ہمیشہ ہی جاری رہیں اور اب زیادہ نمایاں طور پر جاری ہیں۔ یہی ایک خالی الذہن فرد کے ذہن میں ذوقِ تحقیق پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ جس کے ساتھ طبیعت کی افتاد، ذہن کی روش اور دلائل کا وزن بہت سوں کو بہرحال اس کے ماننے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اور اس طرح یہ خدا کے خلاف "جہاد" بھی خدا پرستی کو زندہ رکھنے کا سبب ہوگا۔

پیش نظر تصنیف اس سلسلہ میں ان لوگوں کے لئے سرمایہ بنے گی۔ جو سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کو سمجھنے کی تشنگی محسوس کریں۔

خدا یعنی چہ؟

کائنات کے لئے ایک مبداء اول کا وجود تو سب کے نزدیک مسلم ہے۔ مادئین اور طبیعیین بھی عالم کا ایک مبداء قرار دیتے ہیں۔ اسے نیچر کہا جائے یا ذرات مادہ۔ لیکن وہ خدا کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ خدا صرف کسی مبداء اول کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کچھ قیود کی ضرورت ہے۔ انہیں قیود کے ماننے اور نہ ماننے کے ساتھ خدا کے اقرار اور انکار کا امتیاز وابستہ ہے۔

پہلی قید یہ ہے کہ وہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ اس کائنات میں شامل نہیں ہے بلکہ اس کے ماوراء ہے۔ مادئین و طبیعیین جس مبداء اول کے قائل ہیں وہ اس کائنات کا جز ہے۔ اور اس کے اندر کارفرما ہے۔

اس فرق کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ کوئی بھی مرکب شے جو تیار کی جائے اس میں چار چیزیں ہوتی ہیں جو اس کے وجود میں دخیل ہیں۔

ایک وہ اجزاء جن سے مل کر وہ چیز بنائی گئی ہے جیسے تخت کیلئے لکڑی کے تختے، لوہے کے پتر اور کیلیں۔ انکو علّت مادیہ کہتے ہیں۔

دوسرے وہ صورت جو ان اجزاء کے اجتماع سے پیدا ہو۔ اسے علّتِ صوریہ کہا جاتا ہے۔

تیسرے وہ شخص جو اس کا تیار کرنے والا ہے جیسے وہ بڑھئی جس نے تخت تیار کیا ہے۔ یہ علّتِ فاعلیہ ہے۔ اور چوتھے وہ مقصد جس کیلئے یہ تخت تیار کیا گیا۔ یہ علّتِ غائیہ ہوتی ہے۔ یہ تو ایک خاص مرکب

چیز ہے اب اسی معیار پر اس تمام عالم کے مجموعہ پر نظر ڈالئے۔ اس تمام عالم کے لئے مادیین اور طبیعیین جس مبداء اول کو تسلیم کرتے ہیں وہ فقط علتِ مادّیہ ہے۔ وہ اس کائنات سے الگ کچھ نہیں ہے مگر خدا کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مرکب کی طرح اس عالم کے لئے بھی ایک "علتِ فاعلیہ" تسلیم کی جائے۔ جسے اس دنیا کا موجد کہا جا سکے۔ اس کا اقرار خدا کا اقرار ہے۔ اور اسے تسلیم نہ کرنا خدا کا انکار ہے۔

اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوت کو اس تمام خلق میں کارفرما مان کر یہ سمجھنا کہ یہ بھی ایک طرح خدا کا اقرار ہو گیا درست نہیں ہے جب تک کہ اس قوت کو اس کائنات سے خارج مان کر فاعل تسلیم نہ کیا جائے۔ اس فاعل حقیقی کو مان لیا جائے تو بیشک خدا کا اقرار ہو گیا۔ چاہے پھر اس کی تعبیر قوت ہی کے لفظ سے کر لی جائے۔ کیونکہ تعبیرات سے اصل حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور ایمان کا تعلق حقیقتوں کے ماننے کے ساتھ ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ نہیں ہے جن سے ان حقیقتوں کا اظہار کیا جائے؛

دوسرا امر یہ ہے کہ مادیین و طبیعیین جس مبداء اول کے قائل ہیں اس کے افعال یا خواص میں شعور کا کوئی سوال نہیں ہے مگر خدا کو ماننے کے معنی ہیں ایک ایسی ذات کو ماننا جو علم وشعور کی مالک ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس علم و ارادہ کی حقیقت کے سمجھنے میں علمائے مذاہب یا فلاسفۂ الٰہیین باہم مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن اصل علم وشعور کا ثبوت ایک نقطۂ مشترک ہے جس کے مانے بغیر خدا کا تصور قابل قبول نہیں ہے۔

اس طرح خدا کو ماننے کے معنی قرار پاتے ہیں۔ کائنات کے لیئے ایک باشعور خالق کا اقرار۔ بقول جوش ؎

یعنی درونِ پردۂ صد رنگ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک باشعور ذات

اسی ذات کو جسے "درونِ پردۂ کائنات" "باشعور کارساز" مانا جاسکے خدا کہتے ہیں۔

وجوب وجود

جس چیز میں ہستی کے ساتھ نیستی کا گزر ہو اسے ممکن اور حادث کہتے ہیں۔ اور جس میں نیستی کا گزر نہ ہو اسے "واجب الوجود" کہتے ہیں۔ عالم کی ہر چیز ممکن اور حادث ہے، جب اس سب کا مجموعی طور پر تصور کرکے اس کے لئے خالق کو تسلیم کیا تو اس کا نتیجہ یہی ہے۔ کہ وہ اس سلسلہ کا جز نہیں ہے اس سے خارج ہے۔ اور جب اس سے خارج ہے تو واجب الوجود ہے۔

اس طرح تمام عالم کائنات کے ماوراء واجب الوجود کو ماننا اور خدا کو تسلیم کرنا دونوں باتیں لازم وملزوم ہو گئیں۔

خدا کو ثابت کرنے کے طریقے:۔

مذکورہ بالا بنیادوں پر خدا کی تصدیق حاصل کرنے کے دو راستے ہو گئے۔

ایک ممکنات کے ماوراء واجب الوجود کی ضرورت ثابت کرنا۔ یہ فلاسفہ کا راستہ ہے۔

دوسرے مخلوق کے لیئے خالق کی ضرورت ثابت کرنا۔ یہ متکلمین کا راستہ ہے۔ اور چونکہ پہلا راستہ اصطلاحات کے وزن سے زیادہ بوجھل ہے۔ اس لیئے خواص ہی کے دماغ کو زیادہ متوجہ کرسکتا ہے۔ اور دین خواص و عام سب کے لیئے ہوتا ہے اس لیئے رہنمایانِ دین نے زیادہ تر دوسرے طریقہ کو اختیار کیا ہے اور قرآن وحدیث میں بیشتر اسی رُخ سے استدلال نظر آتا ہے۔ لیکن نتیجہ میں دونوں راہیں ایک ہی منزل پر پہنچتی ہیں پھر اندازِ استدلال اور اسلوبِ استنتاج سے ہر طریقہ میں مختلف طریقے ہو گئے جو زیادہ تر انھی دو راستوں کی طرف راجع ہوتے ہیں۔

یہ دونوں راستے تو نظری حیثیت سے ہیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی اور ذوقی کچھ اور راستے ائمہ دین اور عارفینِ کاملین نے اختیار کیے ہیں جو بہت سے افراد کی طمانیتِ ضمیر کا باعث بنتے رہے ہیں۔

واجب الوجود کی ہستی پر ایک دلیل:۔

تمام عالم کائنات کو ایک مجموعہ کی صورت میں خیال کیا جائے اور اس مجموعہ کے متعلق اس پر غور کیا جائے کہ یہ بذاتِ خود وجود کا متقاضی ہے یا نہیں۔ اگر یہ اپنی ذات کے ساتھ وجود کا حقدار اور اس کا متقاضی ہوتا تو ہمیں اس میں ناپائداری، بے ثباتی، تغیر اور انقلاب نظر نہ آتا۔ پھر یہ کہ اگر وجود اس کے ذاتیات میں داخل ہوتا۔ تو اس عالم کی کسی شے کے بھی تصور کے وقت یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ کہ وہ ہے۔ یا نہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں۔ بلکہ ہوش میں ہماری عقل دونوں

پہلوؤں کی گنجائش دیکھتی ہے۔ یہ بھی کہ وہ ہو اور یہ بھی کہ وہ نہ ہو۔ یہ بھی کہ وہ آج ہو کل نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ وہ کل ہو۔ آج نہ ہو:

پھر جب بذاتِ خود اس میں کسی ایک بات کا تقاضا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ پورا مجموعہ ممکن ہے۔ تو اس کے وجود کو عدم پر ترجیح کیونکہ ہوئی یقیناً اس کے لئے کوئی خارجی سبب ہونا چاہئے۔ اور وہ خارجی سبب ایسا ہی ہوسکتا ہے۔ جس کی ذات سے وجود الگ نہ ہوسکے۔ اسی کو واجب الوجود کہتے ہیں۔

استدلال کی دوسری صورت

دنیا میں ہر چیز اپنے ایک مرکز کا پتہ دیتی ہے۔ مثلاً ایک خوردہ فروشی کی دکان پر جائیے تو وہاں متفرق چیزیں نظر آئیں گی۔ تھوڑا سا کاغذ رکھا ہوتا ہے۔ کچھ قلم رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ دوائیں ہیں۔ کچھ قفل ہیں۔ غور کرتے ہیں تو یہ چیزیں آپس میں ایسا تعلق نہیں رکھتیں کہ ہوں تو ایک ہی ساتھ ہوں۔ اس لئے عقل طے کرتی ہے کہ ان میں ہر ایک کا اصل مخزن دوسرے سے علیحدہ ہے۔ وہاں سے یہ تھوڑا تھوڑا سا لاکر یہاں اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ اور جو ہر ایک کا مرکز ہے۔ وہاں وہی چیز ہوگی، دوسری نہ ہوگی۔ مثلاً پیپر مل میں کاغذ ہی کاغذ ہوگا۔ قلم نہ ہوں گے۔ قلم کے کارخانہ میں کاغذ نہیں ہوگا۔ اور اسی طرح تمام چیزیں۔ وہ اُن کا جزئی وجود ہے جو دوسری چیزوں کے ساتھ مجتمع نظر آتا ہے۔ ورنہ ہر ایک کا اصل مرکز وہ ہے۔ جس میں دوسرے کی شرکت نہیں ہے۔

اب دیکھئے کہ عالم امکان کی تمام چیزوں میں ہستی و نیستی ہم عنان ہیں۔ ہر شے میں ہستی کا پہلو بھی ہے اور نیستی کا بھی۔ لیکن خود ہستی اپنی حقیقت کے لحاظ سے نیستی کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا۔ کہ یہ ان دونوں کا اجتماع محل کی خصوصیت سے عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہستی کا ایک اصلی مرکز ہے۔ جہاں نیستی کا گذر نہیں اور وہ واجب الوجود کی ذات ہے۔

تیسری صورت :۔

جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم کو وجود کے ساتھ نقائص نظر آتے ہیں۔ اور ان نقائص کے لحاظ سے ہم مختلف ماہیات و طبائع کا تصور کرتے ہیں۔

یہ مختلف طبائع کی تفریق اور مختلف انواع کی تشکیل صرف ان حدود و قیود سے ہوتی ہے جو وجود کے ساتھ منضم ہو گئے ہیں۔ اور یہ حدود و قیود سب عدمی ہوتے ہیں۔ مثلاً جسم کیا ہے؟ وہ موجود جو محتاج مکان و حیّز ہو۔ یہ احتیاج امر عدمی ہے اور جسمیت اسی سے وابستہ ہے۔ پھر اجسام میں جماد کیا ہے وہ جسم جو بس جسمیت رکھتا ہو۔ "بس" کیا؟ یعنی اس میں نشوونما نہیں ہے۔ اسی حدِ عدمی سے جمادیت وابستہ ہے۔ پھر نباتات؟ وہ جن میں نشوونما ہے اور بس۔ یہاں "بس" کے معنی یہ ہیں کہ احساس اور حرکت ارادی نہیں ہے تو اس عدم سے نباتات کی حقیقت وابستہ ہے۔ یوں ہی حیوان وہ جس میں احساس اور حرکت ارادی ہے۔ اور انسان جس میں نفس ناطقہ

یعنی ادراک کلیات کی قوت اور صلاحیت فکر و نظر ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ عالم کائنات جو مختلف طبائع و ماہیات پر منقسم ہے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ محدود وجودات کا مجموعہ۔ یہ حدیں کہاں سے آتی ہیں۔ عدم کی طرف سے۔ مگر یہ وجود جس میں یہ قیدیں لگتی ہیں۔ کہاں سے آیا ہے؟ ان حدود سے نہیں۔ کیونکہ وہ تو عدمی ہیں اور خود اسی وجود میں ملحق ہوئی ہیں۔ اس کے لئے یقیناً ایک اصل وجود ماننا ضروری ہے۔ جس میں کوئی حد و قید نہ ہو۔ وہی وجود غیر محدود "واجب الوجود" کہا جائے گا۔

امکان و حدوث کا اصل سرچشمہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں وجود سے زائد ایک اس کی ماہیت و طبیعت ہے۔ اور وہ "وجود غیر محدود" وہ موجود ہے۔ جس میں وجود کے علاوہ کوئی طبیعت و ماہیت نہیں ہے۔ اس لئے کہیں پر اس میں نیستی کا گزر نہیں۔ یہی واجب الوجود ہونے کے معنی ہیں۔

ایک قدیم طریقہ:-

عالم متغیر ہے۔ یہ مشاہدہ سے ثابت ہے۔ اور ہر متغیر حادث ہے۔ کیونکہ تغیر کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ جو حالت اب رونما ہوئی وہ پہلے نہ تھی۔ یہ عدم کی آمیزش ہی حدوث کی نشانی ہے۔ اور ہر حادث کے لئے عدم سے وجود میں لانے کے لئے ایک موجد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ موجد بھی اگر حادث ہوا۔ تو اس کے لئے ایک اور موجد کی ضرورت ہوگی۔ اور پھر یہی

سوال اس موجد میں پیدا ہوگا۔ یہاں تک کہ یا تو یہ سلسلہ برابر یونہی چلتا رہے گا اور کہیں پر ختم نہ ہوگا۔ تو اس کا نام تسلسل ہے۔ اور یا کسی منزل پر آ کر یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا موجد وہی قبل والا ہے تو اس کو دَور کہتے ہیں اور دور و تسلسل دونوں عقلاً محال ہیں۔ اس سے مفر صرف اسی صورت میں ہے کہ موجد کو قدیم (یعنی ہمیشہ سے) اور واجب الوجود مانا جائے۔ تاکہ وہ اپنے وجود میں کسی موجد کا محتاج نہ ہو۔

خالق کا ثبوت :۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہی وہ طریقہ ہے جس پر قرآن مجید اور حدیث میں زیادہ زور دیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے :۔

اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

یقیناً آسمان و زمین کی خلقت، شب و روز کی آمد و رفت، وہ کشتیاں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزوں کو لے کر دریاؤں میں پھرتی ہیں۔ وہ جو اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ تو اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ جانور جو اس نے زمین میں

پھیلا رکھے ہیں۔ ہواؤں کی گردشیں اور وہ بادل جو آسمان و زمین کے بیچ میں اس کے قبضۂ قدرت کے پابند ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے جو صاحبانِ عقل ہیں۔ نشانیاں کس کی اپنے پیدا کرنے والے کی۔

خلاصہ اس استدلال کا یہ ہے کہ ہر نقش اپنے نقاش کا ہر تصنیف اپنے مصنف کا اور ہر عمارت اپنے معمار کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح اس کائنات عالم کا ہر ذرہ اس کا گواہ ہے کہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اسے ایک معمولی دماغ والا بچہ اور سطحی نگاہ رکھنے والا جاہل اپنی زبان میں سمجھ سکتا ہے۔ اور اسی کو ایک فلسفی اپنے علمی اصطلاحات سے ثابت کرتا ہے۔ جو عوام کو ایک پیچیدہ مسئلہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ مگر بات یہی ایک ہے کہ اثر بغیر مؤثر کے نہیں ہوتا۔ اور صنعت بغیر صناع کے وجود میں نہیں آسکتی۔ لہٰذا یہ کائنات بغیر کسی خالق کے نہیں ہو سکتی۔

وہی امکان و حدوث اور علت و معلول والا استدلال جو فلسفی اصطلاحات کے جال میں پھنس کر ہفت خوان بن جاتا ہے اس کو ایک ضعیف العمر بڑھیا بالکل آسان طریقہ سے کہدیتی ہے۔ اس وقت جب اس کے سامنے چرخا ہے اور وہ کات رہی ہے کوئی پوچھتا ہے۔ تم نے اپنے خدا کو کیونکر پہچانا؟ وہ جواب دیتی ہے اسی چرخے سے۔ دیکھو جب تک میں اسے چلاتی رہتی ہوں۔ یہ چلتا رہتا ہے۔ اور ادھر میں نے ہاتھ

روکا۔ بس یہ رنگ گیا۔ پھر جب یہ اتنا سا چرخہ بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چلتا۔ تو اتنا بڑا دنیا کا انتظام بغیر کسی منتظم کے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے جو آج کل منکرِ خدا کی حیثیت سے نمایاں شہرت رکھتے ہیں غیر شعوری طور پر اس حقیقت کو نظم کیا ہے۔

نشانِ ہلال نما راہ میں بتاتے ہیں
کہ تھوڑی دُور پہ آگے سوار جاتے ہیں
ٹپک کے جھاڑیوں سے خون یہ بتاتا ہے
کہ زخم کھا کے ادھر سے شکار جاتا ہے
صنم تراش نہ ہو تو صنم نہیں بنتا
قدم نہ ہو تو نشانِ قدم نہیں بنتا
یونہی یہ راہ کہ ہے جس کا نام کاہکشاں
یونہی یہ نقشِ قدم ماہ و نیّرِ تاباں
یونہی یہ گردشِ راہ خوش نما تارے
رواں ہیں جن کی جبینوں سے حسن کے دھارے
زمیں کا نور ہیں اور آسماں کی زینت ہیں
کسی کی شوخیِ رفتار کی علامت ہیں

آئمۂ طاہرینؑ کا اندازِ رہنمائی

آئمۂ اہل بیت علیہم السلام نے جو پیغمبرِ اسلام کے حقیقی جانشین تھے۔ وجودِ خالق کو ذہن نشین کرنے میں اپنے مخاطب کے معیارِ فہم کے مطابق طرح طرح کے انداز اختیار کیے۔ کبھی فلسفیانہ انداز سے ابوشاکر

دیصانی کے جواب میں جب اس نے خالق کے ثبوت پر دلیل معلوم کرنا چاہی۔ امام جعفرِ صادقؑ نے فرمایا:۔

"میرے نفس کو خود اپنے وجود کا باعث اگر مانا جائے تو وہ دو صورتوں سے خالی نہیں یا وہ اپنے وجود کا باعث ہوا جبکہ وہ موجود تھا۔ یا وہ اس کے وجود کا باعث ہوا۔ جبکہ وہ معدوم تھا۔ اگر وہ اپنے وجود کا باعث ہوا۔ جبکہ وہ موجود تھا تو پھر اس کو وجود بخشنے کی ضرورت کیا تھی (تحصیل حاصل لازم آتی ہے) اور اگر وہ اس کے وجود کا باعث ہوا جب کہ وہ معدوم تھا۔ تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جبکہ معدوم کسی شے کو موجود نہیں بنا سکتا لہٰذا تیسری صورت ثابت ہوئی کہ اپنے وجود کا باعث یہ خود نہیں ہے۔ بلکہ کوئی اور اس کا خالق ہے۔ اور وہی خالق اللہ ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"

کبھی بالکل سادہ الفاظ میں عوامی معیار فہم کے مطابق اس طرح سمجھایا:۔

"راستے میں اونٹ کی مینگنیاں نظر آئیں تو معلوم ہوگا، کہ ادھر سے اونٹ گزرا ہے۔ اور گدھے کی مینگنیاں ہوں تو معلوم ہوگا کہ گدھا گزرا ہے۔ اور پیروں کا نشان دیکھو تو رہرو کا پتہ چلے گا۔ پھر یہ بڑا آسمان اس لطافت کے ساتھ اور یہ زمین اس جسامت کے ساتھ کیونکر باریک بین دانا و خبیر خالق کی دلیل نہ ہوں گے۔"

کبھی نفسیات کے ذریعہ سے ثابت کیا۔ جب ایک شخص نے

پوچھا۔ آپ نے اپنے خدا کو کیونکر پہچانا؟ فرمایا:۔
"میں نے اپنے خدا کو پہچانا۔ مضبوط ارادوں کے ٹوٹ جانے سے۔ اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔ جب میں کوئی ارادہ کرتا ہوں۔ تو اکثر وہ میرے ارادہ کو شکست دے دیتا ہے۔ اور ہمت باندھتا ہوں۔ اور وہ ہمت کو پست کر دیتا ہے"

ایک دفعہ ایک دہریہ سے گفتگو نے طول کھینچا۔ تو امام نے اس کو زندگی کا ایسا ہنگام یاد دلایا۔ جب کشتی پر سوار ہوں۔ طوفان آئے۔ کشتی بالکل منجدھار میں ہو۔ نہ کوئی ساحل قریب ہو نہ کوئی درخت سامنے نظر آئے۔ بلکہ کشتی شکستہ بھی ہو چکی ہو۔ اور تختے الگ الگ ہو گئے ہوں یہ انسان ایک تختے پر بہتا جا رہا ہو" آپ نے فرمایا:" کیا ایسا وقت جب پیش آیا۔ تو دل میں کوئی آسرا محسوس ہوتا تھا کہ اب بھی کوئی بچا سکتا ہے" اس نے کہا "بیشک کچھ تو آسرا ضرور تھا۔" فرمایا" ایسے وقت جس کا آسرا ہوتا ہے وہی خدا ہے"

maablib.org

جبر و اختیار

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دھوکا کھایا ہے لوگوں نے اور کہہ دیا ہے کہ بندے اپنے اچھے بُرے تمام افعال میں مجبور ہیں اور کوئی کام اُن کے ذاتی اختیار سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذمّہ داری خدا کی طرف عائد ہے۔

دلیل یہ ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کا علم خداوندِ عالم کو ازل سے ہے اور خدا کو علم ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف ممکن نہیں لہٰذا انسان اپنے افعال میں خود مختار نہیں۔ مثلاً زید کہ جس نے جمعہ کے دن شراب پی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اس کا علم تھا یا نہیں؟ جواب یقیناً اثبات میں ملے گا۔ اچھا، علم ہو چکنے کے بعد ہو سکتا ہے کہ زید شراب نہ پیے؟ ہرگز نہیں۔ ورنہ علم باری کا غلط ہونا لازم آئے گا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ زید کے لیے ناممکن تھا کہ وہ شراب نہ پیے بلکہ شراب پینا اس کے لیے ضروری تھا اور یہی معنی جبر کے ہیں۔

یہ دلیل ہے جس پر عقیدۂ جبر کی بنیاد قرار پائی ہے اور ظاہری نظر میں بہت مضبوط ہے۔ لیکن جب غائر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

ضرورت ہے اس بات کے دیکھنے کی کہ علم اور معلوم میں تعلق کی

نوعیت کیا ہوتی ہے؟ آیا علم سبب ہوتا ہے وجود معلوم کا یا وجودِ معلوم باعث ہوتا ہے تحقق علم کا۔ اگر علم وجود معلوم کا سبب ہے یعنی چونکہ خدا کو علم تھا اس بات کا کہ شراب پیے گا اس لیے اس نے شراب پی تو یہ یقیناً جبر ہے، لیکن اگر معلوم باعث ہوتا ہے علم کا یعنی چونکہ زید شراب پینے والا تھا اس لیے خدا کو علم ہوا تو اس میں جبر کا پتہ بھی نہیں ہے۔ صورتِ واقعہ یوں ہی ہے یعنی ہمیشہ تحقق معلوم باعث ہوتا ہے علم کا، نہ یہ کہ علم معلوم کے وجود کا سبب بنے۔

مثال کے طور پر دیکھنا چاہیے کہ رمال، جفار، منجم وغیرہ زائچہ کھینچتا ہے اور اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ زید فلاں تاریخ یہ کام کرے گا۔ اب اگر وہ شخص فن نجوم میں ناقص ہے اور اس کا علم نامکمل ہے اور اس لیے اس کا انکشاف مطابق واقع نہ ہوا تو اس سے تو کوئی بحث نہیں لیکن اگر اس کا علم مکمل ہے تو وہ ضرور ہی مطابق واقع ہوگا۔ اور وہ شخص تاریخ معین پر اس کام کو انجام دے گا۔ تو کیا رمال کے علم نے اس شخص کو مجبور کر دیا؟ چونکہ وہ شخص باختیار خود اس کام کو کرنے والا تھا اس لیے رمال کو علم ہوا۔ یقیناً ایسا ہی ہے اگر رمال زائچہ نہ کھینچتا اور اس کو علم نہ ہوتا تو بھی یہ شخص اس کام کو کرتا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس نے زائچہ کھینچا اور اس کو علم بھی اس ہونے والے واقعہ کا ہو گیا۔ اس سے زیادہ واضح مثال جس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ ایک شخص کوئی کام کر رہا ہے اور آپ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس وقت محض

ہے کہ وہ شخص اس کام کو نہ کر رہا ہو؟ آپ فرمائیں گے ہرگز نہیں ممکن اس لیے کہ میں خود دیکھ رہا ہوں۔ پھر کیا آپ کے دیکھنے نے اس کو اس فعل پر مجبور کر دیا؟ نہیں ایسا بھی نہیں بلکہ وہ باختیار خود اس کام کو کر رہا تھا۔ مگر چونکہ اتفاق سے آپ کے سامنے تھا اس لیے آپ دیکھ بھی رہے ہیں۔

بس یہی نوعیت سمجھنا چاہیے علم باری تعالیٰ کی، فرق اتنا ہے کہ ہمارا ادراک ناقص ہے۔ لہٰذا ہم اسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں جو ہمارے سامنے ہو لیکن جب پردہ پڑا ہو، دیوار سامنے ہو، حد سے زیادہ بعد پایا جاتا ہو تو ہماری نگاہ کام نہیں کرتی اور ادراک ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن خداوند عالم کا علم ان موانع وعوائق سے علیحدہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی پردہ نہیں اور کوئی حجاب حاجب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس کے علاوہ ہم چونکہ زمانہ کے اندر ہیں اور زمانہ سیال ہے جس کے اجزاء اجتماعی صورت سے وجود نہیں رکھتے بلکہ ہر جزو اس کا دوسرے جزو کی رفتار کے بعد آتا ہے اور جب تک یہ جزو جا نہیں لیتا بعد والے جزو کا موقع نہیں ہوتا اس لیے جو حوادث اس میں ہوتے ہیں وہ بھی گذشتنی وقتی ہیں اور مختلف اوقات میں ہونے والے حوادث ایک وقت موجود نہیں اور اس لیے مشاہدہ ان ہی حوادث کا ممکن ہوتا ہے جو باعتبار زمانہ اس مشاہدہ کے مقارن ہیں اور اسی وجہ سے اس وقت آپ کل ہو چکنے والے اور آئندہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن خداوند عالم کو

جو زمان و زمانیت سے بالا تر ہے اور ان پابندیوں سے علٰحدہ - اس کے لیے زمانہ کا تفرقہ کوئی تفرقہ نہیں ہے۔

جس طرح ایک وسیع میدان میرے سامنے ہو جس میں مختلف مقامات پر جو ایک دوسرے سے تھوڑا تھوڑا سا فاصلہ رکھتے ہوں مختلف اشخاص مختلف کاموں میں مصروف ہوں وہ باعتبار وجود خارجی کے ایک دوسرے سے تفرقہ رکھتے اور جُدا جُدا ہیں لیکن چونکہ نظر میری ان سب کو محیط ہے اس لیے ان مختلف لحاظ پر موجود ہونے والے اشیاء کا وہ ایک ساتھ ادراک کرے گی اور باوجود اپنے ذاتی تفاوت و اختلافِ مراتب کے مشاہدہ میں وہ بوقت واحد ایک ساتھ آئیں گے بس اسی صورت پر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک طویل سلسلہ حوادث عالم تکوین کا جس کی ابتدا ابتدائے خلقتِ عالم سے اور انتہا انتہائے عمر زمانہ تک ہے پورا جنابِ باری کے لیے جو ان زمان و زمانیات سے آگے ہے ازل سے پیشِ نظر ہے۔

اس سلسلہ میں ہونے والے حوادث اگرچہ باعتبار وجود خارجی کے آپس میں فاصلہ رکھتے ہیں یعنی ایک آج ہونے والا ہے اور ایک کل اور ایک سو برس قبل اور ایک ہزار برس بعد لیکن علم باری چونکہ اس تمام سلسلہ کو محیط ہے اس لیے یہ تمام حوادث باوجود اپنے تفرقہ اور جدائی کے اس کے علم میں ایک ساتھ ہیں اور وہ ان سب کو برابر سے اپنی نظرِ قدرت سے دیکھ رہا ہے - پھر جس طرح کہ کسی شخص کو کام کرتے دیکھنا ہمارا اس کے مجبور بنا دینے کا باعث نہیں ہے - یعنی ایسا نہیں ہے کہ چونکہ ہم

دیکھ رہے تھے اس لیے وہ اس کام کو کر رہا ہے بلکہ چونکہ وہ کر رہا ہے اس لیے ہم دیکھ رہے ہیں۔ تو اسی صورت پر خداوند عالم کو اطلاع حاصل ہونا زید کے ہاتھوں ہونے والے کام کی اس کام کے ہونے کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علم کی بنیاد خود اس کام کا زید سے صادر ہونا ہے۔ یعنی وہ کام کرنے والا تھا اس لیے خدا کو اس کا علم تھا۔

بے شک علم ہو چکنے کے بعد نا ممکن ہے کہ وہ فعل نہ ہو۔ لیکن یہ عدم امکان فرض وقوع کی بناء پر ہے۔ ہر چیز جس کے وقوع کو فرض کر لیا جائے اس کا عدم ممتنع ہے کیونکہ اجتماع نقیضین محال ہے۔ مثلاً میں عرض کروں کہ فرض کیجیے کہ میں آپ کے یہاں حاضر ہی ہو گیا ہوں تو کیا اس فرض کی بنا پر ہو سکتا ہے کہ میں حاضر نہ ہوا ہوں، جواب نفی میں ہی ملے گا۔ یعنی اس فرض کی بنا پر نا ممکن ہے کہ ایسا نہ ہوا ہو۔ علم وقوع کے بعد اس کے خلاف ممکن نہ ہونا اسی نوعیت کا ہے اس لیے کہ علم خدا کو اس کے وقوع کا جب ہی ہوگا کہ جب وہ فعل حقیقتاً اپنے وقت پر واقع ہو اور جب کہ فرض یہ ہے کہ وہ فعل اپنے وقت پر واقع ہوگا تو اب نا ممکن ہے کہ واقع نہ ہو ورنہ خلف لازم آئے گا۔ ہاں اگر وہ اپنے وقت پر واقع نہ ہو تو خدا کو علم ہی اس کے وقوع کا نہ ہوگا بلکہ عدم وقوع کا علم ہوگا۔ لہٰذا عدم امکان وقوع بعد علم بو قوع فرض وقوع کی بنا پر ہے نہ یہ کہ علم اس فعل کے وقوع کی علتِ تامہ ہے اس لیے اس کے خلاف نا ممکن ہو گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ علم کی بنیاد پر جبر کے عقیدہ کو ثابت کرنا بالکل بے بنیاد

ہے۔ دوسری دلیل جبر کی یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ فعل مثلاً نماز یا روزہ وغیرہ جو کسی انسان سے صادر ہو تو پوچھا جاتا ہے کہ خدا اس کو چاہتا ہے یا نہ؟ جواب یقیناً اثبات میں ہوگا۔ کہ بیشک خدا چاہتا ہے۔ اچھا جس بات کو خدا چاہے اس کے خلاف ہو سکتا ہے؟ جواب نفی ہی میں ملے گا کہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پھر انسان اپنے فعل میں مجبور ہے یعنی جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے خلاف اس سے ناممکن ہے جواب اس کا یہ ہے کہ اکثر کسی لفظ کے دو معنی میں خلط یا کسی مفہوم کی دو مختلف قسموں کے درمیان تفرقہ نہ کرنے کے سبب انسان دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے مثلاً ایک گھوڑے کی تصویر ہے جو دیوار پر بنی ہوئی ہو اور ایک گھوڑا وہ ہے جو سچ مچ زمین پر چلنے پھرنے والا ہے ان دونوں کے اختلاف سے قطع نظر کرتے ہوئے دو شخصوں میں اختلاف ہو رہا ہے ایک کہتا ہے کہ گھوڑے پر سوار ہونا ناممکن ہے مقصود وہ گھوڑا ہے جو دیوار پر بنا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ میں سیکڑوں مرتبہ گھوڑے پر سوار ہوا مقصود وہ گھوڑا ہے جو چلتا پھرتا ہوتا ہے جاندار حیوان صاہل ہے۔ بات دونوں ٹھیک کہتے ہیں لیکن ایک جگہ گھوڑے کے معنی ایک اور دوسرے میں گھوڑے کے معنی دوسرے ہیں اگر معنی کھل جائیں تو دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہ رہے لیکن معنی کے اختلاف کو نہ سمجھتے ہوئے الجھن پیدا ہوتی ہے یا یوں سمجھیے کہ گھوڑے کی دو قسمیں ہیں ایک اسپ صوری اور ایک اسپ حقیقی۔ ان دونوں کے احکام میں خلط کا نتیجہ غلط بحث کی صورت میں ظاہر ہوا۔

بالکل یوں ہی سمجھنا چاہیے کہ انسان جو نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا ہے تو یہ ایسی بات ہے جسکو خدا چاہتا ہے ٹھیک ہے اور یہ بھی کہ جو خدا چاہے اسکے خلاف ہو نہیں سکتا۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن چاہنے کے معنی دونوں جگہ مختلف ہیں۔ بات یہ ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔ ارادہ تکوینیہ اور ارادہ تشریعیہ

وہ کہ جسکے خلاف ممکن نہیں ارادہ تکوینیہ ہے اور وہ کہ جو افعال عباد سے متعلق ہوتا ہے ارادۂ تشریعیہ ہے اور اسکی وجہ سے فعل کا صدور لازمی نہیں ہوتا۔ عام فہم الفاظ میں عرض کیا جاتا ہے کہ چاہنا دو قسم کا ہوتا ہے اس کام کا جو خود خداوندِ عالم کے کرنے کا ہے اور کبھی چاہنا ہوتا ہے ایسے کام کا جو دوسرے کے ہاتھ سے اسکے ارادہ و اختیار سے ہونا منظور ہے۔

اگر چاہنے کا تعلق ایسے کام سے ہے جو خود اسکے کرنے کا ہے تو وہ کام ہونا ضروری ہے اس لیے کہ کام خود اسی کا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اور اس کی قوت قاہرہ کے مقابلہ میں کوئی مانع بھی نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ چاہتا ہے دوسرے کے کام کو اسکے ارادہ و اختیار سے تو اس چاہنے کا لازمی نتیجہ صرف اتنا ہے کہ وہ صرف حکم دے اور پوری تاکید سے اسکو اس فعل کی بجاآوری پر آمادہ کرے۔ اگر وہ نہ کرے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ فعل زبردستی اس سے صادر کرایا جائے اس لیے کہ جبراً اس سے فعل صادر کرایا گیا تو درحقیقت جس سے مشیت کا تعلق تھا وہ حاصل نہ ہوا یعنی جو چاہا تھا وہ نہ ہوا۔ کیونکہ چاہا تو یہ تھا کہ فعل اس دوسرے شخص سے ارادہ و اختیار کے ساتھ ہو اور ہوا یہ کہ فعل خداوندِ عالم کے جبر و قہر سے اس سے بے اختیارانہ صادر ہوا۔ یہ ہے تخلف مراد کا ارادہ سے اور واقعہ کی مخالفت اسکی مشیت سے جو کسی طرح صحیح نہیں ہے لہٰذا جو دلیل عقیدۂ جبر کے اثبات میں پیش کی گئی تھی یعنی یہ کہ تخلف مراد کا ارادہ سے محال ہے لہٰذا اس فعل کا ہونا ضروری ہے وہ ہی عقیدۂ جبر کا ابطال کرتی ہے اس لیے کہ ارادہ کا تعلق یوں ہی ہوتا ہے کہ فعل انسان سے اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہو لہٰذا اگر ارادہ و اختیار سے صادر نہ ہو تو تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آئیگا جو نا ممکن ہے یہ تھا عقیدۂ جبر کے ادلہ کا ابطال جو بحمد اللہ کافی توضیح سے عرض کیا گیا۔ اب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خرابیاں عقیدۂ جبر کی عرض کر دی جائیں۔ جبر کے عقیدہ کی پہلی خرابی یہ ہے کہ جزا و سزا باطل ہو جاتی ہے اور روز قیامت کا وجود بیکار۔ اس لیے کہ کسی اچھے کام کی جزا اور بُرے کام کی سزا کا استحقاق عقل کے نزدیک اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ فعل کرنے والے سے باختیار صادر ہو۔ اگر کوئی باپ اپنے بچہ کے ہاتھ میں قلم دیکر خود اسکا ہاتھ مضبوط پکڑ کے ایک نقش کاغذ پر بنا دے اور پھر اسکا ہاتھ پکڑ کر ایک قیمتی کتاب کو پھاڑ ڈالے تو یہ امر کسی طرح جائز نہ ہوگا کہ وہ پھر بچہ کو اس نقش کے بنانے کا انعام اور اس کتاب کے پھاڑ ڈالنے کی سزا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو یقیناً احمق بے وقوف اور ظالم بے انصاف سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ اس اچھے بُرے کام کی ذمہ داری اس بچہ کی طرف عائد نہیں بلکہ خود اسکے باپ کے ذمہ ہے بس اسی صورت پر اگر خدا بندوں سے بجبر اچھے برے افعال سب کراتا ہے تو اچھے افعال پر جزا اور برے افعال پر سزا دینے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ دونوں قسم کے کام اس نے خود کرائے ہیں جس میں انسان کے قدرت و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب دیکھیے ان لوگوں سے کہ نکال دیں قرآن سے ان آیات کو جن میں وعدہ و وعید اور حشر و نشر ثواب عقاب کے تذکرے ہیں اور پھاڑ ڈالیں ان احادیث کے کتب کو جن میں یہ واقعات و اخبار ہیں اسکے بعد وہ جبر کے قول کو زبان سے نکالنے کا حق رکھیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء و رسل کا بھیجنا اور اوامر و نواہی کا نافذ کرنا شریعتوں کا جاری کرنا کتب کا نازل کرنا سب بیکار قرار پائیگا۔ اسلیے کہ جب اچھے برے کام سب خدا خود ہی کراتا ہے تو انبیاء و رسل کی زبانی احکام شرعیہ کے تحت میں آسمانی کتب کے اندر یہ اوامر و نواہی نافذ کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو۔ اس لیے کہ کرنے نہ کرنے کا تعلق تو خود اسی سے ہے جس کام کو چاہتا انسان سے بجبر کرا دیتا جس کو نہ چاہتا

مترک کرادیا۔ پھر ان سب انبیاء و رسل کی تبلیغ اور عظیم الشان عالم تشریع کی بنیاد لغو، مہمل، بے فائدہ اور لاحاصل نہیں تو کیا ہے۔ تبلیغ احکام اور ہدایتِ خلق میں یہ تمام اہتمامات خود اس کی دلیل ہیں کہ اچھے برُے کاموں کا کرنا خود بندوں سے تعلق رکھتا ہے اور خداوندِ عالم کا کام صرف ہدایت کرنا ہے۔ انا ھدینٰہ السبیل اما شاکراً واما کفوراً۔ وہ تعلیمات بھیجتا ہے اور راہنمائی کرتا ہے لیکن انسان اپنے قدرت و اختیار سے کبھی اس کے تعلیمات پر عمل کرتا اور کبھی ان کی مخالفت کرتا ہے۔ جس پر اس کو جزا یا سزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر وجدان پر نظر کی جائے تو وہ بھی عقیدۂ جبر کے خلاف ہے۔ کیونکہ انسان بداہتہً اپنے روزمرہ کے ہونے والے حرکات میں دو قسم کے افعال پاتا ہے۔ ایک وہ کہ جو بلا اختیار صادر ہوتے ہیں جیسے مرتعش کے ہاتھ کی حرکت اور بعض وہ ہیں جو باختیار صادر ہوتے ہیں جیسے کاتب کی گردشِ قلم یہ ایسی بدیہی بات ہے جس کو معمولی سے معمولی ناقص العقل افراد حتیٰ کہ بچے تک سمجھتے ہیں۔ تین چار برس کے سن کا کمسن بچہ جو بات چیت کر لیتا ہے اور پیروں چلتا ہے ایک دفعہ اس کا قدم پھسلتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ دوسرے موقع پر وہ شرارت سے ایک بلند مقام سے جست کرتا ہے اور زمین پر گرتا ہے کہ جس سے چوٹ لگتی ہے۔ پہلے مقام پر باپ خفا ہو تو وہ یہی کہتا ہے کہ کیا کروں میرا پاؤں پھسل گیا، میں جان کے تھوڑی گرا۔ دوسرے موقع پر جب خفا ہو تو سہم کر وہ کہے گا کہ قصور ہوا۔ اب ایسا نہ کروں گا۔ پہلے موقع پر کیوں نہیں کہتا کہ قصور ہوا اب ایسا نہ کروں گا اس لیے کہ جانتا ہے وہ میرے بس کی بات نہیں۔ کہنے کو کہہ دوں کہ نہیں کروں گا لیکن اگر اس کے بعد بھی پیر پھسل جائے تو کیا کروں گا۔ اور دوسرے موقع پہ وہ جانتا ہے کہ شرارت میری تھی اور میرے ارادہ و اختیار سے تھی اس لیے آئندہ کے متعلق

ایسا نہ کرنے کا دعوٰی کرتا ہے۔

یہ دلیل وجدانی ایسی ہے جس کے مقابل بڑی سے بڑی دلیل برہانی کوئی وقعت نہیں رکھتی جب دلیل عقلی بداہت وجدان سے تصادم کرے تو ماننا پڑیگا کہ دلیل مغالطہ کی نوعیت رکھتی ہے جس میں حقیقت کا جوہر نہیں ہے۔

عقیدۂ جبر کی ان ہی خرابیوں پر نظر کرتے ہوئے مفوضہ ایسے متوحش ہوئے کہ انھوں نے ایک مرتبہ تفویض کے نقطہ پر جا کر دم لیا اور وہ قائل ہو گئے کہ انسان بالکل مطلق العنان ہے اور اس سے ہونیوالے افعال میں خدا کو کوئی دخل ہی نہیں ہے خدا کا جو کچھ کام ہے وہ ایسے امور سے متعلق ہے جو انسان کے افعال میں سے نہیں۔ جیسے جلانا، موت دینا، پانی برسانا، آندھیاں لانا وغیرہ لیکن انسان کے افعال میں اس کا کوئی دسترس نہیں۔ لیکن غور کرنے پر یہ خیال بھی نقطۂ حقیقت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ جبر و تفویض دونوں ہی افراط و تفریط کے دو نقطے ہیں اور واقعیت ان دونوں کے وسط میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز جو ہوا کرتی ہے اس کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے مقتضی، شرط، اور عدم مانع جب وہ تینوں مجتمع ہو جائیں تو وہ امر ہوتا ہے۔ اور اگر ان میں سے کوئی ایک مفقود ہو تو وہ امر نہیں ہوتا۔ مقتضی وہ ہے جو درحقیقت کسی فعل کا اصلی سبب اور باعث ہوتا ہے جس کی طرف وہ فعل منسوب ہوتا ہے جیسے آگ اس کا کام ہے جلانا، شرط وہ ہے جس پر مقتضی کا اپنے اثر میں کامیاب ہونا موقوف ہے، مانع وہ قوت ہے جو مقتضی کو کامیاب ہونے سے روک دے۔ انسان کے افعال اختیاریہ میں مقتضی تو خود اس کا ارادہ و اختیار ہے اور اسی لیے جو کام صادر ہوتا ہے وہ خود اسکی طرف منسوب ہے لیکن شرائط و موانع کے سلسلوں کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے یعنی انسان جب کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو کامیابی اس کو اپنے ارادہ میں جب ہی ہو سکتی ہے کہ جب خدا کی قوت قاہرہ سے تصادم نہ ہو اس لیے اکثر مضبوط سے مضبوط ارادے

موانع کے پیدا ہو جانے کے سبب ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ارباب معرفت نے خدا کی معرفت حاصل کی ہے۔

پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کیوں کر پہچانا۔ امامؑ نے فرمایا عرفت ربی بفسخ العزائم ونقض الهمم اذا عزمت فنفسخ عزمی واذا هممت فنقض همی۔ "میں نے اپنے خدا کو پہچانا مضبوط ارادوں کے ٹوٹ جانے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔ جب میں کوئی ارادہ کرتا ہوں تو وہ میرے ارادے کو توڑ دیتا ہے۔ اور ہمت کرتا ہوں وہ میری ہمت کو پست کر دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری قدرت و قوت سے مافوق قوتِ قاہرہ ہے جس کے مقابل آ کر میری قوتیں عاجز اور درماندہ ہو کر ناکام رہ جاتی ہیں۔

اسی بنا پر ہر آیندہ کام کے متعلق انشاء اللہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تو اس کام کا ارادہ رکھتا ہوں اور پوری کوشش اسکے کرنے کی کروں گا۔ بشرطیکہ خدا اپنی جانب سے کوئی مانع پیدا نہ کر دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشاء اللہ کا صرف اکثر غلط محل پر ہوتا ہے۔ درحقیقت انشاء اللہ کہنے کا موقع یہ ہے کہ انسان پورے طور سے اس فعل کے کرنے پر عازم ہو اور ارادہ رکھتا ہو اس وقت وعدہ کرنا چاہیے تو بے شک اس فعل کے وجود کو خدا کی مشیت پر محول کرنا درست ہے لیکن اگر انسان خود ہی اس فعل کے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس فعل کے وجود کو خدا کی مشیت پر محول کرنا اور اپنی ذمہ داری خدا پر عائد کرنا بالکل بے موقع ہے۔

یقیناً انسان کا اپنے کسی مقصد میں کامیاب ہونا اسی وقت ممکن ہے جب خدا کی قوت وطاقت سے تصادم نہ ہو اور توفیق کہ جس کا انسان کو خدا سے ہر امر خیر میں طالب رہنا چاہیے اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان جس امر خیر کا ارادہ رکھتا ہو خداوند عالم کی جانب سے

اس میں موانع پیدا نہ ہوں اور اسباب مہیا ہو جائیں۔

خلاً کتنے اشخاص ایسے ہیں کہ جن کو عتبات عالیات کی زیارت کا انتہائی شوق ہے اور وہ اس کے لیے بے چین اور مضطرب ہیں۔ لیکن ایسے اسباب نہیں مہیا ہوتے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کریں۔ بلکہ بہت سے باقتدار افراد کی نظیریں پائی جاتی ہیں جنھوں نے تمام سامان سفر درست کر لیا اور ظاہری طور پر اسباب مہیا ہو گئے لیکن کچھ ایسے موانع پیدا ہوئے کہ وہ اس شرف سے مشرف نہ ہوئے۔ اس کے برخلاف بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جنھیں کسی قریبی زمانہ میں خاص طور پر زیارت کا اشتیاق بلکہ خیال بھی نہیں، نہ اسباب سفر مہیا ہیں لیکن دفعتہً ایک قریب ترین عزیز یا دوست جو اُن کے ہم سفر ہونے کا متمنی ہے ان سے خواہش کرتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو میں تمہارے مصارف کا بھی متکفل ہوں۔ یہ عذر کرتا ہے کہ میرے متعلقین کے لیے کیا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ میں ان کے مصارف کا بھی ذمہ دار ہوں

یہ ہے توفیقِ الٰہی جو انسان کے شاملِ حال ہوتی ہے اور جس کی انسان کو اعمال و عبادات کی بجا آوری میں ہر وقت ضرورت ہے۔

تقیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید الانبیاء والمرسلین
محمد ن المصطفیٰ وآلہ الطیبین الطاہرین ط

آیت لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین
ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیء الا ان
تتقوا منہم تقٰۃ ویحذرکم اللہ نفسہ والیہ المصیر ط

تمہید۔ "تقیہ" کا موضوع اکثر غلط فہمیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ افراد جنہیں اس کی حیثیت سے واقف ہونا چاہیئے وہ بھی اکثر اوقات اس لفظ کے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں۔ اور "تقیہ" کے لفظ کو جھوٹ کے مرادف کی حیثیت سے استعمال کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس پر بحث کرنا ایک علمی و مذہبی ضرورت کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ سیرت معصومینؑ کے سمجھنے میں بھی اس کے مختلف پہلوؤں پر نظر کرنا نہایت ضروری ہے۔ بالخصوص حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے مجاہدہ کربلا کی ضرورت و اہمیت کے سمجھنے میں یہ ایک اصولی سوال زیر غور آتا ہے کہ اگر تقیہ نظامِ حیات میں کوئی ضروری عنصر ہے تو حضرت سید الشہداءؑ نے تقیہ سے کام لے کر بیعت یزید کا اقرار کیوں نہ فرما لیا۔ اسی ذیل میں اس تضاد کا دور کرنا ضروری ہو گا جس کا آپ کی سیرت اور ان ائمہ معصومین علیہم

علیہم السلام کی سیرت میں تو ہم پاتے ہیں جنہوں نے اپنے اپنے دور میں تقیہ کی عملی پابندی کا مظاہرہ فرمایا اور اس بارے میں اپنے متبعین کو بھی ہدایتیں فرمائیں۔

پھر چونکہ تقیہ جن حالات واسباب سے متعلق ہوتا ہے وہ اکثر و بیشتر ہر دور ہی میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسے وہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔ جو خالص فلسفی یا تاریخی مسائل کو ہوتی ہے جن کا ماحصل صرف ایک غذائے روح ہوتا ہے اور ان کا عملی زندگی پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ عملی حیثیت سے ایک زندہ مسئلہ ہے جس میں ہمیں صحیح طریقہ کار کا علم ہونا اکثر اوقات ہماری رہنمائی کا باعث ہو سکتا ہے۔

معنی آیت آیت جسے سرنامہ بحث قرار دیا گیا ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ حق کو نہیں چاہیئے کہ وہ اہلِ حق کو چھوڑ کر پرستارانِ باطل سے تعلقاتِ محبت و موافقت قائم کریں۔ اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے اپنے کو بے تعلق سمجھنا چاہیئے۔ ہاں مگر یہ کہ تمہیں ان سے اپنا بچاؤ کرنا ہو اور بہر حال تمہیں اللہ اپنے سے ڈرتے رہنے کی دعوت دیتا ہے اور بازگشت تو اسی کی طرف ہے۔

لفظ تقیہ کی تحقیق تقیہ کی اصطلاح در اصل اسی آیت کے الا ان تتقوا منھم تقٰۃ کے جملہ سے قائم ہوئی ہے تقٰۃ اور تقیہ کے الفاظ چاہے ذرا الگ الگ ہوں مگر ان کا مادہ ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جس سے تقویٰ کا لفظ ماخوذ ہے۔ بلکہ سابق زمانہ کے بعض قاریوں نے جن کے اقوال کتب جمہور میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تقٰۃ کے لفظ کو تقیۃ پڑھا ہے۔ یعنی انکے نزدیک آیت یوں ہے الا ان تتقوا منھم تقیۃ۔ اس کا ذکر علامہ

بیضاوی وغیرہ مفسرین نے اپنے تفاسیر میں بھی کیا ہے۔

بہر حال وہ لفظ تقـٰـۃ ہو یا تقیۃ معنی دونوں کے ایک ہیں یعنی بچاؤ کا سامان کرنا۔ چنانچہ تقویٰ کو تقوے بھی اسی معنی سے کہتے ہیں۔ کہ وہ عذاب آخرت یا غضب الٰہی سے بچاؤ کی فکر ہے۔

حکمِ الٰہی کی تشریح

وہ حکمِ خداوندی جو آیت قرآنی میں دیا گیا ہے عام فہمِ انسانی کی سطح سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

قانونِ عام یہ ہے کہ اہلِ حق اہلِ باطل کو اپنا دوست نہ بنائیں؛ مگر ایک ہوتی ہے دوستی اور معاونت جسمانی اور بشری اعتبار سے۔ اور معاشرتی تعلقات اور نظام مدنی کے لحاظ سے جیسے بیماری یا کسی وقت مصیبت میں تیمارداری یا کسی اور طرح کی غمگساری کرنا۔ بھوک میں سیر یا پیاس میں سیراب کرنا۔ گرتے ہوئے کو سنبھال لینا۔ شخصی خدمات، اور ذاتی امور انجام دینا۔ یہ گناہ نہیں ہے بلکہ اسلام میں متفرق مقامات پر ایسے حقوقِ انسانی کا پتہ دیا گیا ہے جو مذہب و ملت کی تفریق سے علیحدہ ہیں۔ اس طرح کے خدمات بلا معاوضہ بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں اور بہ معاوضہ بھی اور اس طرح دوستی اور معاشرتی تعلقات قائم کرنے میں کوئی ضرر نہیں ہے ۔۔۔ نہ مذکورہ آیتِ قرآنی کا تعلق ان تعلقات و روابط کے ساتھ ہے

دوسری چیز یہ ہے کہ ہم اس باطل کی پالیسی میں شامل ہوں اور ان کے غلط مقاصد میں ان کے ساتھ اتحادِ عمل کریں۔ اور وہ باتیں ہیں یا کریں جن کے لیے ان کے باطل پرستانہ جذبات متقاضی ہیں۔ یہ وہ اتحادِ عمل، معاونت اور دوستی ہے۔ جسے قرآنِ کریم نے منع کیا ہے۔۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو استثناء جو آیا کہ "الا ان تتقوا منھم تقـٰـۃ" مگر یہ کہ ان سے بچاؤ کرنا ہو۔

ظاہر ہے کہ استثناء کا مفاد عموماً اپنے مابعد کے حکم کو ماقبل سے الگ کرنا ہوتا ہے۔ اگر ماقبل استثناء ثبوت ہے تو استثناء کے بعد نفی ہوگی اور اگر قبل میں نفی ہے تو اس کے بعد ثبوت ہوگا۔ لہٰذا جبکہ لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء کے بعد استثناء وارد ہوا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جو چیز الا کے ذکر سے پہلے ممنوع قرار دی گئی تھی۔ اسی کو الا کے بعد والی صورت میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

اب یہی وہ منزل ہے جہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اس صورت میں ضمیر کے خلاف اظہار لازم ہوگا اور اس کا نام جھوٹ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بعض اوقات ضروری یا مستحسن یا کم از کم جائز ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ اختلاف کا سبب

ظاہر ہے کہ قرآن مسلمانوں کے کسی ایک فرقہ کی کتاب نہیں ہے پھر آخر اس بحث کو مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ حیثیت کیوں حاصل ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک فرقہ جو اکثریت رکھتا ہے۔ اسے شروع سے با اقتدار رہنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ لہٰذا اس کے لیے اس قرآنی آیت کے مطابق اپنے بچاؤ کی فکر کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کے برخلاف دوسرا فرقہ جو اقلیت میں تھا اس کو خطرے درپیش ہوتے تھے، اور اسے اپنے بچاؤ کے سامان کی ضرورت ہوتی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے اس قرآنی آیت کی توضیح و تفصیل اپنے نظام زندگی کی تشکیل کے لیے ضروری و لازمی تھی اس طرح نہ اکثر سواد اعظم کی ان چیرہ دستیوں کے منصوبہ کی شکست کا باعث ہو جاتے تھے۔ جن کے ماتحت وہ ان کی قومی زندگی کا مکمل استیصال کر دینا چاہتے تھے۔ چونکہ اکثریت کے منصوبوں کے شکست کی ذمہ داری اس حکم تقیہ پر تھی۔ لہٰذا فطری طور پر انھیں اس حکم سے بنائے مخاصمت پیدا ہو

گئی اور انھوں نے تقیہ پر عمل کو اقلیت کے لیے سرمایۂ طعن و تشنیع بنا لیا اور مناظرہ کے محل پر وہ الزام عائد کرنے لگے کہ شیعوں کے یہاں تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔ جبکہ تفسیر قرآن یا فقہ و کلام کے تصانیف میں جہاں سنجیدگی کا محل ہوتا تھا۔ تقیہ کی مشروعیت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات وجوب کی تصریح بھی کر دی جاتی رہی جو کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ علمائے اہلسنت بھی اس سے متفق ہیں اور درحقیقت نص قرآنی کے بعد مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں کسی اختلاف و افتراق کا وجود ہونا ہی نہیں چاہیئے تھا۔

حکم تقیہ کی بنیاد

خطرہ سے بچنے کے لیے بعض اوقات وہ باتیں جائز ہو سکتی ہیں جو بغیر اس کے جائز نہیں۔

اس حکم کی سب سے بڑی بنیاد اس پر ہے کہ انسانی جان اور اس دنیاوی زندگی کی کوئی قدر و قیمت ہے یا نہیں۔ اگر انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اور یہ دنیاوی زندگی بالکل بے کار چیز ہے تو حفاظت جان کی خاطر تقیہ کا حکم درست نہ ہوگا۔ لیکن اس صورت میں پھر خودکشی کو کوئی جرم یا گناہ کی حیثیت نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایک بے کار شے کا باقی رکھنا اور تلف کر دینا یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن خودکشی اجماع مسلمین ایک گناہ اور باتفاق عقلاء ایک جرم کی حیثیت یقیناً رکھتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جان کی قدر و قیمت یقینی ہے۔ پھر جب ایسا ہے تو اس کی حفاظت اور عدم حفاظت کے لیے قواعد و ضوابط ہونا چاہئیں۔ کوئی اہم موقع ایسا ہونا چاہیئے جہاں جان کا دینا لازم ہو اور بعض مواقع ایسے ہونا چاہئیں۔ جہاں جان کا بچانا لازم یا کم از کم جائز ہو۔

شریعت اسلام میں وہ وقت جہاں جان کے دینے پر تیار ہونا چاہیئے موقع جہاد اور وہ وقت جہاں جان کا بچانا لازم یا جائز ہو محل

تقیہ ہے۔

حسن اور قبح کی بحث

کہا جاتا ہے کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ کبھی جائز نہیں ہو سکتی اور تقیہ ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ لہٰذا وہ ہرگز جائز نہیں قرار پا سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث کا اصلی سرچشمہ "سچ اور جھوٹ" کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل بنیاد افعال انسانی میں حسن اور قبح کے معیار سے متعلق ہے جس سے اس جماعت کو تو کوئی غرض نہ ہونا چاہیے جو حسن و قبح عقلی کی قائل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حسن اور قبح صرف حکم شریعت پر منحصر ہے اس لیے اگر کسی وقت میں شریعت کی طرف سے سچ کی ممانعت ہو جائے اور جھوٹ کی اجازت ہو تو انھیں اس پر انگشت نما ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک سچ میں حکم شریعت سے قطع نظر کوئی اچھائی اور جھوٹ میں ممانعت شرعی سے قطع نظر کوئی برائی ہی متصور نہیں۔ لیکن ہم کہ جو حسن و قبح عقلی کے قائل ہیں، ہمیں خود اپنی جگہ اس پر ذرا سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

افعال انسانی کے مراتب اور حسن و قبح کی نوعیتیں

یاد رکھنا چاہیے کہ افعال انسانی میں ایک تو ذات فعل ہوتی ہے اور ایک وہ عنوانات ہوتے ہیں جو اُن پر مرتب ہوتے ہیں۔ پھر عناوین بھی کچھ عناوین اولیہ ہوتے ہیں اور کچھ عناوین ثانویہ جو ان پر مرتب ہیں۔ مثلاً ضرب ایک کام ہے، اس میں ذات فعل کیا ہے؟ ہاتھ کی جنبش جو مارنے کے وقت ہوتی ہے۔ یہ جنبش بہر صورت ذاتی طور پر "مار" نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ اس قسم کی حرکت ہاتھ کو ہوتی مگر مقابل میں کوئی جسم نہ ہوتا جس پر مار پڑے۔ اس صورت میں

حرکت ویسی ہی متحقق ہے جو ضرب میں ہوتی ہے۔ مگر وہ ضرب نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ضرب ذاتاً فعل نہیں ہے۔ ایک عنوان ہے جو خاص صورتوں میں اس حرکت پر منطبق ہوتا ہے، ایسے ہی دیگر افعال حقیقتاً افعال باعتبار ذات صرف چار ہیں، جنھیں حکما نے "اکوان اربعہ" کہا ہے یعنی حرکت سکون، اجتماع اور افتراق۔

ان ہی چاروں میں سے ہر ایک کچھ مقارنات اور کچھ اضافات کے ساتھ انواع واقسام کے افعال کے عناوین سے معنون ہوتا ہے۔ جیسے قیام قعود، ضرب، اکل، شرب، مشی وغیرہ وغیرہ۔ یہ افعال کے عناوین اولیہ ہوتے ہیں۔ پھر ان عناوین پر عناوین ثانیہ مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ضرب اس پر ایک دوسرا عنوان مرتب ہوتا ہے اور وہ ہے ظلم۔ یہ عنوان لازم عنوان اول نہیں ہے۔ کیونکہ ضرب بقصد اصلاح یا بصورت علاج وغیرہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ ظلم کا مصداق نہ ہوگی بلکہ احسان میں داخل ہوگی لیکن اگر کسی یتیم اور دوسرے بے گناہ کو ایذا رسانی کے لیے مارے تو وہ مارنا ظلم ہوگا۔ معلوم ہوا کہ یہ عنوان ثانوی ہے جو بعض صورتوں میں عنوانِ اول یعنی ضرب پر منطبق ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی اس دوسرے عنوان کے ساتھ ساتھ اور کبھی اس عنوان کے واسطے سے دوسرے عناوین منطبق ہوتے ہیں۔ مثلاً گناہ اور معصیت وغیرہ اس بنا پر کہ خالق اس سے ناراض ہوتا ہے اور اس نے ممانعت فرمائی ہے۔ ہم جہاں تک غور کرتے ہیں وہ کہ جو ذاتی حیثیت سے حسن یا قبح کے ساتھ متصف ہیں اس طرح کہ ان سے حسن یا قبح کسی وقت اور کسی حال میں جدا ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ تر ثانوی اور ثالثی عناوین ہیں۔ جیسے احسان وظلم، طاعت ومعصیت اور نیکی و گناہ یعنی احسان طاعت الٰہی اور نیکی بہرحال مستحسن ہی ہیں اور ان میں استثنا کی

کوئی گنجائش نہیں۔ نہ کوئی قید عائد کی جا سکتی ہے کہ اس حالت میں احسان اچھا ہے اور اس حالت میں برا۔ طاعت الٰہی اس صورت میں اچھی ہے اور اس صورت میں نہیں۔ یہ تفرقہ ناممکن ہے کیونکہ احسان طاعت الٰہی اور نیکی کے تو مفہوم میں اچھائی داخل ہے۔ لہٰذا یہ صفت ان سے جدا کیونکر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ان کے مقابل عناوین یعنی ظلم، معصیت الٰہی اور گناہ یہ کسی حال میں مستحسن نہیں ہو سکتے۔ ان کے مفہوم کے اندر قبح داخل ہے۔ اور وہ کبھی حسن سے تبدیل نہیں ہو سکتا لہٰذا ان کے قبح میں استثناء، یا قید کی گنجائش نہیں۔ اس کے بالمقابل پہلی چیز یعنی ذات فعل کبھی بھی حسن یا قبح سے متصف نہیں ہے۔

کوئی حرکت اور کوئی سکون ایسا نہیں جس کے تصور کے ساتھ ہی ہم اسے مستحسن یا غیر مستحسن سمجھ سکیں۔ لیکن وہ درمیانی درجہ یعنی عناوین اولیہ ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے ساتھ مستحسن ہو جاتے ہیں اور بعض خصوصیات کے ساتھ غیر مستحسن یعنی ان میں حسن اور قبح دونوں کی صلاحیت ہوتی ہے مثلاً ضرب یعنی مارنا۔ یہ جب بعنوان ظلم ہو تو قبیح ہوگا اور جب بعنوان تادیب وغیرہ ہو تو مستحسن ہوگا۔ اب دیکھئے کہ صدق اور کذب، یہ ان تینوں درجوں میں سے کس درجہ کی چیز ہے۔ یہ ذات فعل تو نہیں ہے کیونکہ ذات فعل زبان کی حرکت ہے۔ وہ حرکت جب بصورت کلام ہو اور کلام بھی از قسم خبر تو اس میں صدق اور کذب کے عناوین سے اتصاف ہوتا ہے۔ پھر یہ صدق اور کذب کچھ دوسرے عناوین سے متصف ہوتا ہے جیسے اصلاح یا فساد۔ اب جبکہ صدق اور کذب کی حیثیت درمیانی درجہ کے عناوین کی ہے اور ان پر عناوین ثانویہ ایسے منطبق ہو سکتے کا امکان ہے جس میں حسن اور قبح ذاتی ہوا کرتا ہے جیسے اصلاح۔ یہ ایک ایسا عنوان ہے جس میں سوائے حسن کے قبح کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح فساد

جس میں سوائے قبح کے حسن متصور ہی نہیں ہے تو اب صدق اور کذب کو یا تو ایسا ماننا پڑے گا کہ قطع نظر ان عناوین کے جو ان پر مرتب ہیں ان میں کوئی پہلو حسن یا قبح کا ہو ہی نہ اور یا زیادہ سے زیادہ ایسا مانا جاسکتا ہے اور یہی درست بھی ہے کہ صدق میں بجائے خود تقاضا حسن کا ہے۔ مگر اس وقت تک کہ جب تک عنوانِ افساد اس پر منطبق نہ ہو اور کذب میں تقاضا قبح کا ہے مگر اس وقت تک کہ جب تک عنوانِ اصلاح اس پر منطبق نہ ہو لیکن اگر صدق میں افساد ہو اور کذب میں اصلاح تو پھر حسن اور قبح کا حکم بالعکس ہو جائے گا۔ اسے علمی الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ صدق اور کذب میں جانبِ حسن اور قبح ہے تو مگر بحد مقتضی ہے۔ علتِ تامہ کے طور پر نہیں ہے لہٰذا اس تقاضائے قبح کے ساتھ جب وہ عنوان صادق آجاتا ہے تو علت تامہ حسن کی ہے۔ تو اس قبح کا زائل ہو جانا لازمی ہے اور اسی طرح جب تقاضائے حسن کے ساتھ وہ عنوان صادق آجائے گا جو علتِ تامہ قبح کی ہے تو اس حسن کا زائل ہو جانا لازمی ہو گا۔ اسی لیے مصلح الدین سعدی شیرازی نے بھی کہا ہے۔ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" اور اس کے بعد حکم "تقیہ" میں عقلی طور پر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

حقیقت اور اس کے اظہار و اخفا کے مواقع | علم اور اس کی اشاعت

علم اور اس کا اجرار حقیقت اور اس کا اظہار۔ یہ مختلف منزلیں ہیں جن میں سے ہر ایک میں خیر و صلاح کا مدِ نظر رکھنا امرِ حکیم اور فاعلِ حکیم کے لیے ضروری ہے اور وہ صلاح کہ جس پر کسی حکم کی فعلیت کا انحصار ہے ان تمام پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ حالات و واقعات اور خصوصیات کے لحاظ سے مصالح و حکم کی تبدیلی احکام شرعیہ میں نسخ اور احکام تکوینیہ میں بدا کے نام

سے ایک مستقل حیثیت ہے جس پر بحث علم کلام کا ایک مستقل باب ہے۔ جس طرح رفتار کے لیے قدم اور ترقی کے لیے زینے ناگزیر ہیں اس میں یہ معلوم ہے کہ شروع ہی سے اصل مصلحت کا تعلق اس آخری قدم سے ہے جس کے ساتھ منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ مگر پہلے لمحہ میں اس منزل پر قدم پہنچانے کا حکم کسی طرح درست نہیں ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ امکان واستطاعت سے زیادہ قدم آگے بڑھانے اور ایک دم سے منزل تک پہنچنے کی کوشش اس طرح منہ کے بل گرا دے کہ ہمیشہ کے لیے منزل تک پہنچنے سے محرومی ہو ہی جائے۔

نظام تعلیم میں اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اصل شے جس سے نفع ومصلحت کا تعلق ہے وہ تعلیم کا ایک بلند نقطہ ہے جہاں تک پہنچنا اصل میں مدنظر ہے۔ مگر بچہ کو پہلے دن سے اس تعلیم سے روشناس بنانے کی کوشش سعی لاحاصل اور نقش بر آب ہوگی۔ اور بسا اوقات طالب علم کی اتنی بددلی کا باعث ہوگی کہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیم ہی سے متنفر ہو جائے۔ اس لیے اس کی سطح دماغی کی مناسبت سے آگے بڑھانا ہی مناسب وضروری ہے۔ کیا شبہ کہ وہ حقیقتیں جو نصاب تعلیم کی آخری منزل میں بتائی جائیں گی حقیقت ہی ہیں۔ مگر ان حقیقتوں کے سمجھنے کی ابھی اس کے دماغ میں صلاحیت نہیں لہٰذا ابھی اس سے ان حقیقتوں کا پردہ میں رکھنا ہی بہتر واصلح ہے۔ یہی ہدایت اور تلقین معارف کی صورت ہے۔

افرادِ مخاطبین کی سطح دماغی اکثر ایسی ابتدائی منزل ہوتی ہے کہ وہ بلند حقیقتوں کے تحمل کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لیے ابتداءً ان کے سامنے سیدھی سادی باتیں رکھ دی جاتی ہیں جنھیں وہ بآسانی قبول کر لیں۔ اس حالت میں بھی ان بلند تر حقیقتوں کے حقیقت ہونے میں شک نہیں۔ مگر ان کا بتانا اور سمجھانا اکثر حالات میں مناسب نہیں ہوتا۔ اسے بلاشبہ

"اخفائے حقیقت" کہا جاسکتا ہے۔ مگر یہ اخفا ء ضد حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ مفادِ حقیقت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت پوشی ناحق کوشی نہیں بلکہ حقیقت پروری ہوتی ہے۔ انبیاء و مرسلین کے تعلیمات کا ارتقاء اسی محور پر گروش کرتا ہے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اصولِ تعلیم از آدمؑ تا خاتمؐ ایک ہیں۔ ان میں کوئی فرق نہیں۔ وہ غیبی حقیقتیں جو حضرت محمد مصطفیؐ کی زبانی دنیا تک پہنچائی گئیں اس وقت بھی حقیقت ہی تھیں کہ جب آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے۔ مگر عام انسانی سطح ذہن اتنی بلند نہ تھی کہ اسے ان تفصیلی حقائق سے آگاہ کیا جاتا۔ اس لیے اس وقت اجمالی طور پر آخرت اور جزا و سزا کی اطلاع دے دی گئی۔ مگر جس تفصیل، تجزیہ اور تحلیل کے ساتھ ان باتوں کا ذکر قرآنِ مجید اور احادیث پیغمبرِ اسلامؐ میں آیا ہے۔ اس کا ذکر گزشتہ کتب اور انبیاء کے بیانات میں نظر نہیں آتا۔

یونہی احکام عبادات و معاملات ہیں۔ یقیناً روزہ میں جو خوبیاں ہیں وہ ہمیشہ سے تھیں مگر افرادِ خلائق کی نفسیاتی کیفیت اس لائق نہ تھی کہ اس پر یہ بار ڈالا جاتا۔ جب خالقِ حکیم کی نگاہ میں خلقِ خدا کی سطحِ نفسانی اس کے لائق ہوئی تو اس پر یہ فریضہ عائد کیا گیا۔ اسی طرح مثلاً شراب پینے کی مضرتیں جو اس عمل کے ساتھ ہمیشہ ہی سے وابستہ ہیں۔ مگر شروع میں جامعۂ مذہب کے افراد اس صلاحیت کے درجہ تک نہ پہنچے تھے کہ ان کے سامنے اس حکم کو لایا جاسکے لہٰذا اس ممانعت کا اجبار نہیں ہوا۔

شرائع کا یکے بعد دیگرے تبدیل ہونا اور ایک ہی شریعت میں تدریجی طور پر احکام کا آنا جو تمام عالمِ اسلامی میں متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہے۔ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

اب غور کیجئے کہ روزمرہ کی فرضیت سے قبل روزہ کی منفعت و ضرورت پردہ میں رکھی گئی یا نہیں۔ تحریم شراب کے پہلے شراب کی مضرت پردہ میں رکھی گئی یا نہیں۔ اس کے بعد کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ اخفائے حقیقت مطلق طور پر غیر مستحسن یا ناروا ہے۔

اسی سے اظہار واقعہ بصورت خبر کو بھی سمجھا جا سکتا ہے کسی بات کا زبان پہ لانا۔ اس میں صرف اس بات کا حق ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس حق کے زبان پر لانے کے نتائج کیا ہوں گے؛ اور ان نتائج کے وقوع میں منفعت ہے یا مضرت۔ اگر وہ نتائج مفید مقاصد کے لیے صلاح و منفعت کے حامل ہیں تو اس حقیقت کا زبان پہ لانا درست ہوگا اور اگر وہ نتائج بحالات موجودہ مضرتوں کے حامل ہیں تو ایسے ہنگام میں حقیقت کا اظہار بسا اوقات بدترین جرم قرار پائے گا۔

یہ مضرتیں شخصی بھی ہو سکتی ہیں اور نوعی بھی۔ نیز کبھی شخصی اور نوعی مفاد میں تصادم پیدا ہو جائے گا۔ تو وہاں دونوں کی اہمیت کے توازن سے کوئی حکم لگایا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے جس کی بنا پر علماء نے کہا ہے کہ تقیہ کا کوئی ایک حکم نہیں ہے بلکہ کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب، کبھی مباح، کبھی مکروہ اور کبھی حرام۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ بے شک حقیقت کا اظہار بعض اوقات نامناسب ہو سکتا ہے مگر یہ ایک منفی عمل ہے۔ اس کے لیے خلاف واقعہ اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جھوٹ ہوگا۔ جھوٹ کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں یہ کہوں گا کہ جس غرض سے حقیقت کا اخفاء مناسب ہوتا ہے وہ غرض جب منفی صورت سے پوری ہو جائے تو پھر ہم بھی خلاف واقعہ اظہار کو جائز نہ سمجھیں گے۔ لیکن اگر وہ غرض بغیر ایجابی پہلو کے پوری ہی نہ ہو تب؟

اس کے علاوہ عدم اظہار بھی اکثر اوقات کسی نہ کسی حیثیت سے اظہار خلاف واقعہ میں داخل ہو ہی جاتا ہے۔

اس کے لیے سنت کی قسموں کا یاد دلا دینا کافی ہے۔ تمام علمائے اسلام کے نزدیک متفقہ طور پر سنتِ رسول کی تین قسمیں ہیں۔ قول، فعل تقریر۔ کوئی بات پیغمبرِ خداؐ نے زبان سے ارشاد فرمائی۔ یہ ہوا قول کوئی امر عمل میں لاکر دکھایا۔ یہ ہوا فعل۔ کسی عمل کو دیکھ کر سکوت اختیار فرمایا یہ ہے تقریر۔ اب فرض کیجئے وہ وقت کہ جب اظہار واقعہ مناسب نہیں ہے یا اس کا محل نہیں ہے اور اس صورت میں پیغمبرِ خدا نے کسی کو اس عمل کو انجام دیتے دیکھا جسے حقیقتاً اسے عمل میں لانا چاہیئے۔ اب اسے دیکھ کر رسولؐ تائید بھی نہ فرمائیں تو کم از کم سکوت فرمائیں گے (جبکہ مفروضہ یہ ہے کہ اظہار مناسب نہیں ہے) مگر یہ سکوت بھی سنت کی تیسری قسم میں داخل ہو کر دلیل جواز بن جائے گا اور اس طرح تقریری حیثیت سے یہ عدم اظہار مخالفت اظہار موافقت لازماً قرار پا جائے گا پھر اب عدم اعلان صرف منفی دائرہ میں کہاں منحصر رہا۔ اس کے خلاف کسی نہ کسی حد تک تو عمل ہو ہی گیا۔ ایسا ہی اکثر ان مواقع پر سمجھنا چاہیئے جہاں حقیقت کا اظہار مناسب ہو۔

عقلِ عمومی کا فیصلہ اور تمدنِ حاضر کا تقاضا

آج کل کی متمدن دنیا میں بھی خطرے کے موقع پر افراد اور جرائد پر یہ پابندیاں عائد ہوتی رہتی ہیں کہ وہ مفاد ملکی کے خلاف کوئی بات نہ کہیں اور نہ لکھیں ظاہر ہے کہ دلوں پر قابو پانا کسی حکومت کا کام نہیں ہے۔ یہ امر کہ تمہارے دل و دماغ میں کوئی خیال نہ پیدا ہو جو مصالح ملک کے خلاف ہو، تمہارے دل کی گہرائیوں میں کوئی ایسا اعتقاد نہ ہو جو سیاست وقت

کے خلاف ہو۔ اس کا مطالبہ اور اس پر محاسبہ دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔
اس لیے اس پابندی کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے دل میں چاہے جو ہو مگر
تم کوئی بات ایسی نہ کہو اور نہ کرو جو ملک کے مفاد کے خلاف ہو۔ اس
باب میں اگر سچائی کی قدر و قیمت سمجھی جائے تو جب اس قسم کا کوئی مقدمہ پہلے
تو ملزم کی طرف سے یہ صفائی قابل قبول ہونا چاہیئے کہ ہم نے جو کہا ہے ہم
سمجھتے ہی ویسا ہی۔ اور ہم نے جو کہا ہے وہ سچ کہا ہے۔ مگر سب کو معلوم ہے کہ
یہ صفائی کسی بھی تمدن و تہذیب کے علمبردار ماحول میں قابلِ قبول نہیں ہو گی
اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے بتقاضائے تمدن مطالبہ یہی ہے کہ تم سمجھتے چاہے
جو کچھ ہو لیکن جب تک تم اس نظامِ حکومت کے ماتحت رہتے ہو اور اس
جامعہ کی فرد ہو اس وقت تک تم کہو اور کرو نہیں کوئی ایسی بات جو اس ملک یا
حکومت کے حق میں مضر ہو پھر اس کے ساتھ اگر یہ بھی بڑھا لیا جائے کہ جو خود
تمہارے جان و مال یا آبرو کی حیثیت سے خود تمہارے لیے مضر ہو تو اصولاً اس
میں کیا خرابی واقع ہو سکتی ہے۔

بس یہی فیصلہ جو عقل عمومی کے ماتحت تمام متمدن دنیا کا ہے اسی کو مناسب
حدود میں اسلام نے قانونِ تقیہ کے تحت میں منضبط کیا ہے اور اس نے وہ حدود
بتلائے ہیں جن کے مطابق نظامِ اجتماعی کے اس مطالبہ کا احترام کیا جا سکے اور وہ
درجہ بھی کہ جہاں ایک بندۂ خدا کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نظامِ اجتماعی کی اصلاح
کے لیے طاقت و اقتدار اور رائے عامہ کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دے اور وہ کہنے
اور کرنے کے لیے تیار ہو جائے جو اس کے ضمیر کا واقعی فیصلہ ہے۔ یہی وہ
منزل ہے جہاں تقیہ حرام ہے اور جس کی بہترین مثال حسین ابن علی نے
کربلا کے میدان میں پیش فرمائی۔

خوف اور اس کے اقسام و احکام | چونکہ تقیہ کا موضوع خوف ہے

مال کا خوف، جان کا خوف، اپنے عزت و ناموس کا خوف، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ افشائے راز سے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا خوف جس کی حفاظت اپنا اہم نصب العین ہے۔ اس لیے اس کے خلاف کبھی ایسی آیتیں قرآن کی پیش کی جاتی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو کبھی خوف دامنگیر ہی نہیں ہونا چاہیے جیسے الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون دوستداران خدا پر نہ کبھی خوف طاری ہوتا ہے اور نہ حزن و ملال۔ مگر ان آیات پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو قسم کی آیتیں ہیں۔ ایک وہ کہ جن میں خوف اور حزن سے مراد آخرت کا خوف و حزن ہے۔ اس کا دار دنیا کے خوف و حزن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور دوسری قسم ان آیتوں کی ہے جنکا مطلب یہ ہے کہ خوف خلائق سے حکم خالق کی مخالفت درست نہیں ہے جیسے افلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین

ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

اتخشون الناس واللہ احق ان تخشوہ

"تم انسانوں سے ڈرتے ہو۔ اللہ زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے"

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اللہ سے اندیشۂ ضرر پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ اندیشہ تو اسباب دنیویہ سے متعلق ہے۔ اگر کوئی زبردست حاکم ہے جو ضرر رسانی پر تلا ہوا ہے اور ہمارے پاس مدافعت کے اسباب نہیں ہیں تو اس سے ضرر پہنچنے کا احتمال یا گمان ضرور پیدا ہوگا۔ اسی احتمال یا گمان کا نام خوف ہے۔ مگر اس خوف سے متاثر ہو کر انسان کو وہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جو حکم الٰہی کے خلاف ہو۔ یہی وہ ہے جس کی ان آیتوں میں ممانعت کی گئی ہے۔ سبب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صاحبانِ ایمان کو اندیشۂ ضرر پیدا ہی نہیں ہوتا تو اگر اس اندیشۂ ضرر کی وجہ سے خود خالق کریم کی طرف سے انسان کے لیے کوئی حکم الزامی یا رعایتی ثابت ہو جائے تو

اس پر کاربند ہونا مذکورہ بالا آیات کے خلاف کہاں قرار پاسکتا ہے۔

ہم جب احکام شرعیہ پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سے احکام کا موضوع خوف ہی ہے۔ مثلاً جب خوف مضرہو تو وضو کے بجائے تیمم کرنا ہوگا۔ خوف مضر ہو تو روزہ ماہ صیام میں نہ رکھا جائے بلکہ دوسرے زمانہ میں قضا کر لیا جائے۔ خوف ضرر کے ساتھ سفر کیا جائے تو اس سفر میں قصر صلوٰۃ نہ ہوگا۔ بلکہ نماز پوری پڑھی جائیگی۔ جنگ میں نماز کی ایک خاص صورت ہے جس کا نام ہی ہے صلوٰۃ خوف۔

اگر خوف کی کیفیت کا ذہن میں پیدا ہونا ہی شانِ ایمان کے خلاف ہوتا تو یہ احکام بےکار ہوجاتے اور انکا موضوع ہی متحقق نہ ہوتا۔ خاص طور پر یہ آیت قابلِ ملاحظہ ہے جس میں اہل ایمان کے امتحانات کا ذکر ہے۔

ولنبلونکم بشیئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ا

"ہم ضرور تمھارا امتحان لیں گے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ۔ خوف، بھوک اور نقصان اموال و ثمرات ؟؟ اس میں سب سے پہلی چیز جسے ذریعۂ امتحان بتایا گیا ہے وہ خوف ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے کہ خوف کا پیدا ہونا شانِ ایمان کے خلاف ہے۔

اب نظام شریعت میں نظر کیجیے تو آپ کے سامنے مختلف مثالیں ایسی آئینگی کہ شریعت نے ہماری جان و مال کے مفاد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے احکام میں تبدیلی پیدا کردی۔ نماز کے لیے اصل حکم وضو کا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صلاح کلی نماز کو باوضو ادا کرنے میں ہے لیکن اگر نقصان کا اندیشہ ہو خواہ مرض کے پیدا ہونے کا یا مرض میں طول ہوجانے کا یا علاج کے دشوار ہوجانیکا تو شارع مقدس کی جانب سے حکم میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔ اب وضو کے بجائے تیمم کا حکم ہوجاتا ہے۔ اگر شانِ عبودیت ہرحال میں یہ ہوتی کہ اپنے مفادِ جسمانی سے قطع نظر کی جائے تو معیارِ کمالِ عبادت یہ ہوتا کہ چاہے مرجاؤ مگر نماز باوضو ادا کرو۔ معلوم ہوتا ہے خالق کا منشا یہ نہیں ہے یہاں تک کہ اگر کوئی جہالت سے کام لے کر اس طرح ذوقِ عبودیت کو پورا کرنا چاہے تو

اس کی نماز باطل ہوگی اور وہ وضو صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح روزہ کا حکم اور قصر نماز کا حکم ۔ وغیرہ وغیرہ۔

آخر یہ سب ہماری ضرورتوں، ہماری جسمانی تکلیفوں، ہماری صحت ہی کی حفاظت کے لیے ہے۔ پھر خوف مرض سے جان جانے کا ہی نہیں بلکہ اس سے کم درجہ کا اندیشہ ہو تو حکم میں تبدیلی ہو جائے اور اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے لیکن اگر کسی ظالم کے ہاتھ سے جان جانے کا اندیشہ ہو اور اس اندیشہ کی وجہ سے حکم شریعت میں تبدیلی ہو جائے تو یہ شانِ اطاعت و عبودیت کے خلاف سمجھ لیا جائے اور قابلِ اعتراض چیز بن جائے! یہ منطق ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

جب خالق ہمارے جسم و جان کا خالق ہی نہیں بلکہ رب بھی ہے یعنی اسبابِ بقا کا فراہم کرنے والا تو اگر وہ اپنی شانِ ربوبیت سے ہماری بقائے زندگی کے لیے کوئی مراعات کرے تو اس مراعات پر عمل کرنا شانِ عبودیت کے خلاف کیونکر ہوگا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح نماز اس کی ہے، روزہ اس کا ہے، اسی طرح ہماری جان بھی حقیقتاً اسی کی ہے اور اسی نے اس کا تحفظ فرض قرار دیا ہے۔ لہٰذا خوفِ جان سے کسی عبادت کے ترک کرنے یا صحیح صورت کے خلاف عمل میں لانے کو یوں تعبیر کیا جائے کہ ہم نے خدا کے حکم کے مقابلہ میں اپنی جان کو ترجیح دی بلکہ اسے یوں سمجھے کہ ہم خالق کے ایک حکم کی تعمیل کے لیے جو اہم ہے یعنی حفاظتِ جان اس کے دوسرے حکم کی تعمیل سے قاصر رہے۔

تقیہ یا جھوٹ

تقیہ کی تعبیر جھوٹ کے ساتھ ایک عام فیشن بن گیا ہے جسے مناظرہ کے میدان میں اتنا زبان پر لایا گیا ہے کہ اب اکثر اوقات محاورہ میں یہ دونوں الفاظ بطور مترادف کے استعمال ہونے لگے ہیں۔

حقیقت امر یہ ہے کہ افراط و تفریط کے نقطوں کے درمیان جو اعتدال کا نقطہ ہے وہی حقیقی طور پر حکیمانہ نقطۂ نگاہ ہوتا ہے مگر تعبیرات کی وسعت میں افراط یا تفریط کے

لفظوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ذرا سے اُلٹ پھیر کے ساتھ اس پر کسی ایسے نام کا اطلاق کر دینا بہت آسان ہوتا ہے جو انتہائی قابلِ مذمت ہو۔

مثلاً ان مذاہب کے معیارِ نگاہ سے جو روحانیت کا کمال اس میں سمجھتے ہیں کہ انسان تجرد اختیار کرے۔ اسلام کی ترغیب ازدواج ہی نہیں بلکہ تعدادِ ازدواج کے حکم کو بآسانی ان لفظوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عیاشی کی تعلیم دی ہے اور کوئی شک نہیں کہ یہ لفظ بہت برا ہے مگر اس بُرے لفظ کے ساتھ تعبیر کر دینے سے وہ طرزِ عمل برا نہیں قرار پا سکتا جسے خاص ضوابط و قواعد کے ساتھ اسلام نے جاری کیا ہے۔ اسی طرح مطلق عدم تشدد والے نظریہ کی جانب سے مخصوص حدود و شرائط کے ساتھ تلوار اٹھانے کی اجازت کو خونریزی کی تعلیم سے تعبیر کر دینے میں کیا دشواری ہے اور کوئی شک نہیں کہ خونریزی بری چیز ہے مگر کیا اس سے اسلام کی اس تعلیم پر واقعی کوئی حرف آ سکتا ہے؟ یا بہادری کے اس معیار پر جو تہور کی حد میں داخل ہوتا ہے کسی مناسب موقع و محل پر بردبارانہ طرزِ عمل یا صلح پسندی دامنِ پوری کو "بزدلی" کہہ دیا جاتا ہے اور بزدلی کے بُرے ہوتے ہیں کوئی شک نہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ صلح اپنی جگہ بُری شے ہے۔ اسی طرح سخاوت کو فضول خرچی میں، میانہ روی کو بخل میں، صاف گوئی کو بداخلاقی میں اور حکمتِ عملی کو مکاری میں داخل کر دیا جانا بہت آسان ہے۔

بسا اوقات ان باتوں میں ایسا بال کا سا باریک فرق ہوتا ہے کہ اسے لفظوں میں سمجھانا بھی دشوار ہوتا ہے۔

نام یہ سب ایسے بُرے ہیں کہ ان کی برائی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، نہ اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے۔ مثلاً کون کہے گا کہ عیاشی اچھی چیز ہے، خونریزی بہتر امر ہے، بزدلی قابلِ تعریف شے ہے۔ فضول خرچی مناسب بات ہے۔ بخل ممدوح فعل ہے۔ اور مکاری مستحسن عمل ہے۔ یقیناً یہ سب باتیں بری اور بہت بُری ہیں۔ پھر بھی ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ وہ کام جو ان ناموں کے تحت میں بسا اوقات داخل کر لیے

جاتے ہیں اکثر حالات میں نہایت صحیح، مناسب اور قابلِ مدح و ستائش ہوتے ہیں جن کو صرف بد اندیشی یا غلط فہمی سے ان ناموں کے تحت میں داخل کر دیا جاتا ہے مگر حقیقتاً وہ اس کے مستحق نہیں ہوتے۔

اسی طرح "جھوٹ" نام یقیناً بہت برا ہے اور اس کی برائی ایسی ہے کہ اس میں کسی اچھائی کا تصور کرنا قطعاً مشکل بلکہ ناممکن سا ہے مگر جس جس بات کو جھوٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ بات بسا اوقات اپنی جگہ نہایت مناسب بلکہ ضروری ہوتی ہے۔

اب اگر برائی جھوٹ میں لازم ذات محسوس ہوتی ہو تو چاہے لفظوں میں فرق سمجھنا اور سمجھانا دشوار ہو مگر ماننا یہی پڑیگا کہ وہ صورتیں جو یقیناً مناسب و مستحسن ہیں جھوٹ سے ضرور خارج ہیں کیونکہ وہ مستحسن ہیں اور جھوٹ کلیتہً بری چیز ہے اور نہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ جھوٹ کلیتہً برا نہیں ہے بلکہ اس میں دونوں صورتیں نکلتی ہیں۔ اچھائی بھی اور برائی بھی جیسا کہ مصلح الدین سعدی شیرازی نے کہا ہے "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز"

خواہ اس طرح کہ جھوٹ کو ایک جامہ زیب چیز مانا جائے جس میں ذاتاً نہ اچھائی ہے اور نہ برائی۔ بلکہ یہ دونوں باتیں قیود و خصوصیات سے پیدا ہوتی ہیں یا پھر یہ مانا جائے کہ جھوٹ میں بذاتِ خود تقاضا تو برائی کا ہے لیکن کوئی اہم ضرورت و مصلحت اسکے تقاضائے طبعی پر غالب آکر اسے حسن کی صفت سے متصف بنا دیتی ہے۔ لہٰذا وہ جھوٹ جو خواہ مخواہ بولا جائے جس کے لیے کوئی ضرورت داعی نہ ہو بتقاضائے ذات برا رہیگا اور قابلِ مذمت گناہ ہوگا۔ نہ یہ کہ وہ جس میں کوئی اہم مصلحت مضمر ہو۔

صدق اور کذب کے مختلف پہلو

یہ خاص طور پر قابلِ لحاظ امر ہے کہ "جھوٹ" کا دامن چاہے کوتاہ ہو مگر چونکہ وہ صدق کے مقابل میں ہے لہٰذا صدق کے حدود پر نظر کرنا ضروری ہے کہ اس میں کون کون سے پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً صدق میں داخل ہے صدق وعدہ یعنی وعدہ

کا سچا ہونا۔ اب فرض کیجیے کہ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کیا ہے کہ میں کبھی تمہارے راز کو افشا نہ کروں گا۔ اب اس نے اسی وعدہ پر کوئی راز آپ کے سپرد کیا۔ اس کے بعد اس کا کوئی دشمن آکے اس راز کو آپ سے دریافت کرتا ہو تو اب دیکھیے کہ یہاں حقیقت کا اظہار کر دینا سچائی ہے یا نہیں۔ خود اس کلام اور اس کے مطابق واقعہ ہونے کے لحاظ سے دیکھیے تو وہ سچا ہوگا۔ مگر اس وعدہ کے لحاظ سے دیکھیے جو آپ نے افشائے راز نہ کرنے کے متعلق کیا تھا تو یہ اظہار کرنا سچائی کے خلاف ہے۔ اب جتنا یہ راز اہم ہو اور جتنی اس کے افشا کی مضرتیں زیادہ ہوں اتنا ہی یہ سچ کہہ دینا قابل مذمت و ملامت ہوگا۔ اور گناہ قرار پائے گا۔ اب اسے یوں کہنے کو کہہ دیا جائے کہ وہ جھوٹ ہے مگر حقیقت میں وہ ایک عظیم تر جھوٹ سے بچنے کی کوشش ہے۔ اسی طرح صدق وعدہ یعنی قول و قرار اور پیمان کو پورا کرنا۔ اس کی مخالفت بھی ایک جھوٹ ہی ہے مگر کبھی لفظی سچائی اس جھوٹ کی مستلزم ہوتی ہے اور اس سچائی کا لحاظ کرنا لفظی طور پہ جھوٹ کے الزام کا باعث ہوتا ہے مگر ایک فرض شناس انسان کو اسے اختیار کرنا پڑتا ہے جو درحقیقت سچائی پہ قائم رہنے کی کوشش ہے چاہے دنیا والے اسے غلطی یا عداوت میں جھوٹ ہی کہہ کر مطعون کرنے کی کوشش کریں۔

یہ عہد و پیمان کبھی خود اختیاری ہوتا ہے جیسے کسی نے اپنے اوپر عائد کر لیا ہے اور کبھی بتقاضائے ایمان خالق حکیم کی جانب سے ہوتا ہے۔ جیسے نفس محترم کی حفاظت۔ خالق کی طرف کا عہد ہے اب جتنا اس نفس کے احترام کا درجہ بلند ہوتا ہے اتنا ہی اہم اس کی حفاظت کا عہد ہوگا۔ ادنیٰ درجہ ہے اپنی جان کا اس سے زیادہ کسی دوسرے بے گناہ کی جان کا۔ اس سے عظیم تر کسی ولیِ خدا

کسی نبی یا رسول کی جان کا اور سب سے بڑھ کر خاتم المرسلینؐ کی جان ۔ اب اگر کوئی موقع ایسا ہے کہ اظہارِ واقعہ کسی جان کی تلف کا باعث ہے تو واقعہ کا اظہار بظاہر سچائی ہے مگر وہ اسی عہدِ الٰہی کی مخالفت ہونے کی بنا پر جو حفاظتِ نفس سے متعلق ہے ایک بہت بڑا سچائی کے خلاف عمل ہے ۔ یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سچائی زیادہ قیمت رکھتی ہے ۔ یہ لفظی سچائی جو واقعہ کے بیان سے متعلق ہے یا وہ عہد کی سچائی جس کے پورا کرنے کے متعلق خالق کا حتمی مطالبہ ہے ۔
یہ وہ منزل ہے جہاں سنتِ الٰہیہ بھی خود ہمارے لیے رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہے ۔

جھوٹ کا الزام آخر کس چیز پر عائد کیا جاتا ہے ؟ وہی لفظیا عمل جس سے مخاطب واقعہ کو حقیقت کے خلاف سمجھے ۔ اب اس ذیل میں ان صورتوں پر آپ نظر ڈال سکتے ہیں جو خالقِ کریم نے اپنے کلیم موسیٰ اور پھر حضرت عیسیٰ اور آخر میں بموقع ہجرت جناب خاتم النبیینؐ کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائیں ۔ اس کے بعد کون ہوگا جو تقیہ پر کوئی اعتراض کر سکے ۔

تقیہ کے شرائط

گزشتہ بیانات سے تقیہ کی مشروعیت اور ضرورت پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے ۔ پھر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تقیہ ہر موقع و محل پر خلافِ واقع امر کے اظہار کا نام نہیں ہے ۔ نہ ہر موقع پر تقیہ درست ہے ۔

اس کے لیے حسب ذیل شرائط و قیود کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے

۱۔ تقیہ دفع مضرت کے لیے ہوتا ہے ۔ جلب منفعت کے لیے نہیں ۔
جاہ طلب لوگ صرف کسی منفعت کے حصول کے لیے کسی ملازمت کی خاطر کسی شہرت عامہ کے مقصد سے اور کسی رئیس کو خوش کرنے

کے واسطے سچائی کے خلاف کتنے انکار کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں یہ قطعاً کسی شریعت اور عقل کے رو سے جائز نہیں ہو سکتا۔ ہاں جس وقت جان، مال یا عزت و ناموس کو صدمہ پہنچ رہا ہو۔ اس وقت ایسا طرز عمل اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس ضرر و نقصان سے محفوظ رکھ سکے۔

۲- تقیہ کی مشروعیت حقوق اللہ میں ثابت ہے۔ مگر حقوق الناس میں اس کی مشروعیت بہت حد تک غیر قابل تسلیم ہے۔ بلکہ کسی حد تک اس کے خلاف یقینی طور پر ثابت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی دوسرے کی جان لینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اسی طرح اپنے کو کسی مالی نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے کو مالی نقصان میں مبتلا کر دینا۔ یا اپنی آبرو کے تحفظ کے لیے دوسرے کی آبروریزی کر دینا۔

حدیث میں ہے۔ انما شرعت التقیۃ لحقن الدماء فاذا بلغ الدم فلا تقیۃ۔ "تقیہ صرف خونریزی سے تحفظ کے لیے قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جب تقیہ خود خونریزی کا باعث ہو جائے تو پھر تقیہ نہیں ہے۔"

۳- تقیہ صرف اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کسی ایسے مقصد کا جس کی اہمیت نظر شارع میں ہماری جان سے بھی زیادہ معلوم ہو، تحفظ ہمارے جان دینے پر موقوف نہ ہو جائے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر تقیہ حرام ہو جائے گا۔ اسی بناء پر علماء نے ارشاد کیا ہے کہ تقیہ کا کوئی ایک حکم نہیں ہے۔ بلکہ تقیہ کبھی واجب ہوتا ہے کبھی مستحب کبھی مباح، کبھی مکروہ اور کبھی حرام۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ مفاد دینی اور جان یا مال یا عزت یعنی اس نقصان کی نوعیت کے لحاظ سے جو پہنچنے والا ہے دونوں کی اہمیت کا موازنہ کیا جائے گا۔

۱۔ اگر مفاد دینی مقدم ہو اور اس کی حفاظت کا انحصار اس شخص میں ہو۔ سوا اس کے کوئی دوسرا اس کام کو انجام ہی نہ دے سکتا ہو تو تقیہ حرام ہوگا اس کی مثال انبیاء و مرسلین ہیں جنہوں نے ہدایت خلائق کے لیے ہر طرح کے تکالیف اٹھانا برداشت کیے۔ انھیں تقیہ روا نہ تھا اس لیے کہ اگر وہ اظہار حقیقت سے خطروں کا لحاظ کر کے گریز کرتے تو پھر ان حقیقتوں کا دنیا تک پہنچانے والا کون ہوتا۔ ان کا تو مقصد حیات ہی خلق خدا کی ہدایت تھا۔ لہٰذا وہ اس بارے میں کسی قربانی سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا بھی موقف یہی تھا۔ اگر آپ ایسے آڑے وقت میں اسلام کے کام نہ آتے تو اور کون ہو سکتا تھا جو اس مقصد کو پورا کرے۔

۲۔ اگر مفاد دینی اہم اور مقدم ہو لیکن دوسرے بھی اس خدمت کو انجام دے سکتے ہوں اور انجام دے رہے ہوں اور اس شخص کی ذات کے ساتھ کوئی دوسری اہم خدمت جو اسی کی ذات سے وابستہ ہے متعلق نہ ہو تو اس کے لیے دین کی خاطر قربانی کو پسند کرنا مستحسن یا یوں سمجھئے کہ مستحب ہوگا۔ اور تقیہ اس وقت میں مرجوح ہوگا جسے "مکروہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اگر تقیہ کر کے اپنی جان کو بچا لے تو مورد مذمت و ملامت نہیں ہو سکتا۔ یہی نوعیت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس اجازت کی جو حضرت سید الشہداء نے اصحاب کو اپنا ساتھ چھوڑ کر چلے

جانے کے متعلق دے رہے تھے - جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ چلے جاتے تو گنہگار نہ سمجھے جاتے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے قیام اور قربانی سے جو مرتبہ انھیں حاصل ہوا اس کا حصول اس صورت میں ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

۳ - جان کے جانے سے کوئی خاص مذہبی فائدہ متزنظر نہ ہو لیکن احترام مذہب دعوت دیتا ہو کہ سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر کردے اور اصول پر قائم رہے اور اس کی ذات کے ساتھ آئندہ کوئی مذہبی مفادات وابستہ بھی نہ ہوں جو اس کے جان دینے سے تلف ہوتے ہوں تو ایسے مقام پر تقیہ جائز و مباح ہو سکتا ہے ۔یعنی اختیار ہوگا کہ چاہے سچائی کے اصول کو سامنے رکھ کر قربانی کے لیے تیار ہو جائے اور چاہے تو اپنی جان کا تحفظ کرکے تقیہ کرے ۔یہ تقیہ جائز ہوگا۔ مگر اس کے ترک میں بھی گنہگار نہ ہوگا۔ وہ محل جہاں میثم تمار رشید ہجری اور بہت سے دیگر مردانِ راہِ خدا نے فضائل امیرالمومنینؑ کے اظہار و اعلان میں جانیں دینا گوارا کرلیں ۔ حالانکہ احادیث تقیہ ان کے سامنے تھے اور وہ اگر چاہتے تو تقیہ کرکے اپنی جان کی حفاظت کر لیتے۔ وہ بعض حالات میں اس کے قبل والی قسم میں اور بعض حالات میں اس قسم کے اندر داخل ہو سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ اس وقت کے حالات اور ان افراد کے خصوصیات کے صحیح تجزیہ پر موقوف ہے جس کے متعلق ہمیں اب کوئی حدِ فاصل کھینچنا اکثر دشوار معلوم ہوگا۔

۴ - جان دینے پر کوئی مذہبی فائدہ مترتب نہیں ہے صرف احترام مذاہب اور سچائی کا ولولہ خطرہ کی طرف قدم بڑھانے کی دعوت دے

رہا ہے۔ مگر جان کی حفاظت کے ساتھ امکان ہے کہ انسان کچھ مذہبی خدمات انجام دے سکے گا۔ اب اگر اس موقع پر باوجود ناگواری طبع صرف آئندہ کی مذہبی زندگی کے تحفظ کی خاطر جان بچالی جائے تو یہ راجح و مستحسن اور شرعی اصطلاح میں مستحب سمجھا جائے گا۔

اب یہ حکم شخصیتوں اور ان کے قوائے عمل کے لحاظ سے بھی مختلف ہو سکتا ہے، جیسے ایک ہی وقت میں یاسر، ان کی زوجہ سمیہ اور ان کے فرزند عمار دست کفار میں گرفتار ہوتے ہیں۔ یاسر اور سمیہ اپنی عمر پوری کر چکے ہیں۔ آئندہ زندگی میں کسی مذہبی کارنامہ کے انجام دینے کا ولولہ نہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے تو وہ اپنے جذبات ایمانی کے خلاف ایک حرف کہنا گوارا نہیں کرتے۔ شہید کر ڈالے جاتے ہیں۔ عمار ابھی نوجوان ہیں مستقبل کی زندگی سامنے ہے۔ آئندہ مذہب کی راہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے کا حوصلہ ہے۔ یہ مشرکین کے منشاء کے مطابق کچھ الفاظ زبان پر جاری کر کے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔ آیت ان کی تائید میں نازل ہوتی ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان۔ پیغمبرؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان عادوا لك فعد: "اگر ایسا اتفاق ہو تو پھر تم یہی عمل اختیار کرنا"۔ لیکن یاسر اور سمیہ کے لیے بھی کوئی لفظ مذمت کے لیے وارد نہیں ہوتا اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ یاسر اور سمیہ کے لیے تقیہ صرف جائز و مباح تھا اور عمار کے لیے راجح و مستحب تھا۔ وہ تیسری قسم کے حکم میں داخل تھے اور یہ چوتھی قسم میں مندرج تھے۔

۵۔ جان دینے پر کوئی اہم مذہبی مقصد مرتب نہیں ہے۔ اور حفاظت زندگی کے ساتھ کچھ اہم مقاصد دینیہ کی تکمیل ہے جس کا زندگی کی بقا پر انحصار ہے۔

ایسی صورت میں تقیہ واجب ہوگا- اور اس کا ترک حرام اور باعث مواخذہ اخروی ہوگا-

ائمہ اہل بیت علیہم السلام اپنی زندگی میں جس حد تک محتاط رہے ہیں اور جس حد تک انھوں نے حالاتِ وقت کے مطابق بسر کر کے اپنی زندگی کے تحفظ کی کوشش کی ہے جس کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ حکومت جور کو بھی اپنے ہی قوانین کے مطابق ان کے خلاف کبھی کوئی الزام نہیں مل سکا جس سے وہ ان کو مورد ستم بنانے کی سند بناتی- اس لیے جب بھی ان کو مقید کیا گیا صرف "اندیشۂ نقض امن" کہہ کر جس کے ساتھ کسی الزام کا ثبوت نہیں ہوا کرتا- اور اگر جان لی ہے تو پوشیدہ حربۂ زہر سے جس کی ذمہ داری کبھی حکومت اپنے سر لینے پر تیار نہیں ہوئی- اس سے ظاہر ہے کہ ان کا کوئی عمل ایسا نہ تھا جو حکومت کے قانون سے قابل مواخذہ قرار پا سکتا

یہ زمانہ کے حالات سے مطابق زندگی اس قسم تقیہ کے تحت میں داخل تھی- اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر ائمہ معصومین علیہم السلام میں سے سب ہی منصب امامت پر آنے کے بعد ہی حکومت وقت کے خلاف علانیہ علم مخالفت بلند کر کے شہید ہو جاتے تو آج امن و شرع اسلامی کی حقیقی تصویر جس حد تک ہم تک پہنچ سکی وہ قطعاً پہنچنا ممکن نہ ہوتی.

مذکورہ اقسام اور ان کے تحت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے وہ تضاد قطعاً دور ہو جاتا ہے جس کا حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے کارنامہ جہادِ کربلا اور دوسرے ائمہ معصومین ؑ کی مستقل خاموشی کی بہ سبب کے درمیان توہم ہوتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام سیرتیں ایک متحد قانون و نظام کے تحت میں مندرج ہیں- جو شریعت اسلام کی حکیمانہ رفعت کا تقاضا ہے اور وہ اس سے یکسر مو بھی منحرف نہیں سمجھی جا سکتیں•

تدوینِ حدیث

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

"علم حدیث کی تدوین" ایک گرانقدر اور بسیط موضوع ہے جس کے لیے محدود صفحات کی تصنیف یا محدود وقت کی تقریر کسی طرح تمام شعبوں پر حاوی نہیں ہو سکتی مسلمان یعنی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقہ بگوش اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے عقیدت مند یقیناً قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ سمجھتے رہے ہیں اور اسی لیے انھوں نے بلاتفریق مسلک و مشرب ہمیشہ قرآن کے بعد حدیث کی خدمت ضروری سمجھی اور اس میں پوری سعی و کوشش صرف کی ہے۔

آپس کے ذاتی نظریوں کے اختلاف سے قطع نظر کرکے جب مخلوط و مشترک اسلامی خدمات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدمت سنت اور حدیث کی تدوین کا فرض وہ ہے جس کو دونوں ہی فریق نے اپنے اپنے معیار نظر کے مطابق بڑی بلند آہنگی اور عرق ریزی سے انجام دیا ہے۔ اور اس میں وہ اپنا خون پسینہ ایک کرتے رہے ہیں اور اسی لیے اس

موضوع کو اگر مشترک اسلامی حیثیت سے تحریر کیا جائے تو وہ یقیناً ایک بہت بڑی مبسوط کتاب کا طالب ہے جس کے لیے مسلم اکادمی کے متعدد جلسے بھی کافی نہیں ہوسکتے پھر بھلا مجھ میں کہاں ہمت تھی کہ اس موضوع پر تقریر کا مسلم اکادمی کے جلسہ میں وعدہ کرلیتا۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس موضوع کا ایک شعبہ یعنی "علم حدیث کی تدوین" کے متعلق علمائے اہلسنت و جماعت نے ہر دور و زمانہ میں کیا خدمتیں انجام دی ہیں میرے محترم کرم فرما عالیجناب مولانا عنایت اللہ صاحب افسر مدرس مدرسہ عالیہ نظامیہ فرنگی محل لکھنؤ نہایت بسط و تشریح اور توضیح و تفصیل کے ساتھ بیان فرماچکے ہیں جس سے زیادہ نہ میں بیان کرسکتا ہوں اور نہ ضرورت باقی ہے۔ اس لیے میرے متعلق جو فرض رہ جاتا ہے وہ صرف دوسرے شعبہ کے متعلق کہ "تدوین حدیث" میں شیعہ فرقہ نے کیا خدمات انجام دیں ۔ اور تدوین حدیث کی تاریخ اس فرقہ کے روایات کے لحاظ سے کیا ہے اور کس کس دور میں اس میں کیا کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

واضح ہو کہ یہ موضوع کوئی اختلافی یا مباحثانہ نہیں ہے تاکہ میں بیان واقعات میں کسی فریق مقابل کے کتب کا پابند ہوں اور انہیں ماخذ بنانے پر مجبور بلکہ یہ ایک تاریخی اور واقعاتی تبصرہ ہے۔ اور اس میں مشترک اسلامی کتب کے علاوہ زیادہ تر جن میں خود فرقۂ شیعہ کے کتب رجال و روایت بھی داخل ہیں۔

حدیث کے معنی

ہماری اصطلاح میں وہ روایت جس میں قولِ معصوم، فعلِ معصوم یا تقریرِ

معصوم کی نقل کی گئی ہو حدیث کہلاتی ہے۔ قول و فعل کے معنی ظاہر ہیں تقریر کے معنی ہیں کسی دوسرے کے کسی قول یا فعل پر جو معصوم کے سامنے ہو معصوم کا راضی رہنا اور رضا مندانہ سکوت کرنا۔

یہ بیشک حجت اور واجب العمل ہے۔

ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ - ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا - اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

قرآن مجید کے بعد حدیث کے استناد و اعتبار کے قوی دلائل ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا ابعدی قرآن مجید کے ساتھ تمسک بعترت کا حکم حدیث کے استناد و اعتبار کا مکمل ثبوت ہے۔

بےشک حدیث اگر متواتر اور قطعی طریقے سے مثل قرآن مجید کے پہنچے تو وہ بھی قطعی طور پر واجب العمل ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ احادیث مثل قرآن مجید کے تواتر کی حد تک پہنچ نہ سکے اور اکثر بطریق احاد پہنچے جن میں اگر معنوی یا اجمالی حیثیت سے تواتر ہے بھی تو لفظی حیثیت سے نہیں ہے اور اکثر ایسے ہیں کہ جن میں اس قسم کا تواتر بھی نہیں ہے اس لیے کسی خاص حدیث پر عمل اس درجہ پر نہیں سمجھا جا سکتا جس درجہ پر قرآن مجید کے اوپر عمل اور نہ کسی حدیث

کی مخالفت اس طرح کفر سمجھی جا سکتی ہے جس طرح قرآنِ مجید کی مخالفت۔

حدیث کے مضمون کا انکار اگر اس مضمون کو حدیث رسول اللہ تسلیم کرتے ہوئے ہو تو یقیناً موجب کفر ہے لیکن اگر کسی معتبر سے معتبر حدیث کو قول آنحضرتؐ تسلیم ہی نہ کیا گیا ہو تو وہ انکار کتنا ہی غلط اور مکروہ کیوں نہ ہو لیکن موجب کفر نہیں سمجھا جا سکتا۔ برخلاف قرآنِ مجید کے کہ اسکی کسی آیت کا انکار اس طرح سے کرنا بھی موجب کفر ہے کہ وہ قولِ خدا ہے اور میں تسلیم نہیں کرتا اور اس طرح سے بھی کہ وہ قولِ خدا نہیں ہے لہذا میں تسلیم نہیں کرتا۔

بے شک دلالت یعنی معنی الفاظ کے تعیین میں اختلاف، انکار وغیرہ دونوں میں کھلا ہوا ہے اور وہی بڑے سے بڑے خلاف قرآن و حدیث خیالات کو کفر کی زد سے علیٰحدہ کر دینے کا ذمہ دار ہے۔

بہرحال سند کے اعتبار سے قرآن و حدیث کے اس تفرقہ نے ان میں باعتبار احکام عظیم تفرقہ پیدا کر دیا ہے ورنہ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم کی روشنی میں دیکھا جائے تو قرآن و حدیث ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں اور ان میں سوائے تقدم و تاخر کے کوئی تفرقہ نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں نے بھی اسی حفظ مراتب کے لحاظ کے ساتھ قرآن و حدیث کے متعلق خدمت انجام دی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ میں جیسا کہ مولانا عنایت اللہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے خود قرآن موجودہ حالت میں یعنی مدون نہ تھا تو حدیث کا کیا ذکر۔

حضرت کی وفات کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت کا احساس کیا گیا وہ قرآن مجید کی جمع وتالیف اور ترتیب و تدوین تھی جسکو ذمہ داراسلامی ہاتھوں نے ہر تقدم سے مقدم کام پر مقدم کیا اور اس خدمت کو انجام دیا۔

قرآن کے بعد حدیث کا درجہ تھا۔ حدیث کی جمع وتالیف کے متعلق صحابہ کرام میں باہم اختلاف رائے ہو گیا۔ اس اختلاف اور اس کے منشاء کو جناب مولانا عنایت اللہ صاحب کے الفاظ میں تحریر کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں۔ یہ نے تحریر فرمایا ہے کہ صحابہ مذہب میں بدعت سے اس قدر بچتے تھے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں بدعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ختنہ کی دعوت میں بلا دے کو حضرت ابو ایوب انصاری نے فرمایا کہ حضور انور کے زمانے میں تو ایسی تقریبوں میں بلاوا نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کی تدوین پر ایک گروہ صحابہ کو سخت اعتراض تھا۔ روایت حدیث پر سزا تک کی نوبت آئی۔ تدوین احادیث میں تو ایک یہی خرابی کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن جو اس وقت تک موجودہ طور پر مکتوب نہیں تھا اور کلام حضرت رسالت پناہی مخلوط نہ ہو جائیں۔ علاوہ اس کے حضور انورؐ سے اس کی ممانعت بھی مروی ہوئی تھی جیسا کہ مسند امام احمد بن حنبل میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ لوگ بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے کہ ناگاہ حضور انورؐ باہر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا کر رہے ہو تو لوگوں نے عرض کیا کہ جو کچھ حضورؐ سے سنتے ہیں اسکو لکھتے ہیں حضورؐ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور لکھا ہوا مکتوب ضائع کر دیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشہور ہے کہ اکثار

حدیث پر سزا دی ہے۔ حضرت عمر کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کو والی مقرر فرماتے تو منجملہ دوسرے نصائح کے یہ بھی اسکو نصیحت فرماتے کہ دیکھو جن لوگوں کے پاس جا رہے ہو وہ قرآن پڑھنے میں مصروف ہیں اور شب و روز اپنا وقت تلاوتِ قرآن میں صرف کرتے ہیں ان سے زیادہ حدیثیں بیان کرکے ان کے ذہنوں کو تشویش میں نہ ڈالنا تو جب روایت حدیث کی یہ صورت ہو تو تدوین و کتابتِ حدیث کی کیا صورت ہو سکتی ہے!

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا تھا کہ احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ صحابہ سے اس بارہ میں مشورہ کیا۔ تقریباً سب اصحاب حضرت رسالتمآب نے اس کو پسند کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مہینہ بھر سوچتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے سب کو جمع کرکے فرمایا۔ میرا ارادہ تھا جو تم کو معلوم ہے مگر مجھ کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کتاب اللہ کو بالکل ترک کر دو اور یہود و نصاریٰ کے مانند صرف احادیث پر اپنی توجہ مبذول کر دو یعنی اس کا نتیجہ یہ ہو جائے کہ قرآن بھی توریت و انجیل کی طرح دلوں سے بھولا رہے اور تحریف کا شکار ہو جائے۔"

پھر تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرت عمر ہی کے زمانہ میں جمع حدیث کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی اور تمام صحابہ اسکو جمع کر دینے کی رائے ظاہر کر چکے تھے مگر قرآن کے ساتھ بے توجہی کے خوف نے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبوراً باز

رکھا تھا اور اس کے بعد ہم کو باوجود تلاش بسیار کبھی صحابہ کا جمع کی جانب توجہ کرنا نظر نہیں پڑا۔ اگر کہیں احادیث کو بھی قرآن کی طرح خلفائے راشدین نے مدون کر دیا ہوتا تو یقین کیجئے کہ بہت کچھ کیا بلکہ قرآن کی طرح وہ بھی دست تصرف سے محفوظ ہو جاتے اور باہمی مسلمانوں میں کثیر فرقہ بندیوں کی نائرہ زدگی تمام ہو جاتی۔ آج احادیث میں جو جو شبہات اور شکوک اسناد اور الفاظ کے اختلاف کی وجہ سے پیش آتے ہیں وہ انکی تدوین و جمع کے بعد پیش نہیں آسکتے تھے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت کر رہی تھی۔" انتھی کلامہ

برعکس اس کے جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے تمام صحابہ جن میں حضرت علیؓ بھی تھے ان کو اس نظریہ سے اتفاق نہیں تھا۔

حضرت علیؓ کا مستقل کلام ہے کہ:۔

قیدوا العلم فی	علمی مطالب قلبند کرو اور قید
الکتاب	تحریر میں لاؤ۔

چنانچہ جہاں تک نظر دوڑائی جاتی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی تصنیف حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی تھی ہے جو آپ نے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے فرمائی تھی اس کا پتہ صحیح امام بخاری سے چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الفرائض باب اثم من تبرأ من موالیہ

حدثنا قتیبة	ابراہیم تیمی کی روایت ہے اپنے
ابن سعید قال	والد سے کہ حضرت علیؓ نے فرماتے

حدثنا جرير عن الاعمش
حدثنا ابراهيم التيمي عن ابيه
قال قال علي ما عندنا
كتاب نقرأه الا كتاب
الله غير هذه الصحيفة قال
فاخرجها فاذا فيها اشياء
من الجراحات واسنان الابل
قال وفيها المدينة
حرم ما بين عير
الى ثور فمن احدث
فيها حدثا او آوى
محدثا فعليه لعنة الله
والملئكة والناس
اجمعين لا يقبل منه
يوم القيمة صرف
ولا عدل وذمة
المسلمين واحدة يسعى بها
ادناهم فمن اخفر
مسلما فعليه لعنة الله

تھے ہمارے پاس قرآن کے سوا
کوئی کتاب نہیں ہے جسے ہم
پڑھتے ہوں سوائے اس صحیفہ کے
حضرت نے اس صحیفہ کو باہر نکالا
تو دیکھا گیا کہ اس میں کچھ احکام
مختلف اقسام قصاص اور اونٹوں
کے متعلق ہیں اور اسی میں یہ
حدیث ہے کہ مدینہ حرم ہے مقام
عیر سے لیکر مقام ثور تک، جو
شخص وہاں بدعت ایجاد کرے
یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر
خدا، ملائکہ اور تمام خلق کی لعنت
ہے۔ اس سے کوئی سفارش
کی معاوضہ قبول نہ کیا جائیگا
اور مسلمانوں کی ذمہ داری سب
کی یکساں ہے جس کو معمولی سے
معمولی شخص ان میں کا پورا کریگا
اور جو شخص کسی مسلمان سے غداری
کرے اس پر خدا ملائکہ اور

والملئکۃ والناس اجمعین	تمام خلق کی لعنت ہو، روز
لا یقبل منہ یوم القیامۃ	قیامت اس سے کوئی معاوضہ
صرف ولا عدل	اور سفارش قبول نہ ہوگی۔"

صحیح مسلم جلد اوّل کتاب الحج باب فضل المدینہ میں بھی پانچ طریقوں سے اس کا تذکرہ موجود ہے۔ دوسری صدی ہجری تک اس کتاب کا وجود اہل بیتؑ کے پاس ثابت ہے جس کا پتہ محمد ابن الحسن الصفار کی بصائر الدرجات والی روایت سے چلتا ہے جو عبد الملک سے منقول ہے۔ اس میں یہ ہے کہ:۔

دعا ابو جعفر بکتاب	"امام محمد باقرؑ نے جناب امیرؑ کی
علی فجاء بہ جعفر مثل	کتاب منگوائی۔ امام جعفر صادقؑ
فخذ الرجل مطویا فاذا	اس کتاب کو لپٹا ہوا لائے
فیہ ان النساء لیس لھن	اس میں یہ تھا کہ عورتوں کو اپنے
من عقار الرجل اذا توفی	شوہر کی غیر منقولہ جائداد سے کچھ
عنھن شیئ فقال ابو جعفر	نہیں ملیگا۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا
ھذا واللہ خط علی بیدہ	کہ یہ خدا کی قسم جناب امیرؑ کے قلم کی
املاء رسول اللہ الخ	تحریر ہے اور جناب رسالتمآبؐ
وسائل الشیعہ	کی لکھوائی ہوئی حدیثیں ہیں۔"

حضرت ابو رافع جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے با اختصاص غلام تھے۔ نجاشی نے فہرست اسماء مصنفین شیعہ میں لکھا ہے کہ:۔

لابی رافع مولیٰ رسول اللہ	ابو رافع کی تصنیف سے کتاب
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم	سُنن و احکام و قضایا
کتاب السنن والاحکام والقضایا۔	تھی۔"

اس کے بعد انھوں نے اس کتاب کے ابواب کو ترتیب وار درج کیا ہے صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ اور سب کے آخر میں قضایا۔ ابو رافع مکہ معظمہ میں ہجرت کے قبل اسلام لائے تھے اور جب آنحضرتؐ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے تو یہ مکہ میں رہ گئے تھے۔ جنگِ بدر کے بعد آکر حضرت سے ملحق ہوئے اور سب سے پہلے جنگِ اُحد میں شرکت کی۔ پھر ہر لڑائی میں حضرتؐ کے ہمراہ رکاب رہے۔

رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد باوفا غلام نے رسول کی ڈیوڑھی چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور برابر اہل بیتؑ کی صحبت میں رہا۔ جناب امیرؑ کے مخصوصین میں شمار ہوتے اور عہدِ فتنہ کی تمام لڑائیوں میں آپکے ہمراہ شرکت کی۔ کوفہ کے بیت المال کا خزانہ آپ کے متعلق ہوا اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔

تاریخ کے لحاظ سے یہ سب سے پہلی کتاب تھی جس میں ابواب کی ترتیب کے ساتھ احادیث درج کیے گئے تھے۔ حضرت ابو عبد اللہ سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری بھی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنھوں نے حدیث کی تدوین میں حصہ لیا۔ ان دونوں بزرگوں کی تصنیف کا تذکرہ ابن شہر آشوب نے معالم العلماء میں اور شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی و شیخ ابو العباس نجاشی نے اپنی اپنی کتاب فہرست مصنفین میں کتاب سلمان اور کتاب ابوذر کے نام سے درج کیا ہے۔ اور یہ بھی تعلیم اسلامی

تصانیف ہیں جن کے قبل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ہے افسوس ہے کہ یہ کتابیں اسی طرح ناپید ہوگئی ہیں جس طرح وہ احادیث کا غیر مدون مجموعہ جو عبداللہ ابن عمرو ابن العاص نے جمع کیا تھا۔ اور جس کا تذکرہ مولانا عنایت اللہ صاحب اپنے مضمون میں فرما چکے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ تابعین کا ہے جن میں سے ابو رافع کے دونوں بیٹے علی ابن ابی رافع اور عبید اللہ ابن ابی رافع ہیں۔ یہ دونوں بزرگ جناب امیرؑ کے کاتب یعنی منشی دفتر اور اول الذکر خازنِ بیت المال تھے۔

علی بن ابی رافع نے ایک کتاب لکھی جس میں وضو، صلوٰۃ اور تمام ابواب میں ترتیب کے ساتھ حضرت امیرؑ کے اسناد سے احادیث کو جمع کیا۔ یہ کتاب بھی ساداتِ اہل بیتؑ کے پاس دوسری صدی تک موجود تھی اور وہ اس کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ موسیٰ بن عبد اللہ ابن حسن کا بیان ہے کہ ایک شخص نے میرے والد سے تشہد کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے کہا "لاؤ ذرا ابن ابی رافع کی کتاب" جب وہ کتاب لائی گئی تو انھوں نے وہ مقام نکال کر سائل کو لکھوا دیا۔

اصبغ ابن نباتہ مجاشعی، یہ بھی جناب امیرؑ کے مخصوصین میں سے تھے انھوں نے حضرت کا وہ طولانی عہد مالک اشترؑ کے نام جو نہج البلاغہ حصہ کتب میں موجود ہے نقل کیا۔ اور اسے قلمبند کر لیا۔ نیز حضرت کی طولانی وصیت جو امام حسنؑ کے نام تھی وہ بھی انھی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچ سکی۔ سلیم ابن قیس ہلالی، ان کی بھی کتاب مشہور و معروف ہے اس میں انھوں نے حضرت

علی، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار اور بہت سے صحابہ سے روایات نقل کیے ہیں۔ اس کتاب کو علماء نے بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے مشہور متکلم فقیہ شیخ محمد ابن محمد نعمان معروف بہ شیخ مفید نے اپنی کتاب الغیبۃ میں سلیم ابن قیس کی کتاب کی ایک حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:۔

لیس بین جمیع الشیعۃ ممن حمل العلم ورواہ عن الائمۃ خلاف فی ان کتاب سلیم ابن قیس الھلالی اصل من کتب الاصول التی رواھا اھل العلم وحملۃ حدیث اھل البیت واقدمھا	تمام فرق شیعہ میں ان لوگوں میں کہ جنہوں نے علوم ائمہ کا تحمل کیا ہے اس امر میں اختلاف نہیں کہ کتاب سلیم بن قیس ہلالی ایک معتبر کتاب ہے۔ ان قدیم ترین کتابوں میں جن کو حاملان حدیث اہلبیتؑ نے روایت کیا ہے۔

ابن ندیم محمد ابن اسحاق نے "کتاب الفہرست" میں بھی اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔

میثم ابن یحیی ابو صالح تمار، امیر المومنین کے خواص اصحاب میں سے، ان کی بھی کتاب حدیث میں بڑی بلند پایہ تھی جس سے شیخ ابو جعفر طوسی اور ابو عمرو کشی اور طبری مصنف بشارۃ المصطفیٰ نے اکثر احادیث نقل کیے ہیں۔

میثم تمار ۶۰ھ میں ابن زیاد کے حکم سے کوفہ میں قتل ہوئے۔

محمد ابن قیس بجلی نے بھی ایک کتاب امیر المومنینؑ سے مرویہ احادیث کی تحریر کی جو بقول شیخ ابو جعفر طوسیؒ امام محمد باقر علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئی۔

اور آپ نے فرمایا۔

هذا اقول علی ابن ابیطالب علیہ السلام — یہ بے شک حضرت علیؑ کے اقوال ہیں۔

اس کتاب کی ابتدا یہ تھی کان یقول اذا صلی قال فی اول الصلوٰۃ

یعنی ابن مرۃ اور عبید اللہ بن حر جعفی کی بھی کتابیں امیرالمومنین سے روایات کی کتب رجال میں مذکور ہیں اور ربیعہ ابن سمیع تابعین میں سے تھے۔ ان کی کتاب "زکوٰۃ الانعام" کے متعلق تھی۔ ان کا نجاشی نے طبقۂ اولیٰ میں مصنفین کے تذکرہ کیا ہے۔ حارث ابن اعور ہمدانی بھی مشہور صاحب جناب امیرؑ ہیں جنہوں نے ایک کتاب میں وہ سوالات جمع کیے ہیں جو کسی یہودی نے جناب امیرؑ سے کیے تھے اور حضرت نے ان کا جواب دیا تھا۔

یہ لوگ تمام وہ ہیں جو طبقہ متقدمین تابعین میں محسوب ہیں جن میں نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کس کی تصنیف کا زمانہ مقدم ہے اور کس کا موخر۔

اس زمانہ میں یہ وہ کتابیں ہیں جن کے علاوہ کوئی دوسرے مصنفات علم حدیث میں تمام عالم اسلامی کے اندر جستجو سے بھی دستیاب نہیں ہوتے۔

اس کے بعد کے طبقہ یعنی پہلی صدی کے اواخر میں تو تدوین حدیث کی ضرورت کا احساس عام طور سے ہو گیا تھا چنانچہ خلیفہ صالح بنی امیہ عمر ابن عبدالعزیز نے حدود سلطنت میں جو کیا ائمہ موجود تھے ان کو لکھا کہ سنن حضرت رسالت کو لکھ کر ایک جگہ جمع کر دیں۔ یہ تذکرہ مولانا عنایت اللہ صاحب نے فرمایا ہے اور لکھا ہے کہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی یہ تدوین حدیث کی اول کوشش تھی جو عمر ابن عبدالعزیز کے حصہ میں آئی۔

اس زمانہ میں اہل بیت میں سے امام محمد باقر علیہ السلام کا دریائے علم موجیں مار رہا تھا آپکی علمی موشگافیاں وہ تھیں کہ تمام عالم اسلامی نے متفق طور سے باقر العلم تسلیم کیا۔ علامہ نووی تحریر کرتے ہیں۔ المعروف بالباقر لانہ بقر العلم ای شقہ وفتحا فعرف اصلہ وتمکن فیہ آپ کے اصحاب میں بڑے بڑے حافظان حدیث تھے۔ جیسے جابر ابن یزید جعفی جن کے متعلق صحیح مسلم[1] میں ہے کہ وہ پچاس ہزار حدیثوں کی روایت کرتے تھے جو سب امام محمد باقر علیہ السلام کے طریق سے حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک منتہی ہوتی تھیں۔

اور ابان بن تغلب جنھوں نے امام زین العابدینؑ امام محمد باقرؑ امام جعفر صادقؑ تین بزرگواروں کے عصر کا ادراک کیا اور خاص امام جعفر صادقؑ سے تیس ہزار حدیثوں کی روایت کی۔ صحیح مسلم اور سنن اربعہ میں انکی روایت سے احتجاج کیا ہے اور شیخ الاسلام حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کی وثاقت واعتبار کی گواہی دیکر ان کے تشیع کے متعلق یہ کہہ کر معذرت کی ہے کہ ان التشیع فی التابعین وتابعیہم کثیر مع التدین والورع والصدق فلو رد حدیث ھؤلاء لذھب جملۃ من الآثار النبویۃ[2]۔

ابان کی ایک کتاب بھی حدیث میں تھی جو معتبر اصول حدیث سے تسلیم کی جاتی تھی۔ اسی طرح ابو حمزہ ثمالی ثابت ابن دینار، ان کی کتاب النوادر، کتاب

---

[1] صحیح مسلم مطبوعہ نول کشور۔ ج ۱ ص ۱۵

[2] تشیع تابعین اور تابع تابعین میں بہت کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ایسے افراد میں جو امانت، دیانت اور ورع رکھتے ہیں اگر ان کی حدیثوں کو رد کر دیا جائے تو بہت سے آثار رسالت مآب کے فنا ہو جائیں گے۔

الزہد، رسالہ حقوق ہیں بہت سے احادیث کا ذخیرہ تھا۔ حافظ ترمذی کی کتاب صحیح میں ان سے روایت موجود ہے علماء رجال نے بھی انکا تذکرہ کیا ہے۔

زرارہ ابن اعین کے متعلق تو ثابت ہے کہ ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ جب وہ امام جعفر صادقؑ کے پاس آتے تھے قلم، دوات اور کتاب اپنے ساتھ لاتے تھے اور جو کوئی مسئلہ پیش آتا اور امام اسکے متعلق حکم رسالت مآبؐ بیان فرماتے اسکو وہ لکھ لیتے تھے۔ کبھی خود سوال کرتے تھے اور اس کا جواب حاصل کرتے تھے اور اس طرح بڑا ذخیرہ قلمبند صورت میں احادیث کا جمع کر لیا۔

زرارہ، محمد ابن مسلم، برید عجلی بھی ایسے لوگ تھے جن کے متعلق امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ :-

"لولا ھؤلاء لانقطعت احادیث ابی"	اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو میرے والد بزرگوار کے فرمودہ احادیث ختم ہو گئے ہوتے

برید عجلی کی بھی ایک کتاب حدیث میں تھی جسے ان سے رواۃ محدثین نے نقل کیا۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں اہل بیت کے فیوض علمیہ سے بہرہ مند ہونے والے بڑی کثرت سے ہو گئے تھے۔

شیخ ابو علی طبرسی نے اعلام الوریٰ میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے امام جعفر بن محمد صادقؑ سے بلا واسطہ نقل احادیث کیا چار ہزار آدمی تھے۔ حافظ ابن عقدہ جو فریقین کے کتب رجال میں بڑی مدح و ثنا کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں انھوں نے ایک مستقل کتاب لکھی کتاب الرجال الذین رووا عن الصادق اور شیخ طوسی نے اکثر کا ان میں سے اپنی کتاب رجال میں ذکر کیا ہے۔

وہ کتابیں جو اس وقت سے لے کر امام حسن عسکری کے عہد تک یعنی ایک صدی کے ائمہ علم حدیث میں تصنیف ہوئیں چھ ہزار چھ سو کتابیں تھیں جنکی شیخ حر عاملی نے خاتمہ وسائل الشیعہ کے فائدہ اربعہ میں تصریح کی ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ علم حدیث ہر زمانہ میں ایسے لوگوں کی عصبیت میں گرفتار رہا جو غلط واقعات بناتے اور بے اصل حدیثیں تراش کر کسی بڑی ہستی کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔

جب حضرت رسولِ اکرمؐ کو فرمانا پڑا "ستکثر بعدی القالة فمن کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ مقعدہٗ من النار"[۱] تو دوسرے اماموں کا کیا تذکرہ؟

ائمہ اہل بیتؑ اور ان سے روایت کرنے والے دیانتدار محدثین کو بھی ان متقولین یعنی احادیث کی ساخت و ساز کرنے والوں سے بڑی شکایت تھی اور ائمہ اس کے متعلق اپنے اصحاب کو متنبہ کر دیتے تھے۔

مشکل یہ تھی کہ شیعیت کے نام لیوا افراد میں بعض غالی اور اماموں کے متعلق غلط عقیدہ رکھنے والے اشخاص پیدا ہو جاتے تھے جن سے ائمہ اور ان کے شیعہ خود برائت کرتے تھے لیکن وہ شیعیت کے نام کو پردہ قرار دے کر غلط احادیث کی نشر و اشاعت کرتے تھے۔

مغیرہ ابن سعید ایک شخص تھا جس کے متعلق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ المغیرۃ بن سعید دس فی کتب اصحاب ابی احادیث لم

---

[۱] میرے بعد غلط روایت کرنے والوں کی کثرت ہو گی تو جو شخص میری طرف کوئی غلط حدیث منسوب کریگا اسے اپنی جگہ جہنم میں بنانا چاہیے۔

یحدث بھا ابی فاتقوا اللہ ولا تقبلوا علینا ما خالف قول ربنا وسنۃ نبینا۔[1]

اسی طرح ابو الخطاب ایک شخص تھا غلاۃ میں سے جس پر امام نے لعنت بھی فرمائی تھی اوس نے طرح طرح کی غلط باتیں ایجاد کیں۔

اس صورت حال کے تدارک کی طرف خود ائمہ معصومین اور ان کے اصحاب مرضیین پورے طور سے متوجہ ہو گئے۔ ائمہ نے احادیث کے معیار بتانا شروع کیے اختلاف احادیث کی صورت میں مرجحات بتلائے اور صحیح وغیر صحیح میں تمیز کا طریقہ بتلایا۔ اصحاب نے یہ اہتمام شروع کیا کہ زیادہ تر امام سے خود جا کر احادیث سننے لگے جتنی مستند قلمی کتابیں حدیث کی تھیں ان کو جہاں تک موقع ملتا امام کو دکھلاتے اور ان سے تصدیق لیتے کہ اس میں سب روایتیں درست ہیں جیسے عبید اللہ ابن علی حلبی کی کتاب جو امام جعفر صادق کے سامنے پیش ہوئی۔ اور یونس ابن عبد الرحمٰن اور فضل ابن شاذان کی کتابیں جو امام حسن عسکری علیہ السلام کے سامنے پیش کی گئیں یا شروع دور کی وہ کتابیں جو خوف معاندین سے راویوں نے زمین کے اندر چھپا دی تھیں بعد والے اصحاب نے امام کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق لی اور آپ نے فرمایا حدثوا بھا فانھا حق" ان کے احادیث کی روایت کرو یہ سب درست ہیں۔"

اس چھان بین کے بعد قدما محدثین نے ان تمام کتابوں میں سے جو تصنیف ہوئی تھیں چار سو کتابیں چار سو رواۃ کی منتخب کر لیں جن کو اپنے علم و عمل کا دار و مدار قرار دیا وہ

---

[1] مغیرہ ابن سعید نے میرے والد بزرگوار کے اصحاب کی کتابوں میں کچھ حدیثیں خفیہ طور سے بڑھا دی ہیں جو میرے والد نے بیان نہیں کی تھیں پس خدا سے ڈرو اور ہماری نسبت قبول نہ کرو ایسی حدیثیں جو قول خدا اور سنت رسول کے خلاف ہوں۔

کتابیں "اصول اربعمأۃ" کے نام سے مشہور تھیں جو بعد کے زمانہ میں بڑے سے جوامع حدیث کی تصنیف کا سرمایہ قرار پائیں۔

ان کتابوں میں سے جن کا صدر اول سے لے کر اس وقت تک تذکرہ تھا موجودہ زمانہ میں صرف کتاب سلیم ابن قیس ہلالی اور بعض "اصول اربعمأۃ" کا وجود باقی ہے جن کو محدث میرزا حسین نوری مصنف مستدرک الوسائل نے بڑے قدیم نسخوں سے نقل کر کے حاصل کیا تھا اور اپنی کتاب مستدرک کا ماخذ بنایا۔ ان سے پھر آیۃ اللہ آقا سید حسن صدر کاظمینی دام ظلہ مقیم کاظمین اور آقا میرزا محمد طہرانی مقیم سامرہ نے ان کی نقل حاصل کی اور ان میں سے بعض کی ہم نے بھی نجف اشرف میں نقل حاصل کر لی۔

ائمہ کا دور گزر گیا غیبت کا زمانہ آیا۔ اب دشواریاں زیادہ پیدا ہو گئی تھیں چھوٹی چھوٹی کتابیں جو سیکڑوں کی تعداد میں تھیں ان سب میں اگرچہ احادیث کا تمام ذخیرہ موجود تھا لیکن کثرت کتب کا لازمی نتیجہ انتشار ہے اصل میں ضیاع و تلف کا اندیشہ یقینی۔ اسی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ تمام متفرق کتابیں ایک یا چند بڑی کتابوں میں مجتمع ہو جائیں۔ سب سے پہلے ثقۃ الاسلام ابو جعفر محمد ابن یعقوب کلینی تھے جنھوں نے چوتھی صدی کے اوائل میں اس خدمت کو انجام دیا اور بیس برس کی مسلسل جفاکشی اور محنت میں کتاب کافی کی تصنیف کی۔ دیباچہ کتاب میں سبب تالیف تحریر فرماتے ہوئے صاف ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب میں صحیح اخبار جمع کیے جائیں گے جو تمام علوم و معارف دینیہ کو شامل اور ہر حیثیت سے کافی ہوں۔ کتاب کافی کا نام بھی انھی الفاظ کی بنا پر "کافی" قرار پایا ہے اور چونکہ اس میں اصول و عقائد کے احادیث کا

ایک حصہ مستقل اور فروع یعنی مسائل شرعیہ کا حصہ مستقل تھا اس لیے پہلا حصہ "اصول کافی" اور دوسرا حصہ "فروع کافی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام شیعی جوامع حدیث میں کافی کا درجہ سب سے مقدم مانا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی ہر ہر حدیث صحیح السند اور قطعی الورود ہے۔ ہم حدیث کی کسی کتاب کو قرآن مجید کی طرح معصوم اور جرح و تعدیل کے میزان اعتبار سے بلند نہیں سمجھتے ہیں۔ کافی کا تقدم و شرف صرف اس اعتبار سے ہے کہ اس میں نقل روایات میں انتہائی ضبط و اتقان سے کام لیا گیا ہے۔ سندیں پوری نقل کی گئی ہیں۔ روایات کے ٹکڑے نہیں کر دیے گئے ہیں۔ روایات میں اپنے تفسیری نوٹ نہیں دے دیئے ہیں جو اصل الفاظ حدیث کے ساتھ مشتبہ ہو جائیں۔ پوری سندیں نقل کر دینے کا منشا ہی یہ ہے کہ مصنف نے اپنے اوپر سے ذمہ داری ہٹا لی ہے اور ان رواۃ کے حالات و اوصاف کو جانچ لینے کا موقع دیا ہے۔

یہ خیال کہ یہ کتاب امام عصر حضرت امام ثانی عشر کے پاس پیش ہوئی اور حضرت نے فرمایا کافٍ لشیعتنا ایک ایسی غلط حکایت ہے جس کا کوئی ثبوت کتب احادیث و رجال میں نہیں ہے چنانچہ محدث قمی نے کتاب کافی کے استناد و اعتبار کو انتہا درجہ تک پہنچاتے ہوئے تحریر کیا ہے :-

لیس غرضی من	میرا مقصد اس سے یہ نہیں
ذلک تصحیح الخبر الشائع	ہے کہ میں اس روایت کی

من ان هذا الكتاب عرض على الحجة عليه السلام فقال ان هذا كافٍ لشيعتنا فانه لا اصل له ولا اثر له في مولفات اصحابنا بل صرح بعدمه المحدث الاسترابادي الذي رام ان يجعل تمام احاديثه قطعية لما عنده من القرائن التي لاتنهض لذلك ومع ذلك صرح بانه لا اصل له.

صحت ثابت کروں جو عام طور سے مشہور ہے کہ یہ کتاب حضرت حجت کی خدمت میں پیش ہوئی اور حضرت نے فرمایا کہ "یہ کافی ہے ہمارے شیعوں کے لیے" کیونکہ یہ روایت بالکل بے اصل ہے بلکہ اس کا نام و نشان بھی ہمارے کتب امامیہ میں نہیں ہے بلکہ محدث استرآبادی نے بھی کہ جو کافی کی تمام احادیث کو بعض غیر مستند قرائن کی بنا پر قطعی ثابت کرنے میں کوشاں ہیں انھوں نے بھی اس روایت کے متعلق لکھ دیا ہے کہ اسکی کوئی اصل نہیں ہے۔

اس بنا پر ہم کافی کی حدیث بھی آنکھ بند کرکے قبول نہیں کر لیتے بلکہ استنباط و اجتہاد کے موقع پر کافی کی حدیث کی اسی طرح جانچ کرتے ہیں جس طرح دوسرے کتب حدیث کی۔

ان کا دیباچہ میں یہ لکھ دینا کہ میں اخبارِ صحیح جمع کروں گا اس کے معنی صرف اسنے ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں جو روایات درج کیے ہیں وہ معتبر اور قابلِ اطمینان تھے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمارے لیے بھی یہی درجہ رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ ہم سوائے معصوم کے کسی رائے کو اپنے لیے بالکل حجت اور ناقابلِ شک وشبہ نہیں سمجھتے۔ بے شک کافی کی حدیث میں ہم کو اضطراب سند ومتن وغیرہ کی دشواریوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا اس لیے کہ اس میں نقل احادیث کے سلسلہ میں انتہائی ضبط سے کام لیا گیا ہے اور یہی خصوصیت وہ ہے جس نے اس کو دوسرے تمام جوامع حدیث میں ممتاز درجہ عطا کر دیا ہے۔

دوسرے بزرگ جنھوں نے اس خدمت کو انجام دیا شیخ صدوق محمد ابن علی ابن بابویہ قمی تھے جنھوں نے کتاب من لایحضرہ الفقیہ تالیف کی اس میں انھوں نے دیباچہ میں ضرور تحریر کیا ہے کہ میں اس میں وہی روایات درج کروں گا جن کے مطابق میں فتویٰ دیتا ہوں اور اپنے اور خدا کے درمیان ان کو حجت سمجھتا ہوں لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے وہ پورے طور سے اس پر قائم نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ایسی روایتیں بھی درج کر دی ہیں جن کی انھیں خود رد کرنا پڑی ہے۔ انھوں نے پوری سندیں بھی نقل نہیں کیں بلکہ صرف آخری راوی کا نام لکھ دیتے ہیں جس نے امام سے روایت کی ہے۔ پھر ختم کتاب کے بعد انھوں نے ایک فہرست اپنے مشائخ کی لکھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کس راوی کی طرف ان کا طریق کیا ہے اس لیے اس کو کتاب

من لا یحضرہ الفقیہ کے ساتھ اس فہرست مشیخہ من لا یحضرہ پر نظر رکھنا ضروری ہے اور ہر روایت کی جانچ کے موقع پر اس پر نظر ڈالنا لازمی۔

یہ ایک بڑی سر مغزی کا کام ہے جس سے دشواری پیدا ہو گئی ہے نیز اس میں روایات کے بیان کے سلسلے میں کہیں کہیں تفسیری شرح ایسی آگئی ہے جس کے متعلق دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ امام کا کلام تو نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ کتاب استحکام و اعتبار اور حسن ترتیب تالیف میں موخر ہونے کے باوجود کافی کی ہم پلہ تسلیم نہیں کی گئی۔

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الطائفہ محمد ابن الحسن الطوسی نے کتاب تہذیب اور کتاب استبصار تصنیف کی۔ تہذیب کی ترتیب اور اس کا طرز تدوین واقعی بہت اچھا ہے مگر سند اتنی ضبط کے ساتھ اس میں نہیں ہے جس طرح کافی میں ہے اس میں کہیں تو کافی کی طرح پوری سند نقل کی ہے اور کہیں من لا یحضرہ الفقیہ کی تعلیق کی گئی ہے اور پھر مشیخہ کی فہرست بھی جو آخر میں دی گئی ہے مکمل نہیں ہے اس لیے اکثر انسان کو تعیین سند میں غور و خوض اور قرائن وظنون سے کام لینا پڑتا ہے۔

علماء کا خیال ہے کہ انسان کے لیے کافی اور تہذیب دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ایک کی ضرورت دوسرے سے پوری نہیں ہوتی۔ کافی میں حدیثیں فقہ اور غیر فقہ دونوں شعبوں کے متعلق ہیں لہٰذا وہ تہذیب سے زیادہ جامع ہے اور تہذیب میں فقہ کی حدیثیں کافی سے زیادہ ہیں اس لیے یہ زیادہ جامع ہے۔

استبصار درحقیقت صرف کتاب جامع احادیث ہی نہیں بلکہ اس میں متعارض حدیثیں درج کر کے ان میں جمع، ترجیح، تاویل کے فرائض انجام دیے گئے ہیں جو خالص ایک فقیہ اور مجتہد کا فرض ہے۔

یہی چاروں کتابیں وہ ہیں جو کتب اربعہ کے نام سے یاد کی جاتی ہیں کافی کی حدیثوں کی تعداد سولہ ہزار ننانوے (۱۶۰۹۹) اور من لا یحضر کی حدیثیں نو ہزار چوالیس (۹۰۴۴) اور تہذیب تین سو ترانوے ۳۹۳ بابوں پر مشتمل ہے جس میں تیرہ ہزار پانچسو نوے (۱۳۵۹۰) حدیثیں اور استبصار میں نوسو چھیانوے ۹۱۶ باب جن میں پانچ ہزار پانچسو گیارہ (۵۵۱۱) حدیثیں ہیں۔

الامثال تنزل من السماء یہ عجیب بات ہے کہ ان تمام مصنفین جوامع کا نام محمد اور کنیت ابو جعفر تھی۔

مصنف کافی ابو جعفر محمد ابن یعقوب کلینی۔ مصنف من لا یحضر ابو جعفر محمد ابن علی ابن بابویہ قمی۔ مصنف تہذیب و استبصار ابو جعفر محمد ابن الحسن الطوسی تھے۔ اسی وجہ سے علماء اجازات جب ان کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو فرماتے ہیں الکتب الاربعۃ لابی جعفرین المحمدین الثلثۃ المتقدمین اور اس حسن اتفاق میں اضافہ یہ ہے کہ متاخرین میں سے بھی وہ حضرات جنھوں نے مشہور جوامع حدیث کی تصنیف کی ان کا بھی نام محمد تھا جن کا تذکرہ ابھی آئے گا۔

شیخ صدوق کے علاوہ من لا یحضر کے ۲۹۹ اور تصانیف خاص علم حدیث میں تھے جن میں سے ثواب الاعمال، عقاب الاعمال، مدینۃ العلم

وغیرہ وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔ جو متاخرین علماء کا مستند رہی ہیں لیکن کوئی ان میں سے وسعت و جامعیت کے اعتبار سے من لا یحضرہ کے درجہ تک نہ تھی۔

جس قدر رسالت مآب اور ائمہ کا دور قریب تھا۔ تحقیق کے ذرائع زیادہ اور وثوق و اطمینان کے اسباب فراواں تھے۔ سابق زمانہ کے لوگوں کے لیے اکثر احادیث ایسے قرائن کے ساتھ مقرون ہوتے تھے جن کی وجہ سے اگرچہ راوی خبر کے ضعیف ہوں لیکن انھیں اصل خبر کے متعلق وثوق و اطمینان ہوتا تھا اور اس اعتبار سے وہ اسکو صحیح کہتے تھے۔ اکثر اخبار ان کے لیے قطعی یا موثوق بالصدور تھے جس میں ان کو راویوں کی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ بہت پہلے کے قدماء کا کیا ذکر سید مرتضیٰ علم الہدیٰ تک جو چوتھی صدی کے اواخر میں تھے اخبار احاد پر عمل کی اجازت نہیں دیتے اور فرماتے ہیں کہ متواتر حدیثیں اتنی موجود ہیں جو تمام مسائل شرعیہ میں کافی ہوسکتی ہیں اور ان کے بعد احاد پر عمل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

شیخ الطائفہ محمد ابن حسن طوسی جو ان کے شاگرد تھے متواتر ہونے کے تو قائل نہیں مگر اتنا ضرور فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں جو مشہور و مستند کتابوں میں موجود ہیں ان کے متعلق قرآن کے ذریعہ سے ہمیں صحت کا علم قطعی ہے ان حضرات کی دیکھا دیکھی ابن ادریس حلی تک جو ساتویں صدی ہجری میں تھے کہتے گئے کہ متواتر ہی پر عمل ہونا چاہیے۔ احاد کی ضرورت نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کے امتداد کے ساتھ جتنا جتنا عصر معصوم کو بُعد ہوتا جاتا دشواریاں زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہیں اس لیے جو چیزیں قدماء کے لیے مقطوع

تھیں وہ متاخرین کے لیے مظنون اور جو ان کے لیے مظنون تھیں وہ ان کے لیے موہوم بن گئیں

صدیوں کے حائل ہو جانے سے خارجی قرائن مختلف غائب ہو گئے اور وہ وثوق بالصدور یا اطمینان جو قرائن کی بنا پر سابق کے لوگوں کو تما رخصت ہوا۔ اب تو بس یہی اور سند اور اس کے رواۃ کا استناد و اعتبار۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں صحیح، حسن، موثق، ضعیف کی اصطلاح قرار دی گئی اور رواۃ کی جرح و تعدیل کی بنیاد پڑی۔ اکثر علماء کی تحریر کے مطابق اس اصطلاح کی بنیاد علامۂ حلی کی ڈالی ہوئی ہے۔ محدث استرآبادی نے فوائد مدنیہ میں اسے مشکوک صورت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں علامۂ حلی یا کوئی ان کا ہم عصر۔

ہمارے شیخ الحدیث خاتمۃ المحدثین مولانا سید حسن صدر نے تحریر فرمایا ہے کہ اس تقسیم کے موجد سید جمال الدین احمد بن طاؤس ہیں جنہوں نے ۶۷۳ھ میں وفات پائی۔

اب روایات کی جانچ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شیخ حسن ابن زین الدین شہید ثانی جو مصنف معالم ہے کتاب منتقی الجمان فی الاحادیث الصحاح والحسان تحریر کی۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب عام طور سے دستیاب نہیں ہوتی اور ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گزری۔ اب متاخرین کا دور آ گیا تھا۔ گیارھویں صدی میں محمد ابن مرتضیٰ مشہور بہ ملا محسن فیض کاشانی نے جمع بین الصحاح کے طور پر کافی فقیہ تہذیب استبصار چاروں کتابوں کے احادیث کا مجموعہ وافی کے نام سے تحریر کیا جس میں مشکل احادیث کا بیان یعنی حل بھی اپنے مخصوص مسلک اور

مذاق کے مطابق تحریر کیا ہے۔ موصوف کا مسلک اصول عقائد میں تصوف و عرفان کی طرف مائل اور فقہ میں اخباریت کی طرف راجح تھا۔

مجدد مذہب شیعہ ملا محمد باقر مجلسیؒ نے انتہائی کدو کاوش اور وسعت نظر و تتبع کے ساتھ کتاب "بحار الانوار" ۲۶ جلدوں میں جمع کی جس میں کتب اربعہ کے علاوہ سینکڑوں کتابوں سے ہر شعبہ کے متعلق احادیث کو جمع کیا اس میں شبہ نہیں کہ وسعت و جامعیت کے اعتبار سے بڑا کام کیا اور ایک متجسس شخص کو تمام روایات کسی بحث کے ایک ہی مقام پر دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن یہ بتانا ناگزیر ہے کہ موصوف نے نقل احادیث میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے اسی لیے بحار میں غث و سمین سب کچھ نظر آتا ہے۔ اور مراسل کی بھرمار ہے۔ یہی وہ چیز تھی جس کے لیے قدماء اصحاب نے اصول اربعمائۃ کا انتخاب اور محمدین قدماء نے کتب اربعہ کی تدوین کی تھی تاکہ غیر مستند روایات کا ذخیرہ ہمارے احادیث میں مخلوط نہ ہونے پائے اس جامعیت کتاب کی فکر نے اس مقصد کو نظر انداز کر کے نقد و بحث کی گنجائش پیدا کر دی۔

اس زمانہ میں شیخ محمد ابن الحسن الحر العاملی نے صرف فقہ کے متعلق احادیث کو علاوہ کتب اربعہ کے دوسرے اصول اور کتب سے تلاش کر کے انتہائی جستجو کے ساتھ کتاب "وسائل الشیعہ" تصنیف کی جو بے شک بہترین جامع احادیث کتاب ہے۔ اس کتاب نے ایک فقیہ متجسس احادیث کو کتب اربعہ اور ان تمام کتابوں سے جو اس سلسلہ میں قابل توجہ تھیں مستغنی کر دیا اور پھر لطف یہ کہ سند پوری درج کر دی گئی ہے اور مکمل حوالہ منقول عنہ کا موجود ہے لیکن "بے عیب ذات خدا کی ہے" اس میں ایک ایسی بات ہو گئی جس سے احتیاج اصل ماخذوں

کے دیکھنے کی پھر بھی باقی رہی وہ یہ ہے کہ موصوف نے احادیث کو مناسب ابواب میں درج کرنے کے لیے تقطیع اختیار کر دی یعنی اگر کوئی حدیث ایسی ہے جس میں ابتدائی حصہ کتاب النکاح سے متعلق ہے۔ وسطی کتاب الطلاق سے آخری مثلاً کتاب الظہار سے تو وہ اس روایت میں تین ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ پہلا ٹکڑا پہلی کتاب میں، دوسرا دوسری کتاب میں اور تیسرا تیسری کتاب میں۔ اس میں ظاہر میں کوئی نقصان تو نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقتاً جسے حدیث کے معنی سمجھنا اور اس سے کوئی نتیجہ نکالنا ہوتا ہے وہ اس کی خرابی کو محسوس کرتا ہے۔ اس کا ایک اثر تو سند کے اوپر پڑا کہیں روایت میں اضمار پیدا ہو جاتا ہے۔

مضمر اس روایت کو کہتے ہیں جس میں امام کا نام نہ ہو جن سے حدیث منقول ہے بلکہ عنہ کا لفظ ہو۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ حدیث طولانی تھی بشروع میں امام کا نام موجود تھا لیکن درمیان میں پھر ضمیریں مذکور تھیں تقطیع ہوئی تو پہلا ٹکڑا جہاں گیا وہاں تو نام موجود ہے لیکن بعد کے ٹکڑے جہاں جہاں گئے وہاں اضمار پیدا ہو گیا۔

اس کے علاوہ یہ کہ اکثر مطالب اجزائے حدیث کے آپس میں دست و گریبان ہوتے ہیں۔ وہ ٹکڑے جو مصنف وسائل نے باہم غیر متعلق خیال کیے ہیں یہ ضروری نہیں کہ غیر متعلق ہی ہوں وہ عالم متبحر سہی لیکن معصوم نہیں تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر معنی میں خرابی پڑتی ہے اور خلط مبحث ہو جاتا ہے۔

بہت بڑی خدمت ہوتی اگر کوئی شخص وسائل کی حدیثوں کا اصل

کتب منقول عنہا سے مقابلہ کر کے مواضع تقطیع کو معین کر دیا اور متفرق حدیثوں کے ٹکڑوں کا پتہ لگا کر یکجا کر دیا تو پھر یہ کتاب وسائل ایک ایسا ذخیرۂ حدیث تھا جس کی موجودگی میں کسی دوسری کتاب حدیث کی ضرورت نہیں ہے۔ وسائل میں تمام ابوابِ فقہ کے متعلق ایسا ذخیرہ جمع کر دیا ہے کہ بہت جستجو کے بعد بھی اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہوتا اگرچہ اس چودھویں صدی کے اوائل میں مشہور محدث میرزا حسین نوری نے مستدرک الوسائل کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں ایک مجموعہ احادیث تصنیف فرمایا جو ان کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن فائدہ کے اعتبار سے اسے کوئی خاص اہمیت دیے جانے کا استحقاق نہیں حاصل ہوا اس لیے کہ ایک تو جن کتابوں سے فاضل نوری نے اس کتاب کی تدوین کی وہ استناد واعتبار میں کسی طرح صاحب وسائل کی منقول عنہا کتابوں کے مقابل نہیں ہیں ان میں سے اکثر کتابوں کے متعلق علماء کی طرف سے قدح موجود ہے اور ان کے رواۃ بھی مجروح ہو چکے ہیں اور محدث نوری کو ان کے استناد و حجیت کے سلسلہ میں صفحے کے صفحے سیاہ کرنا پڑے ہیں۔ بعد کو چاہے ان کی تعدیل ثابت بھی ہو۔ لیکن یقیناً اس اختلاف و بحث سے ان کتب کی متفق علیہ حیثیت باقی نہیں رہتی اور یہ ان کی ایک حد تک کمزوری کی دلیل ضرور ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس مستدرک میں جو کچھ ہوا ہے وہ صرف اتنا کہ کسی خاص مسئلہ کے متعلق صاحب وسائل نے دو حدیثیں مثلاً نقل کی تھیں صاحب مستدرک نے دو اور نقل کر دیں لیکن نفس مسائل اور فروع فقہیہ کے متعلق وہ کچھ اضافہ کر سکے ہوں یعنی کچھ ایسے احادیث نقل کر سکے ہوں۔ جن کے مندرجہ

مضامین و احکام وسائل کی مندرجہ احادیث کے احکام سے کچھ زائد ہوں
ایسا نہیں ہے۔

اس لیے مستدرک اپنے مصنف کے تتبع اور وسعت اطلاع کی دلیل بن سکتی ہے اور اس کے مصنف کی جفاکشی و محنت کی داد بھی دی جا سکتی ہے لیکن کسی مجتہد کو استنباط کے وقت وسائل کے دیکھنے کے بعد مستدرک کو نکال کر مطالعہ کرنے کی ضرورت پڑے؟ ایسا نہیں ہے۔

یہ جوامع حدیث وہ ہیں جن کو خاص شہرت حاصل ہوئی ان کے علاوہ بھی اس آخری چند صدی کے دور میں بعض کتابیں تالیف ہوئی ہیں۔ جن کا پتہ جناب سید حسن صدر دام ظلہ' کی کتاب "الشیعہ و فنون الاسلام" میں موجود ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب عوالم ہے جو علامہ مجلسیؒ کے معاصر ملا عبداللہ ابن نوراللہ بحرانی کی تالیف تھی۔ اس کا صرف وہ حصہ جو واقعات کربلا سے تعلق رکھتا ہے "مقتل عوالم" کے نام سے شائع ہو گیا ہے لیکن حقیقت میں یہ کتاب سو جلدوں پر مشتمل تھی جن کا مجھے تو پتہ نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔ الشیخ قاسم ابن محمد بن جواد معروف بابن وندی و فقیہہ کاظمی جو صاحب وسائل کے معاصر تھے انھوں نے شرح الاستبصار فی احادیث الائمۃ الاطہار تصنیف کی جو متعدد مجلدات پر مشتمل تھی اور اسی طرح شیخ عبداللطیف ابن علی بن احمد بن ابی جامع حارثی عاملی کی کتاب جامع الاخبار فی ایضاح الاستبصار متعدد جلدوں میں اور شیخ محمد رضا ابن شیخ عبداللطیف تبریزی کی کتاب "شفائی حدیث آل المصطفیٰ" اور سید عبداللہ ابن سید محمد رضا شبر کاظمی کی کتاب جامع الاحکام جو ۲۵ جلدوں میں ہے اور علامہ مجلسیؒ کی بحار کے

بعد جس سے زیادہ مبسوط تصنیف تحریر نہیں ہوئی ہے کتاب کافی کی شرحیں بہت سے علماء نے لکھیں جن میں سے ملا صالح مازندرانی اور میرزا خلیل قزوینی کی دونوں شرحیں اور علامہ مجلسیؒ کی مرآۃ العقول خاص شہرت کی مالک ہیں۔ صدرالدین شیرازی نے بھی ایک شرح کافی کی لکھی تھی مگر وہ ان کے خاص فلسفیانہ مذاق پر تھی جس کو علم حدیث کی بارگاہ میں کوئی قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ من لا یحضرہ الفقیہ کی شرح ملا محمد تقی مجلسی نے لکھی ہے کوئی خاص علمی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ تہذیب کی شرح سید نعمت اللہ جزائری نے لکھی جو مبسوط اور کثیر الفوائد ہے۔

موجودہ زمانہ میں آیۃ اللہ سید حسن صدر دام ظلہ جن سے بڑھ کر اس فن کا غواص اب کوئی موجود نہیں ہے انھوں نے وسائل کی شرح اس انداز پر لکھنا شروع کی جس کی نظیر اس کے قبل نایاب ہے۔ وہ حدیث کو لکھ کر السند، المتن، اللغۃ، المعنی کے عناوین قائم کرکے ہر روایت کے رجال، روایت لفظ، معنی تمام جہات کی فیصلہ کن شرح لکھتے اور یکسوئی کے ساتھ مختتم نتیجہ حاصل کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب موصوف کے قوائے عمل جواب دے چکے ہیں اسی برس کی عمر میں اتنی بڑی خدمت کہاں انجام پاسکتی ہے

نتیجہ یہ ہوا کہ ۳ جلدیں صرف کتاب الطہارۃ کی شرح میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں اور اسکے بعد انتہائی ضعف پیری اور امراض و عوارض سے تصنیف کا سلسلہ ہی قطع ہوگیا اور اتمام ممکن نہ ہوا۔ بہرحال ممدوح نے سنگ بنیاد قائم کر دیا ہے

اور کوئی خدا کا بندہ خدا کی توفیق شامل حال ہو تو اس کی تکمیل کر دے، کوئی تعجب نہیں ہے۔

یہ وہ خدمات تھے جو براہ راست علم حدیث کے سلسلہ میں سے کیے گئے متعلقات حدیث میں علم درایت و رجال ہے۔ درایت میں سب سے پہلی تصنیف تو ابو عبد اللہ حاکم نیشا پوری کی ہے جنہوں نے "معرفۃ علوم الحدیث" کے نام سے ۵ حصوں میں کتاب تصنیف کی۔ ان کے بعد علمائے شیعہ میں سے سید جمال الدین ابو الفضائل احمد ابن طاؤس ہیں جنہوں نے بقول آقا سید حسن صدر صحیح، حسن، موثق، ضعیف کی اصطلاح قائم کی۔

علامہ حلی کے شاگرد سید علی ابن عبد الحمید حسنی نے شرح اصول درایۃ الحدیث تصنیف کی۔ اور شہید ثانی نے کتاب الدرایۃ شیخ حسین بن عبد الصمد حارثی والد شیخ بہائی نے وصول الاخیار الی اصول الاخبار اور شیخ بہاء الدین عاملی نے وجیزہ تحریر کیا۔ آخر الذکر کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ متعدد علماء نے اس کی شرح تصنیف کی۔ ہمارے ہندوستان ہی میں تاج العلماء سید علی محمد صاحب قبلہ طاب ثراہ نے اس کی تین شرحیں لکھیں۔ ایک مختصر دوسری متوسط، جوہرۂ عزیزہ فی شرح الوجیزہ تیسری بڑی مبسوط سلسلۃ الذہب" مولانا امجد حسین صاحب الہ آبادی اعلی اللہ مقامہ نے صفائح الابریزیہ فی شرح الوجیزہ بھی اچھی شرح لکھی۔ اور خاتمۃ المحدثین آقا سید حسن صدر دام ظلہ نے کتاب نہایۃ الدرایہ تحریر فرمائی جو مبسوط اور نہایت کثیر الفوائد ہے۔

علم رجال میں سب سے پہلے مصنف ابو عبد اللہ ابن محمد بن خالد برقی ہیں۔

یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے دوسری صدی ہجری میں تھے۔ ان کی کتاب رجال کا تذکرہ ابن ندیم نے فہرست میں کیا ہے اور نہایت خوشی کی بات ہے کہ ان کی کتاب رجال اس وقت تک موجود ہے ابو جعفر الطقطینی جو امام محمد تقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے انھوں نے رجال میں کتاب لکھی اور اس کا بھی تذکرہ فہرست نجاشی اور فہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ ابو محمد عبداللہ بن جبلہ بن حیان بن ابجر کنانی نے کتاب رجال تصنیف کی۔

چوتھی صدی ہجری میں شیخ ابو الحسن محمد بن احمد بن داؤد قمی نے کتاب الممدوحین والمذمومین من الرواۃ لکھی اور شیخ صدوق محمد ابن علی بن بابویہ قمی نے کتاب معرفۃ الرجال اور کتاب الرجال المختارین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور شیخ ابو بکر جعابی نے کتاب الشیعہ من اصحاب الحدیث وطبقاتہم یہ معروف مشہور تصانیف تھے لیکن ان تمام کتابوں میں جو اس کے بعد سے اب تک تصنیف ہوئیں جن کتابوں نے بقا ، دوام کی سند حاصل کی وہ رجال ابو عمرو کشی اور فہرست مصنفی الشیعہ للنجاشی اور شیخ طوسی کی کتاب رجال اور کتاب فہرست اور علامہ حلی کی کتاب خلاصۃ الرجال اور ان سب کا مجموعہ اور نتیجہ منہج المقال مشہور بہ رجال کبیر میرزا محمد استرآبادی جس کے دیباچہ تا باقر بہبہانی نے حاشی تحریر کیے اور اصل کتاب اور ان حواشی کو لے کر شیخ ابو علی حائری نے کتاب منتہی المقال تصنیف کی جس میں اگر استحیب نہ ہوتا کہ مجہولین کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تو بہترین کتاب تھی۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ منتہی المقال کے بعد پھر اس پایہ کی کوئی کتاب بہت طویل عرصہ تک تصنیف نہیں ہوئی۔

بے شک اب بالکل قریبی دور میں ہمارے شیخ المحدیث آقا شیخ عبداللہ مامقانی نجفی طاب ثراہ نے ایک مبسوط ترین کتاب رجال میں تصنیف فرمائی ہے جس میں ہر راوی کے متعلق بالکل کتب فقہیہ کے انداز پر نقل اقوال کرتے۔ ہر ایک کے دلائل ذکر کرتے اور پھر محاکمہ کرتے ہیں۔ اسکی تصنیف میرے سامنے ہی شروع ہوئی اور میرے ہی سامنے ختم ہوئی اور میرے ہی سامنے چھپنا شروع ہوئی اور اب وہ مکمل تین جلدوں میں طبع ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب علم رجال کی تمام دوسری کتابوں سے مستغنی کر دینے والی ہے۔

علم حدیث کے متعلق دو کام ابھی کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ تمام جوامع حدیث میں سے جن میں میرے خیال میں وافی و وسائل بالکل کافی ہیں ہر حیثیت سے جو قابل احتجاج و استناد احادیث ہیں ان کا انتخاب کر کے مجمع کر دیا جائے جس کے روایات بالکل مستند اور معتبر اور معمول بہ حیثیت رکھتے ہوں۔ دوسرے مالا یحتج بہ من الاخبار کے ایسے نام سے ایسے روایات جن سے تمسک کرنا درست نہیں ہے بیان وجہ ضعف و عدم استناد کے ساتھ تحریر کر دیے جائیں۔

اگر یہ دونوں کام ہو جائیں تو بہت ایسی غلطیاں جو بے محل روایات کے پیش کرنے سے پیدا ہوتی ہیں ان کا سدباب

ہو جائے گا۔

تیسرا کام اور ہے جو تدوین حدیث سے خاص متعلق کام نہیں ہے لیکن اس حیثیت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ فقہ الحدیث کی تصنیف ہے جس میں مشکلات معانی احادیث کا صحیح حل مکمل صورت سے تحریر کیا گیا ہو۔ ان کاموں کے لیے بڑی توفیق الٰہی کی ضرورت ہے اور جس کے یہ توفیق شامل حال ہوگی اس کے ہاتھ سرانجام پائیں گے۔

---

maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیثِ حوض

(سوال جناب سید باور حسن صاحب جونیئر اسسٹنٹ کیمسٹ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ)

مجھے جناب سے حدیثِ حوض کے متعلق دریافت کرنا ہے جس کے لیے صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ جس کے شاید لفظی معنی یہ ہیں :-

"میں حوضِ کوثر پر جب جاؤں گا تو میرے اصحاب بھی میرے پاس آ کر کھڑے ہو جائیں گے، مگر خدا اُن کے اور میرے بیچ میں ایک پردہ حائل کر دے گا۔ میں تین بار کہوں گا، خداوندا یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ مگر جواب آئے گا کہ نہیں اے رسولؐ! تم نہیں جانتے کہ تمہارے بعد انھوں نے دین میں کیا کیا تفرقہ اندازی کی۔"

جناب عالی! اس حدیث کے صحیح الفاظ عربی کے اور اس کے معنی مع حوالجات تحریر فرمائیں۔ اس لیے کہ لوگ اکثر بات چھیڑ دیتے ہیں۔ تو یہ ایک بیّن ثبوت ہو جائے گا۔

الجواب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حدیثِ حوض صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دیگر صحاح وسنن و جوامع اہلِ سنت میں بطریقِ کثیرہ موجود ہے۔ اور ایسا پتہ چلتا ہے کہ حضرت پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ مضمون کسی ایک ہی موقع پر ارشاد نہیں فرمایا، بلکہ یہ انتباہ روزِ قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے اتنا اہم تھا کہ حضرت نے متعدد مواقع پر متعدد انداز اور الفاظ میں اس مطلب کو بیان فرمایا ہے جس کے لیے سلسلہ وار صحاح ستہ اور بعض دیگر مستند جوامع حدیث کے اقتباسات بلا کسی مزید تبصرہ کے پیش کیے جاتے ہیں۔

وعلی اللہ التوکل وبہ الاعتصام

صحاحِ ستہ اور چند معتبر کتابوں کے نام اور وہ مقامات جہاں حدیثِ حوض درج ہے

صحیح بخاری میں جہاں تک اس وقت میرے پیشِ نظر ہے اور ممکن ہے تلاش کے بعد اس سے زیادہ موارد ملیں، حدیثِ حوض اور اس کے معاون احادیث جو بعد میں درج ہوں گے پانچ بابوں میں درج ہیں۔

(۱) کتاب الفتن (۲) باب فی الحوض (۳) کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (۴) باب

کیف الحشر (۵) کتاب التفسیر، سورۃ المائدۃ باب و کنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم۔

اور ان ابواب میں جو احادیث متعدد طرق سے درج ہوئے ہیں ان کی تعداد گیارہ ہے۔

صحیح مسلم میں یہ احادیث کتاب الفضائل باب اثبات حوض نبینا وصفاتہ میں ہیں اور احادیث کی تعداد آٹھ ہے۔

سنن ابن ماجہ میں کتاب المناسک میں باب الخطبۃ یوم النحر

جامع ترمذی میں ابواب صفۃ القیامۃ کے ذیل میں باب ماجاء فی شان المحشر اور ابواب التفسیر میں سورۃ الانبیاء

موطاء امام مالک میں باب جامع الوضوء۔

اور مسند امام احمد بن حنبل میں:۔

(۱) مسند عبداللہ بن مسعود (۲) مسند ابی ہریرہ اور (۳) مسند ابن عباس میں نو طرق سے یہ حدیث مذکور ہے۔

ان میں سے ہر قسم کی ایک ایک حدیث کے الفاظ مع ترجمہ مکمل حوالوں کے ساتھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱)

صحیح بخاری طبع مصر ج ۹ ص ۵۸ کتاب الفتن میں ہے:۔

حدثنا موسیٰ بن اسماعیل عن ابی وائل قال قال عبداللہ قال النبیؐ انا فرطکم علی الحوض: لیرفعن الیّ رجال منکم حتیٰ اذا ھویت لاناولھم

موسیٰ بن اسماعیل کی روایت ہے بسند متصل ابو وائل کی زبانی عبداللہ بن مسعود سے کہ پیغمبرؐ خدا نے فرمایا میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ میرے پاس تم میں سے

اختلجوا دونی فاقول ای رب اصحابی یقول لا تدری ما احدثوا بعدک۔

کچھ لوگ لائے جائیں گے یہاں تک کہ جب میں جھکوں گا کہ انھیں اپنی طرف لے لوں تو وہ میرے پاس سے ہٹ جائیں گے، تو میں کہوں گا کہ اے میرے پروردگار یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ ارشاد ہوگا کہ آپکو نہیں معلوم انھوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلایا؟

تقریباً انہی الفاظ میں یہ جلد ۸ صفحہ ۱۴۸ باب فی الحوض میں ہے اور صفحہ ۱۴۹ میں تقریباً یہی حدیث انس کی زبانی ہے کہ رسولؐ نے فرمایا:۔

لیردن علی ناس من اصحابی الحوض حتی عرفتھم اختلجوا دونی فاقول اصحابی فیقول لا تدری ما احدثوا بعدک۔

میرے پاس کچھ لوگ میرے اصحاب میں سے حوض کوثر پر وارد ہوں گے یہاں تک کہ میں انھیں پہچان لوں گا تو وہ میرے پاس سے دور ہو جائیں گے تو میں کہوں گا کہ اے میرے اصحاب اتی ارشاد قدرت ہوگا کہ آپ کو نہیں خبر انھوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلایا؟

صحیح مسلم مصر ج ۲ ص ۲۱۰ ۔ کتاب الفضائل۔ باب اثبات حوض نبیّنا و صفاتہ میں بھی انس والی حدیث ہے ان الفاظ میں کہ:۔

ليردن على الحوض
رجال ممن صاحبني حتى
اذا رأيتهم ورفعوا الي
اختلجوا دوني فلاقولن
اي رب اصيحابي اصيحابي
فليقالن لي انك لا
تدري ما احدثوا بعدك

میرے پاس حوض کوثر پر کچھ
لوگ ان میں سے جو میری
صحبت میں رہے ہیں آئیں گے
یہاں تک کہ جب میں انھیں دیکھوں
گا اور وہ میرے سامنے آئینگے
تو ایک دم مجھ سے دور ہو جائیں
گے تو میں کہوں گا، اے میرے
پروردگار یہ میرے پیارے اصحاب
ہیں، میرے پیارے اصحاب ہیں
تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو
نہیں خبر کہ انھوں نے آپ کے
بعد کیا گل کھلائے؟

(۲)

صحیح بخاری ج ۹ ص۵ کتاب الفتن کی دوسری حدیث ذرا
زیادہ مفصل ہے:-

حدثنا يحيى بن بكير
حدثنا يعقوب بن
عبد الرحمن عن ابي حازم
قال سمعت سهل بن
سعد يقول سمعت
النبي يقول انا فرطكم

سہل بن سعد کا بیان ہے
کہ میں نے پیغمبر خدا کو فرماتے
ہوئے سنا کہ میں حوض پر تمہارا
پیش رو ہوں گا۔ جو وہاں وارد
ہوگا وہ اس پانی سے سیراب
ہوگا، اور جو وہاں سے سیراب

على الحوض من ورده
فشرب منه ومن شرب
منه لم يظمأ بعده
ابدا ليردن على اقوام
اعرفهم ويعرفوني ثم
يحال بيني وبينهم
قال ابو حازم فسمعني
النعمان بن ابي عياش
وانا احدثهم هذا
فقال هكذا سمعت
سهلا فقلت نعم قال
وانا اشهد على ابي
سعيد الخدري لسمعته
يزيد فيه قال انهم
مني فيقال انك لا
تدري ما بدلوا بعدك
فاقول سحقا سحقا لمن
بدل بعدي

ہو گیا وہ پھر کبھی پیاسا نہیں ہوگا
ہاں کچھ جماعتیں میرے پاس وارد
ہوں گی جنہیں پہچانتا ہوں اور
وہ مجھے پہچانتے ہیں، پھر میرے
اور ان کے درمیان پردہ حائل ہو
جایا جائے گا۔ نعمان بن ابی
عیاش کا بیان ہے کہ انھوں
نے ابوسعید خدری کی زبانی اس
کے بعینہ اس حدیث کو سنا اور
وہ اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ
کرتے تھے۔ میں کہوں گا کہ یہ
تو مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔
کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں خبر
کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا
تبدیلی کی۔ تو میں کہوں گا، کہ
دوری ہو، دوری ہو اس کے
لیے جس نے میرے بعد تبدیلی
کی۔

یہی حدیث بخاری نے جلد ۸ ص ۱۴۹ - ۱۵۰ میں باب فی الحوض
کے ضمن میں بھی درج کی ہے۔ اور وہاں اتنا اضافہ ہے کہ جناب
ابن عباس نے حدیث کے آخری لفظ جو رسولؐ کی زبانی ہے

"سحقاً سحقاً لمن غیّر بعدی" اس کی تشریح فرمائی ہے کہ :-

سحقاً بعداً یقال	سحقاً کے معنی ہیں دوری ہو
سحیق بعید واسحقہ	کہا جاتا ہے سحیق یعنی دور اور
ابعدہ ۔	اسحقہ یعنی دور کیا اس کو۔

ظاہر ہے کہ لعنت کے معنی بھی رحمتِ خدا سے دوری کے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسولؐ جس کا کام روزِ قیامت خلق کی شفاعت ہے اس بدنصیب جماعت پر جس کا تذکرہ فرمایا ہے اسی موقع شفاعت پر دو دوبار لعنت فرما رہے ہیں۔

یہی حدیث صحیح مسلم مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۲۰۷ کتاب الفضائل میں سہل بن سعد اور نیز ابوسعید خدری کی زبانی اسی صورت سے مذکور ہے۔

(۳)

صحیح بخاری ط مصر جلد ۸ ص ۱۵۰ باب فی الحوض میں ہے

عن ابی ھریرۃ انہ	ابوہریرہ کی زبانی ہے کہ وہ
کان یحدث ان رسول	بیان کیا کرتے تھے کہ رسولؐ
اللہ قال یرد علیّ یوم	خدا نے فرمایا۔ میرے پاس
القیامۃ رھط من اصحابی	قیامت کے دن ایک گروہ
فیحلئون عن الحوض فاقول	میرے اصحاب میں سے آئے گا
یارب اصحابی فیقول انک	تو وہ حوض کوثر سے روک دیے
لاعلم لک بما احدثوا	جائیں گے تو میں کہوں گا اے

یعد لک انھم ارتدوا علی ادبارھم القھقری	میرے پروردگار یہ میرے اصحاب ہیں تو ارشاد ہوگا کہ آپ کو علم نہیں انھوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلائے۔ وہ لٹے پاؤں اپنے پہلے راستے کی طرف پلٹ گئے تھے۔

سعید بن مسیب اسی حدیث کو بلا تعین اسم عن اصحاب النبی کہہ کر بیان کیا کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے صحابہ سے انھوں نے یہ حدیث سنی تھی۔ صرف ایک لفظ میں اختلاف ہے جس سے مطلب تقریباً ایک ہی رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ حوض کوثر سے روک دیے جائیں گے۔ اس کے لیے زہری کہتے تھے۔ "فیحلون عن الحوض" وہ حوض سے نکال دیے جائیں گے جس طرح ہماری زبان میں جلا وطن کیا جانا مستعمل ہے اور عقیل کہتے تھے فیحلئون جس کے معنی ہیں روک دیے جائیں گے۔

(۴)

صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ کتاب الفضائل باب اثبات حوض نبینا وصفاتہ میں جناب اسماء بنت ابی بکر کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا ؐ نے فرمایا:۔

انی علی الحوض حتی انظر من یرد علی منکم	میں حوض پر ہوں گا کہ دیکھوں کون لوگ تم میں سے میرے

سیؤخذ اناس دونی فاقول یارب منی ومن امتی فیقال اما شعرت ما عملوا بعدک واللہ ما برحوا بعدک یرجعون علی اعقابھم۔

پاس نہ وارد ہونے ہیں اور کچھ ایسے آدمی ہوں گے جنھیں میرے پاس الگ کیا جانے لگے گا تو میں کہوں گا، اے میرے پروردگار یہ مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا (یہ فرمایا کہ) میری امت میں سے ہیں تو ارشاد ہوگا کیا آپ کو خبر نہیں کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ بخدا آپ کے بعد برابر یہ لوگ ایسے رہے کہ اپنے پرانے راستوں پر واپس جاتے تھے۔

ابن ابی ملیکہ جو اس حدیث کے سلسلۂ رواۃ میں ہیں کہتے تھے کہ:-

اللھم انا نعوذ بک ان نرجع علی اعقابنا او نفتتن عن دیننا۔

خداوندا ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں کہ پچھلے پیروں پلٹ جائیں یا اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں

جناب ام المومنین عائشہ کی زبانی بھی تقریباً بالکل اسی مضمون کی حدیث ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اس حدیث میں ہے انظر من یرد علی اور یہاں انتظر من یرد علی "میں انتظار کرتا ہوں گا ان کا جو میرے پاس وارد ہوں گے"۔ وہاں ہے سیؤخذ اناس دونی یہاں ہے فواللہ لیقتطعن من دونی رجال "بخدا کچھ لوگ مجھ سے کٹ کر الگ ہو جائیں

گے جو وہاں ہے اما شعرت ما عملوا بعدک واللہ ما برحوا بعدک یرجعون علیٰ اعقابھم۔ یہاں ہے انک لا تدری ما عملوا بعدک ما زالوا یرجعون علیٰ اعقابھم معنی دونوں کے ایک ہیں۔

(۵)

صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ باب سابق الذکر میں عبداللہ بن رافع کی زبانی جناب ام المومنین ام سلمہ رضوان اللہ علیہا کی حدیث ہے کہ میں لوگوں سے حوض کے بارے میں سنا کرتی تھی اور خود پیغمبر خدا ص سے میں نے اس بارے میں کچھ نہ سنا تھا ایک دن کنیز میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی تو میں نے پیغمبر خدا ص کو سنا کہ آپ نے ایھا الناس کہہ کے خطبہ شروع کیا۔ میں نے کنیز سے کہا ذرا میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ اس نے کہا رسول ص نے مردوں کو بلایا ہے عورتوں کو نہیں بلایا ہے۔ میں نے کہا ایھا الناس نے انسانوں کے خطاب میں تو میں بھی داخل ہوں۔ میں نے سنا کہ اس کے بعد رسول ص نے فرمایا:۔

انی لکم فرط علی الحوض فایای لا یاتین احدکم فیذب منی کما یذب البعیر الضال فاقول فیم ھذا فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول سحقا

میں حوض کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ تو دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میں کا کوئی ایک میرے پاس آنا چاہے اور وہ میرے پاس سے ہنکا دیا جائے جیسے کھویا ہوا اونٹ ہنکایا جاتا ہے تو میں کہوں گا یہ کس بنا پر؟ تو کہا

جلائے گا، آپ کو خبر نہیں کہ
انھوں نے آپ کے بعد کیا گل
کھلائے اس پر میں کہوں گا لعنت ہو

یہی حدیث اس کے بعد کئی طرق سے مذکور ہے۔

(۶)

صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۰۸ باب مذکور عبداللہ بن مسعود کی روایت :—

قال رسول اللہ انا فرطکم علی الحوض ولا نازعن اقواما ثم لا غلبن علیهم فاقول یا رب اصحابی اصحابی فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک

رسولؐ نے فرمایا میں حوض کوثر پر تمھارا پیش رو ہوں گا اور کچھ لوگوں کے لیے میں کوشش کرونگا مگر آخر میں بے بس ہو جاؤں گا تو کہوں گا، اے میرے پروردگار میرے اصحاب میرے اصحاب ہیں تو کہا جائے گا آپ کو خبر نہیں کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلایا ؟

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند کے اندر مسند عبداللہ بن مسعود میں متعدد طرق سے چار جگہ درج کیا ہے مسند مطبوعہ مصر ج ۵ صفحہ ۲۳۱ و ۳۱۰ و ۳۲۶ و ۳۳۲۔

(۷)

(مسند احمد بن حنبل ج ۱۵ صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹ - بذیل مسند ابی ہریرہ)

محمد بن زیاد کی روایت ہے کہ میں نے ابوہریرہ کو سنا وہ بیان کرتے تھے کہ پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا:-

والذی نفس محمد بیدہ لاذودن رجالا منکم عن حوضی کما تذاد الغریبۃ من الابل عن الحوض	قسم اس کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے کہ میں کچھ لوگوں کو تم میں سے اپنے حوض سے ہنکا دوں گا جس طرح کوئی اجنبی اونٹ چشمے سے ہنکایا جاتا ہے۔

(۸)

(مسند احمد ج ۱۵ صفحہ ۱۵۲ مسند ابی ہریرہ)

شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے علاء بن عبدالرحمٰن سے سنا وہ اپنے والد کی زبانی ابوہریرہ سے نقل کرتے تھے:-

عن النبی ﷺ انہ اتی المقبرۃ فسلم علی اھل المقبرۃ فقال سلام علیکم دار قوم مؤمنین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون ثم قال وددت انا قد رأینا اخواننا قال فقالوا یا رسول اللہ السنا باخوانک قال بل انتم اصحابی واخوانی الذین لم یأتوا بعد	پیغمبر خدا ﷺ مقبرہ تشریف لے گئے اور اہل قبرستان کو سلام کرتے ہوئے فرمایا: سلام ہو تم پر اے باایمان ساکنو اس مکان کے، اور ہم ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ پھر فرمایا: کتنا دل چاہتا ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ فرمایا (نہیں) بلکہ تم میرے اصحاب ہو اور میرے بھائی تو وہ ہیں جو ابھی

وانا فرطهم على الحوض
فقالوا يا رسول الله كيف
تعرف من لم يات من
امتك بعد قال ارأيت
لو ان رجلا كان له خيل
غر محجلة بين ظهري
خيل بهم دهم الم
يكن يعرفها قالوا بلى
قال فانهم يأتون
يوم القيامة غرا محجلين
من اثر الوضوء وانا
فرطهم على الحوض ثم
قال الا ليذادن
رجال منكم عن حوضي
كما يذاد البعير الضال
اناديهم الا هلم فيقال
انهم بدلوا بعدك
فاقول سحقا سحقا۔

دنیا میں نہیں آئے ہیں، اور میں
حوض کوثر پر ان کا پیشرو ہوں گا
لوگوں نے کہا، یا رسول اللہ آپ کیونکر
پہچانیں گے انھیں جو آپ کی امت
میں سے ابھی آئے نہیں ہیں۔ آپ
نے فرمایا، اگر کسی شخص کے پاس
گھوڑے تمام ایسے ہوں جن کی پیشانی
اور پیروں پر سفیدی ہے، اور وہ
سیاہ گھوڑوں کے درمیان
ہوں تو کیا وہ اپنے
گھوڑوں کو پہچانے
گا نہیں؟ سب نے کہا کیوں نہیں
فرمایا۔ اسی طرح میری امت کے
افراد روز قیامت آئیں گے کہ وضو
کی وجہ سے ان کی پیشانی اور پیروں
سے نور نمایاں ہوگا اور میں حوض پر
ان کا انتظار کرتا رہوں گا۔ پھر
فرمایا کہ تم میں سے کچھ لوگ میرے
حوض سے ہنکا دیے جائیں گے
جس طرح راستہ بھولا ہوا اونٹ
ہنکایا جاتا ہے۔ میں پکار کر کہوں
گا۔ ارے ادھر آؤ۔ تو کہا جائے گا

کہ انھوں نے تو آپ کے بعد تبدیلی
کردی تھی تو میں کہوں گا دفان ہوں
دفان ہوں۔

یہی حدیث بعینہٖ موطا امام مالک (مطبوعہ فخر المطابع دہلی ۱۹۵۲ء) ص۹-۱۰ - باب جامع الوضوء میں درج ہے - صرف اس میں الاھلم الاھلم الاھلم ہے - یعنی تین دفعہ "ادھر آؤ" فرمایا - اور پھر جب جواب ملے گا کہ انھوں نے آپ کے بعد تبدیلی کردی تھی تو تین دفعہ ہے فسحقا فسحقا فسحقا" تو پھر دفان ہوں - تو پھر دفان ہوں - تو پھر دفان ہوں -"

(۹)

سنن ابن ماجہ مطبوعہ مصر ۱۳۷۳ھ صفحہ ۱۰۱۶ ج ۲ کتاب المناسک باب ۷۶ - الخطبۃ یوم النحر:-

عن عبد اللّٰہ بن مسعود قال قال رسول اللّٰہ ؐ و ھو علی ناقۃ المخضرمۃ بعرفات فقال اتدرون ای یوم ھذا وای شھر ھذا وای بلد ھذا - قالوا ھذا بلد حرام و شھر حرام و یوم حرام قال الا

عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا نے اس موقع پر کہ جب آپ اپنے ناقہ پر عرفات میں تھے، ارشاد فرمایا - جانتے ہو کہ یہ کون دن ہے اور کون مہینہ ہے اور کون شہر ہے؟ سب نے کہا یہ شہر بھی حرام (محترم) ہے اور مہینہ بھی حرام ہے اور دن بھی حرام ہے

وانّ اموالكم ودماءكم
عليكم حرام كحرمة
شهركم هذا في
بلدكم هذا في يومكم
هذا الا واني فرطكم
على الحوض واكاثر بكم
الامم فلا تسوّدوا
وجهي الا واني مستنقذ
اناسا ومستنقذ منّي
اناس فاقول يا ربّ
اصيحابي فيقول انك
لا تدري ما احدثوا
بعدك۔

حضرت نے فرمایا معلوم ہونا
چاہیے کہ تمھارے مال اور جان
بھی ویسے ہی حرام (محترم) ہیں
جیسے اس مہینے اور اس شہر اور
اس دن کی حرمت ہے۔ آگاہ
ہونا چاہیے کہ میں حوض پر تمھارا
پیش رَو ہوں گا اور تمھاری کثرت
کے ذریعے امتوں کا مقابلہ
کروں گا تو میرے منہ میں کالک
نہ لگانا۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ میں
کچھ آدمیوں کو چھڑاؤں گا اور کچھ
آدمی مجھ سے چھڑا لیے جائیں گے
تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار
یہ تو میرے پیارے اصحاب ہیں
تو ارشاد ہوگا۔ آپ کو نہیں معلوم
کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا
گل کھلایا۔ سند اس حدیث کی
صحیح ہے۔

maablib.org

معاون احادیث

گذشتہ احادیث تو وہ ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ حوض کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے احادیث ہیں جن میں حوض کا نام نہیں ہے۔ مگر نتیجہ ان کا احادیث حوض سے بالکل متحد ہے۔ یہ حسب ذیل احادیث ہیں:—

(۱)

صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۱۶۹۔ کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

عن ابن عباس رضی
الله عنهما عن النبی ص
قال انکم محشورون
حفاة عراة ثم قرأ
کما بدأنا اول خلق
نعیده وعدا علینا
انا کنا فاعلین واول
من یکسیٰ یوم القیامة
ابراهیم وان اناسا
من اصحابی یؤخذ
بهم ذات الشمال فاقول

جناب ابن عباس کی روایت
ہے۔ حضرت پیغمبر خداؐ
نے فرمایا۔ تم لوگ محشور ہو گے
ننگے سر برہنہ، پریشان حال،
پھر یہ آیت پڑھی کہ جس طرح
پہلے ہم نے پیدا کیا تھا اسی
طرح دوبارہ لائیں گے۔ یہ وعدہ
ہمارے ذمہ ہے جسے ہم پورا
کریں گے اور سب سے پہلے
جس کو لباس ملے گا وہ ابراہیم
ہوں گے اور کچھ لوگوں کو میرے

اصحابی اصحابی فیقول	اصحاب میں سے بائیں طرف
انھم لم یزالوا مرتدین	لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا
علیٰ اعقابھم منذ	یہ میرے اصحاب ہیں' میرے
فارقتھم فاقول کما	اصحاب ہیں تو ارشاد ہوگا کہ یہ
قال العبد الصالح	ہمیشہ اپنے پچھلے پیروں کی طرف
وکنت علیھم شھیدا	پلٹنے والے رہے جب سے
ما دمت فیھم الیٰ قولہ	آپ ان سے جدا ہوئے تو میں
الحکیم۔	کہوں گا جیسا کہ عبد صالح
	(عیسیٰ) نے کہا تھا کہ میں ان
	پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں
	تھا۔ آخر آیت۔

تقریباً یہی حدیث ج ۲ صفحہ ۶۹ کتاب التفسیر میں سورۂ مائدہ کے ذیل میں باب وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم الآیۃ میں مذکور ہے۔ بس اس میں اصیحابی ہے جس کے معنی ہوئے میرے پیارے اصحاب اور اس کے بعد قدرت کی طرف سے جواب میں اس فقرہ کا اضافہ ہے کہ:۔

انک لا تدری ما	آپ کو نہیں خبر کہ انھوں نے
احدثوا بعدک فاقول	آپ کے بعد کیا گل کھلائے؟
کما قال العبد الصالح	اس پر میں وہ کہوں گا جو عبد صالح
کنت علیھم شھیدا	نے کہا تھا کہ میں ان پر گواہ تھا
ما دمت فیھم فلما	جب تک کہ میں ان میں تھا، تو
توفیتنی فیقال ان ھؤلاء	جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو

لم يزالوا مرتدين على اعقابهم منذ فارقتهم

خود ہی ان کا نگران تھا، تو کہا جائے گا کہ یہ لوگ جب سے آپ ان سے جدا ہوئے برابر اپنے پچھلے پیروں پر پلٹتے ہوئے رہے

یہ روایت ج ٨ صفحہ ١٣٦ باب کیف الحشر میں اس طرح ہے کہ :-

عن ابن عباس قال قام فينا النبي يخطب فقال انكم محشورون حفاة عراة كما بدأنا اول خلق نعيده الآية وان اول الخلائق يكسى يوم القيامة ابراهيم وانه سيجاء برجال من امتي فيؤخذ بهم ذات الشمال فاقول يارب اصيحابي فيقول انك لا تدري ما احدثوا بعدك فاقول كما قال العبد الصالح وكنت عليهم شهيدا

جناب ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ رسولؐ ہم میں خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے کھڑے ہوئے اور اس موقع پر یہ فرمایا کہ تم لوگ محشور ہوگے ننگے پیر برہنہ "جس طرح ہم نے پیدا کیا تھا پہلے اسی طرح دوبارہ لائیں گے" (آیۃ) تا آخر آیت۔ اور سب سے پہلے روز قیامت جس کو لباس ملے گا وہ ابراہیمؑ ہوں گے اور کچھ لوگوں کو میری امت میں سے لایا جائے گا تو انھیں بائیں طرف پہنچا دیا جائے گا اس پر میں کہوں گا پروردگارا یہ میرے پیارے اصحاب ہیں تو ارشاد

ما دمت فیھم الی قولہ	ہوگا کہ آپ کو نہیں خبر انھوں
الحکیم قال فیقال	نے آپ کے بعد کیا گل کھلائے
انھم لم یزالوا	تو میں کہوں گا جیسا بندۂ صالح
مرتدین علی اعقابھم	(عیسیٰ) نے کہا تھا کہ میں ان پہ گواہ تھا۔ جب تک کہ میں ان میں تھا تا آخر آیت۔ تو کہا جائے گا کہ یہ لوگ برابر اپنے پچھلے پیروں پر پلٹتے ہوئے رہے

جلد ۴ صفحہ ۱۲۹ - باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا میں بھی یہ روایت اس طرح ہے جس طرح پہلے درج ہوئی۔

اس حدیث کو مسند امام احمد بن حنبل مطبوعہ دار المعارف مصر ج ۳ صفحہ ۳۵۰ پر مسند ابن عباس میں درج کیا ہے اور اس میں یہ ہے کہ پیغمبر خدا موعظہ کے لیے کھڑے ہوئے اور یہ فرمایا۔

پھر جلد ۴ صفحہ ۷۶ پر اور صفحہ ۷۷ پر دو طریق سے ہے اور صفحہ ۹۴ پر بطور اختصار ہے کہ :-

عن ابن عباس قال	ابن عباس کہتے ہیں کہ میں
سمعت رسول اللہ ص	نے پیغمبر خدا کو فرماتے سنا
یقول انا فرطکم علی	کہ میں حوض پر تمہارا پیشرو
الحوض فمن ورد افلح	ہوں گا۔ جو وہاں وارد ہوگا وہ
ویؤتی باقوام فیؤخذ	فلاح پائے گا اور کچھ لوگ

بھم ذات الشمال فاقول ای رب فیقال ما زالوا بعد ک یرتدون علی اعقابھم۔

لائے جائیں گے تو انھیں بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار یہ کیا ہے تو کہا جائے گا۔ یہ لوگ برابر پچھلے پیروں پلٹتے رہے۔

یہی حدیث بطور تفصیل جامع ترمذی مطبوعہ کانپور ج ۲ صہ ۶۸ پر ابواب صفۃ القیامۃ میں باب ما جاء فی شان المحشر میں ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس بارے میں ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ اور یہ حدیث حسن ہے۔ دوسری جگہ صفحہ ۱۵۱ پر باب التفسیر میں اسے درج کیا ہے۔ اس طرح کہ پیغمبر خدا موعظہ کے لیے کھڑے ہوئے اور یہ ارشاد فرمایا۔ آخر میں اس کے متعدد طرق کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے "ھٰذا حدیث حسن صحیح" "یہ حسن و صحیح حدیث ہے"

(۲)

صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱ - باب فی الحوض میں ابو ہریرہ کی روایت ہے :-

عن النبی قال بینا انا قائم اذا زمرۃ حتی اذا عرفتھم خرج رجل من بینی و بینھم فقال

پیغمبر خدا نے فرمایا میں کھڑا ہوں گا اور اس دوران میں ایک گروہ میرے سامنے آئے گا یہاں تک کہ جب میں انھیں

هلم فقلت این قال
الی النار واللہ قلت
ما شانهم قال انهم
ارتدوا بعدك علی
ادبارهم القهقری
ثم اذا زمرة حتی
اذا عرفتهم خرج رجل
من بینی وبینهم فقال
هلم قلت این قال
الی النار واللہ قلت
ما شانهم قال انهم
ارتدوا بعدك علی
ادبارهم القهقری
فلا اراه یخلص منهم
الا مثل همل النعم۔

پہچانوں گا تو ایک شخص میرے
اور ان کے بیچ میں آجائے گا
اور کہیگا آؤ چلو! میں کہوں گا
کہاں؟ وہ کہے گا خدا کی قسم
آگ کی طرف۔ میں نے کہا
کیوں؟ ان کا کیا واقعہ ہے؟
وہ کہے گا کہ یہ آپ کے بعد
پچھلے پیروں پلٹ گئے۔ پھر
دوسرا گروہ سامنے آئے گا،
اسے بھی میں پہچانوں گا اور اسی
طرح ایک شخص میرے اور
ان کے درمیان نکلے گا۔ اور
کہے گا آؤ چلو! میں کہوں گا
کدھر؟ وہ کہے گا بخدا آتش
جہنم کی طرف۔ میں کہوں گا
ان کا کیا واقعہ ہے؟ تو وہ یہی
کہے گا کہ یہ آپ کے بعد پچھلے پیروں
پلٹ گئے تھے۔ تو ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ان میں سے نجات
نہیں پائیں گے مگر شاذ و نادر جیسے
کچھ چوپائے گلے میں سے الگ رہ
گئے ہوں۔

مسلمان ذرا غور سے اس حدیث کو دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ نجات یافتہ اکثریت ہے یا اقلیت اور اب اگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام ایسا بتائیں کہ ارتد الناس بعد رسول اللہ الا ثلثۃ یا خمسۃ یا سبعۃ تو یہ صحیح بخاری کی اس حدیث کے بالکل مطابق ہے یا اس کے خلاف ؟

ارتداد کی نوعیت

بس آخر میں صحیحین کی ایک حدیث سن لیجیے جس میں بعد رسول صحابہ میں ارتداد کا جو نشا ہے اس کا اظہار ہو جاتا ہے اور اس سے سمجھنے والے کو سب کچھ سمجھ میں آسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری ج ۸ صفحہ ۱۵۱۔ باب فی الحوض عقبہ کی روایت ہے کہ:

ان النبی ص خرج یوما فصلی علی اہل احد صلوتہ علی المیت ثم انصرف علی المنبر فقال انی فرط لکم وانا شہید علیکم وانی واللہ لانظر الی حوضی الآن وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض

پیغمبر خدا ص ایک دن مکان سے برآمد ہوئے اور شہداء احد کے لیے نماز جنازہ کی طرح نماز کی صورت میں دعائے خیر کی۔ پھر اپنے منبر کی طرف تشریف لائے اور بالائے منبر ارشاد فرمایا کہ میں تمہارا پیش رو ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں اور بخدا میری

او مفاتیح الارض وانی
واللّٰہ ما اخاف علیکم
ان تشرکوا بعدی
ولکن اخاف علیکم
ان تنافسوا فیہا

اس وقت آنکھوں میں پھر رہا
ہے وہ منظر جب میں حوض پر
ہوں گا اور مجھے ملی ہیں تمام
خزائن زمین کی کنجیاں یا یوں
فرمایا کہ تمام زمین کی کنجیاں
اور بخدا مجھے تمہارے متعلق
یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد
مشرک ہو جاؤ گے لیکن اندیشہ
یہ ہے کہ تم دنیا طلبی میں آپس
کی کشاکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

یہی حدیث صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۰۵ کتاب الفضائل باب
اثبات حوض نبینا وصفاتہ میں ہے اور وہ حدیث
بعینہٖ درج کرنے کے بعد ایک دوسری حدیث اسی مضمون
کی کچھ الفاظ کی کمی اور بعض فقرات کے اضافہ کے ساتھ درج کی
ہے۔ اس میں ہے کہ :-

صلی رسول اللّٰہ علیٰ
قتلی احد ثم صعد
المنبر کالمودع للاحیاء
والاموات فقال انی
فرطکم علی الحوض
وان عرضہ کما بین
ایلۃ الی الجحفۃ انی

پیغمبرؐ نے شہدائے احد
پر نماز پڑھی - پھر منبر پر تشریف
لے گئے جیسے کہ آپ زندوں
اور مُردوں سب کو رخصت کر
رہے ہوں - فرمایا میں حوض
پر تمہارا پیش رو ہوں اور اس
کی چوڑائی ایسی ہے جیسے ایلہ

لست اخشیٰ علیکم ان تشرکوا بعدی ولکنی اخشیٰ علیکم الدنیا ان تنافسوا فیہا و تقتتلوا فتہلکوا کما ہلک من کان قبلکم قال عقبة فکانت اخر ما رأیت رسول اللہ علی المنبر

سے لے کر مجھ تک - مجھے تمہارے متعلق یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے مگر یہ اندیشہ ہے تمہارے متعلق کہ تم دنیا میں پڑ کر ایک دوسرے سے کشاکش میں گرفتار ہو گے اور آپس میں لڑو گے اور ہلاک ہو گے جیسا کہ ہلاک ہوئے وہ جو تمہارے پہلے تھے - عقبہ (راوی حدیث) کا بیان ہے کہ یہ آخری موقع تھا جب میں نے رسول ؐ کو منبر پر دیکھا یعنی اس کے بعد حضرت ؐ کی وفات ہو گئی -

یہ حب دنیا کس صورت میں ظاہر ہونے والا تھا ؟ اسے بھی ملاحظہ فرمایئے -

صحیح بخاری ج ۹ کتاب الاحکام باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ -

عن ابی ھریرۃ عن النبی قال انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامة یوم القیامة

ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ پیغمبر نے فرمایا کہ تم بہت جلد میرے بعد حکومت کی لالچ میں مبتلا ہو جاؤ گے

فنعم المرضعة وبئست الفاطمة۔ | اور یہ قیامت کے دن پشیمانی کا باعث ہوگا تو آغاز کتنا اچھا اور انجام کتنا برا ہے۔

بس اب ان صحیحین کی حدیثوں کے بعد کچھ کہنا نہیں ہے۔ یہ طالبان حقیقت کو حقیقت تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط المستقیم ؁

maablib.org

شیعیت کا تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین واٰلہ الطیبین الطاہرین۔

چونکہ شیعی دعوت، شیعی مذہب اور فرقۂ شیعہ کے متعلق بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور بہت سے افراد نیک نیتی کے باوجود ناواقفیت کی بنا پر تاریکی میں مبتلا ہیں اس لئے یہ رسالہ حقیقت امر کو بے نقاب کرنے کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نیک دل اشخاص سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں اور مخالفت بھی کرنا چاہیں تو سمجھ کر مخالفت کریں۔

لیہلک من ہلک عن بینۃ ویحییٰ من حی عن بینۃ

شیعی دعوت کیا ہے؟

شیعی دعوت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وہ وہی اسلام ہے جس کیلئے انبیاء کی دعوت رہی۔ کتب سماوی کی دعوت رہی جو پیغمبر اسلام کی حقیقی دعوت تھی اور قرآن کی حقیقی دعوت تھی۔

یہی وہ دعوت تھی جس کی خاطر انبیاء و مرسلین نے زحمتیں اٹھائیں۔ حضرت خاتم المرسلین ؐ نے جس کی وجہ سے ایذائیں سہیں اور قربانیاں پیش کیں۔

اس دعوت کے محافظ رسول ؐ کے بعد آل رسول ؐ رہے اور چونکہ شیعہ کے معنی عربی میں متبعین اور پیروؤں کی جماعت کے ہیں اس لئے جو اس دعوت کی اصل حقیقت پر برقرار ہے وہ شیعۂ آل رسول ؐ یا شیعۂ علی ؑ کہلاتے ہیں۔

اسلام کے معنی

اسلام کے معنی لغت میں دو ہیں۔ ایک سر نہادن بطاعت یعنی اللہ کے سامنے اطاعت کے لئے سر جھکا دینا" اور دوسرے "سپردن" یعنی اپنے کو اللہ کے سپرد کر دینا۔

ان دونوں کا نتیجہ یہی ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلہ میں انسان کا حق خود ارادی خواہ شخصی ہو یا جمہوری کوئی چیز نہیں ہے۔ حاکم مطلق صرف اللہ ہے اور جسے وہ اپنا نائب بنائے صرف اس کی اطاعت انسان کے لئے فرض ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا حق حکومت نہیں رکھتا اور جو حکومت اس کے مقابلہ میں قائم ہو وہ حکومت ناجائز ہے۔

یہی اسلام ہے اور اسی کا نام شیعیت ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد

اور

انبیاء و مرسلین کا مشن

کائنات عالم میں ہر شے خالق فطرت کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے یہ فطری اسلام ہے جس سے عالم کا کوئی ذرۃ خارج نہیں ہے۔

انسان بھی کائنات عالم کا ایک جزو ہونے کے اعتبار سے اپنے نظام تخلیق اور نشو و نما میں کم سنی سے لے کر جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گزرتا ہوا موت کے ہنگام تک مثل دنیا کی تمام چیزوں کے ایک قہری تحریک کی پابندی کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور اس میں مومن اور کافر کا فرق نہیں ہے۔ مگر

انسان میں اس کے شایان شان امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے ایک ارادہ واختیار کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس اختیار کی بدولت کبھی کبھی احکام خدا سے سرتابی بھی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہاں اللہ کی مرضی اس کے سامنے تعلیمات کی شکل میں آتی ہے۔ اور اگر وہ ان تعلیمات کو قبول کرتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے تو مومن اور نیکو کار قرار پاتا اور اگر ان احکام سے انکار کرتا اور ان کی تعمیل میں غفلت برتتا ہے تو کافر اور گنا ہگار ٹھہرتا ہے۔ انبیاء و مرسلین آئے تھے انسانوں کو انہی تعلیمات کے پہنچانے کے لئے اور مقصد یہ تھا کہ انسان خود اختیاری طور پر بھی اسی کی حکومت کو تسلیم کرے جس کی قہری طور پر وہ اپنے نظام فطرت میں اطاعت کرتا ہی ہے۔ یعنی اس کی اختیاری کارگزاری اس کے فطری نظام زندگی کے مطابق ہو جائے۔ اس کے نظام حیات میں یہ دو عملی نہو کہ فطری طور پر تو وہ اللہ کا محکوم ہے۔ اور ارادی طور پر وہ اپنے امکان بھر کسی دوسرے کا محکوم ہو یا خود اپنی جگہ حاکم بن بیٹھے۔ اسی کا نام وہ اسلام ہے جسے انبیاء لے کر آئے۔ ان کا نصب العین تھا انسانوں کو حکومت الٰہیہ کا احساس پیدا کرانا ارادی طور پر اس کے وفادار رعایا ہونے کا اقرار لینا اور اس کے عملی تقاضوں کا پورا کرانا۔

اس کے مقابلہ میں حاکم بننے والے وہی تھے جو خدائی کے دعویدار ہوئے جیسے فرعون، نمرود اور شداد اور اللہ کے سامنے دوسروں کی اطاعت کرنے والے ان سلاطین کی رعایا وہ عوام تھے جو انہیں خدا مان رہے تھے۔

یہ زعم خدائی کبھی الفاظ کے قالب میں آگیا اور کبھی زبان سے تو خدائی کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ مگر اس کے احکام کے مقابلہ میں مطلق العنانی اور سرکشی کے عملی مظاہرات اسی زعم کی غمازی کرتے رہے اور باطل جبروت

کی اندھا دھند نمائشیں اپنے پس منظر میں زعم خدائی ہی کا پتہ دیتی رہیں

انبیاء و مرسلین کی تمام جنگ ایسے ہی خدایان باطل اور ان کے پرستاروں سے رہی۔ ہمیشہ لڑائی اسی کی تھی کہ انبیاء چاہتے تھے کہ دنیا حکومت الہیہ کے سامنے سر جھکا دے اور غلط طاقتوں کے علم بردار اس حکومت کے ماننے سے انکار کرتے تھے۔

شاہی، شہنشاہی اور جمہوریت جتنی قسم کی حکومتیں سیاسی دنیا میں مروج ہیں، ان سب کی بنیاد انسانوں پر خود انسانوں کی حکومت کا تخیل ہے یہ حکومت ایک فرد کی ہو یا بہت سے افراد کی ملا کر بہرحال اس خداوندی حق اقتدار کے خلاف ہے جس کے قائم کرنے کا اسلام علمبردار ہے

اس بارے میں اگر افراد انسانی کا اجماع اور شور نے کوئی وزن رکھتا ہو تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر نبی اور رسول کے مقابلہ میں اس وقت کے خطا کار انسانوں کا ہمیشہ ایسا زبردست اجماع رہا جس سے بڑھ کر مشکل ہی سے کوئی اجماع بنایا جا سکتا ہے۔ اگر انسانوں کی اکثریت کا کسی امر پر متفق ہو جانا حقانیت کی دلیل ہوتا تو انبیاء کی نبوتیں اور مرسلین کی رسالتیں سب بے حقیقت ہو جاتیں۔ انبیاء کا تو کام ہی یہ تھا کہ وہ غلط اجماعوں کو اپنی ہدایت سے شکست دیں، اکثریت کے طلسم کو توڑیں اور اس حقیقت سے روشناس بنائیں جو جمہور کی نگاہ سے اوجھل ہے۔

حاکم حقیقی خود ساختہ یا دم ساختہ حاکموں کا تصادم ہی تھا جو خلقت آدم کے بعد سے برابر اسلام اور کفر کی صورت میں نمودار رہا۔

یہ اسلام اور کفر کی جنگ حقیقت میں آزادی اور غلامی کی جنگ تھی۔ غلامی ناجائز دباؤ کی جا ہے وہ نفسانی خواہشیں کیوں نہ ہوں گر اس میں بھی انسان کا ضمیر محسوس کرتا ہے کہ میں غلط کر رہا ہوں گر

ہوا و ہوس کی قوت سے اپنے کو مجبور سمجھتا ہے ۔ یہ فعل اس کا آزادی کے ماتحت نہیں بلکہ گرفتاری کے نتیجہ میں ہوتا ہے ۔ پھر اس کے آگے طاقت کی غلامی، اکثریت کے دباؤ کی غلامی، تیر و تفنگ کے ڈر سے، فوج و لشکر کے دباؤ سے اور قید و بند کی دہشت سے کسی غلبہ و اقتدار کی غلامی ۔ اسلام ظاہر میں اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا تھا ۔ مگر اس اللہ کی بندگی کے پس پشت اس قسم کے ہر دباؤ سے آزادی تھی جو انسانی ضمیر کو راہِ راست سے خلاف چلنے پر مجبور کرے ۔ خواہ وہ ایک فرد کی حکومت ہو یا جماعت کی یا اپنے نفسانی خواہشات کی ۔ اسلام ان سب سے آزادی کا پیغام ہے ۔ وہ ضمیر کی حریت کا نام ہے جس میں قانون صرف عدل و اعتدال، نیکی اور فلاحِ عام کے اسباب کی ذمہ داری ہے ۔ یہاں کوئی تخت و تاج اور حشم و خدم کا مالک بھاری بھرکم تن و توش رکھنے والا پیش نظر نہیں ہوتا ۔ جو ضمیر کو مجبور کر کے اس ضمیر کے تقاضے کے خلاف اپنی اطاعت کرائے ۔ بلکہ احساسات کے حدود سے باہر ایک ان دیکھی طاقت ہے جو انسان کو ہر اچھائی کی تحریک کرتی ہے اور ہر برائی سے روکتی ہے جس کا ایک ترجمان خود ہر ایک کا عقل و ضمیر ہے اور جس کے احکام ہمیشہ اس ضمیر کی آواز کے مطابق ہونے میں "یہ حاکم اللہ ہوتا ہے" اور اس کا قانون وہ ہے جسے قرآن نے جامع الفاظ میں اس طرح بتایا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۔ اللہ کا فرمان عدل ہے اور احسان اور جن جن سے جو رشتہ ہو اس کے تقاضوں کا پورا کرنا اور ممانعت ہے ہر بے اعتدالی، بدی

اور سیاہ کاری سے"

انبیاء و مرسلین صرف اسی حکومتِ عدل کے احکام کی ترجمانی کرتے تھے انہوں نے کبھی خود اپنے کو حاکم نہیں کہا اور اسی لئے انبیاء کیلئے یہ ضروری ہوا کہ وہ جذبات سے بری اور ہوا و ہوس کی قید سے آزاد ہوں۔ ایسے ہی انسان کو معصوم کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ شخص خود نفسانیت میں گرفتار ہو تو وہ خلائق کو اس آزادی سے متعارف نہیں بنا سکتا جو اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔ پھر ممکن ہے کہ وہ خود حاکم ہونیکا خواب دیکھنے لگے اور اس طرح دنیا کو اللہ کے بجائے خود اپنے سامنے سر جھکانے کی دعوت دے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں اس خطرہ کا اظہار کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اللہ کے فرستادہ نبی اور رسول اس سے بری ہوتے ہیں کہ وہ خلائق کو اللہ سے ہٹا کر خود اپنا غلام بنانے کی کوشش کریں۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (آل عمران)

بلاشبہ جب حاکم غیر معصوم یعنی ہوا و ہوس میں گرفتار ہوگا تو اس سے یہ خطرہ ہمیشہ لگا رہیگا اور ایسے حاکم کو تسلیم کرنا الٰہی حکومت کے تقاضوں کے خلاف ہوگا۔

خداوندی آمریت کیلئے خدا اور رسولؐ کے اعلانات

انسان کی انسان پر جس طرح کی بھی حکومت ہو، خواہ آمریت، خواہ جمہوریت سب غلط ہے۔ انسان پر آمریت حاصل ہے تو صرف اللہ کو

اس کا اس کتابِ محکم میں جو پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم پر نازل کی گئی بار بار اعلان ہوا۔ یہ قرآن کی آیات اتنی واضح اور صاف ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

ارشاد ہوا۔ لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ "خلق کرنا بھی اللہ کا کام ہے اور آمریت بھی اس سے مخصوص ہے" اس کے مقابلہ میں انسان کی کسی طرح کی خود مختاری اور خود رائی نہ انفرادی اور نہ شوریٰ درست ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة	کسی ایماندار مرد یا عورت کو یہ حق
اذا قضی اللّٰہ ورسولہ امرا ان	نہیں کہ جب اللہ اور رسولؐ کسی
یکون لھم الخیرة من امرھم	بات کا فیصلہ کردیں تو پھر انہیں اپنے
ومن یعص اللّٰہ ورسولہ فقد	معاملہ میں کچھ بھی اختیار حاصل ہو۔ اور
ضل ضلالا مبینا (احزاب)	جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی
	کریگا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔

یہاں تک کہ رسولؐ کی بھی اطاعت کا حکم ہوا تو یہ کہدیا گیا۔ کہ

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ	جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے
(آل عمران)	حقیقتاً اللہ کی اطاعت کی۔

یعنی رسولؐ کی بھی حکومت اللہ کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جانب سے بحیثیت نائب ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کے ذہن میں اللہ کے سوا کسی دوسرے حاکم کے وجود کا تصور نہ ہو۔ اب رسولؐ کے بعد بھی جن اولی الامر کی اطاعت ہوگی وہ وہی ہونگے جنہیں اللہ اپنی طرف سے نیابت عطا کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا :۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ	اللہ ہی خلق کرتا ہے جو چاہتا ہے

اور منتخب کرنا بھی اسی کا کام ہے

اسی نیابت کے لحاظ سے جو اللہ کی طرف سے حاصل تھی پیغمبر خدا ص کی آمرانہ شان کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا ہے کہ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ — "رسولؐ کو مومنین پر خود ان کے نفوس سے زیادہ اختیار ہے"

اور اسی کا اقرار رسول ص نے ہزاروں کے مجمع میں دفتہً غدیر خم خود مسلمانوں سے کرایا - ان الفاظ میں کہ :-

اَلَسْتُ اَوْلٰی بِكُمْ مِنْ اَنْفُسِكُمْ — "کیا مجھے تم سب پر تمہارے نفوس سے زیادہ حق نہیں ہے ؟"

سب نے کہا بلیٰ یعنی کیوں نہیں - ضرور آپؐ کو زیادہ حق ہے

یہ اقرار خود ان تمام مسلمانوں کی جانب سے خدا و رسولؐ کی آمریت کے مقابلہ میں اپنے جمہوری و خود ارادی تصورات کی نفی اور اس حق کے سلب ہونے کا اعتراف تھا -

مسلمانوں کے بالاعلان اس اعتراف و اقرار کی بنا پر ہی پیغمبر خدا ص نے اپنے بعد کے لئے اعلان فرمایا :-

مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاهُ — جس کا میں مولا ہوں، اس کا علیؑ بھی مولا ہے -

اس اعلان کے پس منظر کو دیکھنے کے بعد صاف نظر آجاتا ہے کہ علیؑ کی اس ولایت کو تسلیم کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کی آمریت مطلقہ کو تسلیم کرنے کا جو حقیقت اسلام ہے لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی کا نام "شیعیت" ہو گیا - تو وہ کیا اسلام سے الگ کوئی چیز ہے ؟ یا حقیقت یہ ہے کہ اسلام شیعی دعوت ہے - اور

شیعی دعوت عین اسلام ہے۔

اسلام میں دو فرقوں کی بنیاد

نبوت و رسالت کے عنوان سے الٰہی حکومت اور انسانی اقتدار کی جنگ کا آخری مورچہ تھا۔ جسے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ نے فتح کر کے لا الٰہ الا اللہ کی آواز اتنی قوت کے ساتھ عالم انسانیت تک پہنچادی کہ اب الٰہی اقتدار کے مقابلہ میں مادی اقتدار کے پرستاروں کو کھل کر سامنے کھڑے رہنے کی تاب نہ رہی اس لئے انہوں نے کلمہ پڑھ کر قبول اسلام کا اعلان کر دیا اور غدیر میں بھی پیغمبرؐ کے سوال کا جواب اقرار کی صورت میں دے دیا۔ مگر ان کی ذہنیت پورے طور سے بدلی نہ تھی اس لئے اب انہوں نے خود اسلام کے اندر "جمہوریت" کے نام سے ایک مکتب خیال کی بنا قائم کر لی۔ جس کا نصب العین تھا الٰہی اقتدار کے بجائے انسانوں کے لئے حق خود ارادی قائم کرنا اور مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ مادی دلفریبی کی وجہ سے اس کا گرویدہ ہو گیا۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کے محافظین الٰہی اختیارات کے مقابلہ میں انسانی اقتدار کی کلیتہً نفی کے علم بردار رہے

یہ اختلاف تھا جو اب تک سنی اور شیعہ فرقوں کے نام سے قائم ہے

ہمارا جرم

ہمارا بنیادی جرم فقط یہ ہے کہ ہم ثبات قدمی کے ساتھ الٰہی حکومت

کے وفادار رہے اور اسی کو صحیح تسلیم کرتے رہے۔ اسی کا نام تَوَلّا ہے اور ان حکومتوں کو جو خدا و رسولؐ کے مسلسل اعلانات اور قرآن وحدیث کے بلند بانگ تصریحات کے خلاف انسانی اختیارات کے کام میں لاکر قائم ہوئیں ناجائز سمجھتے رہے۔ اسی کا نام تَبَرّا ہے جس کو ہمارے مخالف طرح طرح کے بدنما لباسوں میں پیش کرتے رہے ہیں اور اسے ہمارے کفر کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کفر ہے تو وہی کفر جس کی دعوت ہمیں اسلام نے دی ہے (وَمَن یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَیُؤْمِن بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا)

ہماری اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کفر پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرے اور اس عروۃ الوثقیٰ (مضبوط رسی) سے متمسک رکھے جو کبھی شکستہ ہونے والا نہیں ہے۔

ہمارا دوسرا جرم

رسول اللہؐ کے دور میں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ اور پیغمبر خداؐ کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی ان سب کے لئے ایک اصطلاحی لفظ صحابہ کا قرار پاگیا ہے۔

یہ صحابیت ہمارے نزدیک بھی ایک شرف ہے اور بہت بڑا شرف۔ مگر اس شرف کے کچھ عملی تقاضے بھی ہیں۔ جن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منہ دیکھے کی محبت کوئی چیز نہیں۔ اصل وفاداری اور دل ودماغ کے لحاظ سے رسولؐ کے مشن کے ساتھ وابستگی کا ثبوت یہ ہے کہ رسولؐ کے دنیا سے اٹھنے کے بعد بھی ان کے ارشادات اور اعلانات کے ساتھ وفاداری قائم رکھی جائے۔

ہمارا قصور یہی ہے کہ ہم نے صرف ابتدائی حالات یا اسلامی خدمات کو بھی (اگر وہ کچھ ہوں) قابل اعتبار نہیں سمجھا - بلکہ ہم ان صحابہ کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے سرِ عقیدت جھکاتے ہیں - جو پیغمبرِ خدا کے بعد بھی برابر ان کے وفادار رہے ہوں اور اس اسلامی نظام سے غداری کے مرتکب نہ ہوئے ہوں - جسے الٰہی حکومت کی شکل میں پیغمبرِ خدا نے قائم کیا تھا۔

ہم نے اصول کو سامنے رکھا ہے اور اصول کے مقابلہ میں شخصیتوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتے - نہ حق کے مقابلہ میں کثرتِ تعداد کا کوئی وزن سمجھتے ہیں - اس کو ہمارے مخالف بغضِ صحابہ کے نام سے ہمارا بڑا جرم قرار دیتے ہیں - حالانکہ اگر صحابیت ہی کے معیار پر دیکھا جائے تب بھی تو اہلبیت رسولؐ شرفِ صحبت میں سب سے مقدم نظر آئیں گے جن کی محبت کو قرآن و حدیث کے رو سے ہم جزوِ ایمان سمجھتے ہیں پھر آخر ان کی محبت محبتِ صحابہ کیوں نہ قرار پائے - اور جنہوں نے ان سے مخالفت کی، انہیں ایذائیں پہنچائیں اور طرح طرح کے مظالم کئے وہ بغضِ صحابہ کے مجرم کیوں نہ قرار پائیں۔

تعلیماتِ اسلامیہ کے دو مکتب

اور

ہمارا ایک اور بڑا جرم

معاملہ اگر فقط سلطنت و حکومت کا ہوتا تو اسے ایک زمانۂ خاص کی چیز سمجھ کر کم از کم اب نظر انداز کیا جا سکتا تھا - جیسا کہ بعض 'اتحاد پسند' افراد یہ کہہ کر اب "رفت و گذشت" کی دعوت دیتے ہیں کہ اب نہ دنیا

میں ابوبکرؓ ہیں اور نہ علیؑ سامنے موجود ہیں۔ اب یہ جھگڑا کیوں۔ کہ ان میں سے کس کی خلافت درست تھی؟ مگر بات تو فقط اتنی نہیں ہے، چونکہ اسلام میں دین و دنیا الگ نہیں اور یہاں صحیح سیاست مذہب سے جدا کوئی چیز نہیں۔ اس لئے پیغمبر اسلامؐ نے منجانب اللہ جس طرح اپنے بعد کے لئے ایک نظامِ حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا تھا اسی طرح تعلیماتِ اسلامی "کتاب اور سنت" کے صحیح علم کا مرکز بھی بتا دیا تھا کہ وہ یہی افراد ہیں۔

اس اعلان کے مختلف انداز تھے۔ کبھی ارشاد ہوا:۔

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔ جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے"

کبھی فرمایا:۔

مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا ومن تخلف عنھا غرق وھوی

"میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے۔ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے الگ ہوا وہ غرق ہوا"

کبھی فرمایا:۔

انا مدینۃ العلم و علی بابھا فمن اراد العلم فلیأت الباب

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔ جو علم کا طلبگار ہے

نسے دروازے پر آنا چاہیے۔"

پیغمبر خدا کے بعد جب مسلمانوں کی اکثریت نے نظامِ حکومتِ اسلامی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنا سیاسی مرکز الگ بنایا تو اب سیاسی مصالح اس کے متقاضی ہوئے کہ ان شخصیتوں کو جو ایک "محاذِ مخالف" کی حیثیت رکھتی ہیں ہر حیثیت سے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کیا جائے اور انکی اہمیت کو ختم کر دیا جائے۔ اس لیئے انہوں نے "تعلیماتِ دینی" کے لیے بھی دوسرے مرکز تلاش کیے۔ مگر رسول نے بمنشائے الٰہی جب کہ ان علوم کا خزانہ دار مخصوص افراد کو بنا دیا تھا تو انہیں یہ مرکز ملتے کہاں۔ لہٰذا جمع قرآن کے لیئے زید بن ثابت وغیرہ ایسے نو عمر صحابیوں کے خدمات حاصل کیے۔ تفسیر قرآن میں انبیائے سلف کے واقعات کے لیئے نو مسلم علمائے یہود جیسے کعب الاحبار اور عبد اللہ بن سلام کے اوہامی روایات سے اپنے معلومات کے دامن کو وسیع کیا۔ احادیث رسول کے لئے ابو ہریرہ وغیرہ ایسے بیباک اور جسور اشخاص کے حکایات و روایات کا سہارا لیا اور یہاں تک کہ فقہ اسلامی کی تدوین کا کام دوسری صدی تک نہ ہو سکا۔ اور بالآخر سوڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہونے والے امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل پر انحصار کیا گیا۔ جن میں سے سوا امام مالک کے سب رسول کے محل ولادت اور محل اقامت یعنی مکہ اور مدینہ دونوں سے دور سرزمین عراق پر متولد ہوئے وہیں رہے اور وہیں مختلف الخیال علماء سے تحصیل علم کر کے اپنی اپنی رائے سے انہوں نے اختلافی مسائل میں کسی ایک شق کو اختیار کر لیا۔ مگر رسول اللہ کی معصوم ہستی کے بعد جنہوں نے اپنی خود مختاری کو قائم رکھ کر رسول کے ارشادات کو من وعن تسلیم نہ کیا۔ انہوں نے اب اختلافات سے گھبرا کر مذہب کے بارے میں ان جائز الخطا مجتہدین کی فتووں کو نہ صرف ان

کے دور کے لئے بلکہ قیامت تک کے واسطے واجب العمل قرار دیدینا ضروری سمجھا۔

ہمارا جرم اور بہت بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے رسول اللہؐ کے بعد جس طرح حکومت کا حقدار صرف انہی کو سمجھا جن کے لیئے خدا اور رسولؐ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اسی طرح دینی تعلیمات کے باب میں بھی صرف انہی کی رہنمائی قبول کی۔ جہاں تک ان کے ارشادات کو سمجھنے اور ان سے نتائج نکالنے کا تعلق ہے۔ اس کا ضروری علوم سے واقفیت کے ساتھ ہر دور میں ہر شخص کو حق حاصل ہے اور اس معنی میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے لیکن جہاں تک اصل تعلیمات کے ماخذ کا سوال ہے ہم صرف ان ہی ارشادات کو دینی تعلیمات کا سرچشمہ مانتے ہیں جو قرآن، حدیث رسول اور آل اہلبیت معصومینؑ سے پہنچے ہوں جنہیں پیغمبر نے اپنے علوم کا ورثہ دار بنایا اور بتایا تھا۔

ایک بہت بڑا فرق

علم اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ذوق تحقیق بالآخر حق تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حقیقت تفکر و تدبر سے متنفر نہیں بلکہ اس کی طلبگار ہے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے عقل کی آنکھوں پر پردے نہیں ڈالے بلکہ آنکھیں کھولنے کی دعوت دی۔ اس نے ہمیشہ اہلِ عقل سے غور و فکر نہ کرنے کا شکوہ کیا اور فکر و تدبر کا مطالبہ۔ مگر جبر و تشدد سے قائم شدہ اقتدار ہمیشہ عوام سے قوتِ احساس کے سلب کرنے کے درپے رہا کرتا ہے اور غور و فکر کو خطرہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے غلبۂ اقتدار کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ لہٰذا سب کو یہی ماننا چاہئے اور

جب بھی عوام یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اصل میں ہونا کیا چاہیئے۔ تو نہیں سے غلبہ و اقتدار والا نظام اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلام ؐ کے بعد برسر اقتدار آنے والی حکومت نے مذہب سے عقل کو بے دخل کیا اور یہ اصول قرار دیا کہ بجائے خود حسن و قبح کوئی چیز نہیں ہے۔ حکم حاکم وہ ہے جو حسن اور قبح کا معیار ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دیکھو کیا ہے اور بس جو ہو اسی کو سمجھ لو کہ ایسا ہونا چاہیئے

اس کے برخلاف رسول اسلام ؐ اور انہی کی طرح ان کے بعد اہل بیت رسول ؑ کی یہ تعلیم رہی کہ اصول مذہب عقلی ہیں اور حسن و قبح بھی عقلی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز میں پہلے اپنی عقل پر زور دے کر یہ سمجھو کہ ہونا کیا چاہیئے اور جب یقینی طور پر یہ سمجھ میں آجائے تو یقین کر لو کہ حقیقت میں ایسا ہی ہے بھی۔

اس سے ہمارے اور ہمارے اغیار کے فکر کے زاویئے بدل گئے ہم حسن و قبح کو عقلی سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو ہونا چاہیئے اسی کو مانتے ہیں، اور اس کے خلاف جو ہو اسے غلط جانتے ہیں۔

بے شک تعبدی احکام جن میں ہماری ناقص عقل دسترس نہیں رکھتی ان کو خود عقل ہی کے کہنے سے خالق کے مقرر کردہ معلّم کے ارشادات سے معلوم کریں گے۔ مگر جہاں جہاں عقل بطور خود رہنمائی کرتی ہے وہاں پھر عقل کے فیصلہ کو ہم قطعی حجت و دلیل سمجھتے ہیں۔

سچ پوچھئے تو وہ اصول کہ " یہ دیکھو کیا ہے اور جو ہو اسے حق سمجھ لو" اگر بنیادی طور پر کار فرما ہو جائے تو حق تعالےٰ کے وجود ہی کو ماننا بے بنیاد ہو جائے۔ کیونکہ وہاں "ہے" کے دیکھنے کا بھی امکان نہیں۔ پھر اسے حق کیونکر سمجھیں۔ اس پر یقین کی بنیاد فقط یہی ہے کہ کائنات عالم کے حدوث و

ں کے لئے ضرورۃً ایک خالق و پروردگار کو ہونا چاہئے اور اس لئے ضرور ہے۔

پھر جب دین کا پہلا سنگِ بنیاد صرف عقل کی رہنمائی سے قیام پاتا ہے تو اس کے بعد کبھی بھی عقل کو دین سے بے دخل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

اس کے دُور رس نتائج

انداز فکر کے اس اختلاف نے ہمارے اور ہمارے غیروں کے درمیان اب مبدا سے لیکر معاد تک ایک بہت بڑی خلیج حائل کر دی اور اس کے بعد "امامت و خلافت" ہی میں نہیں بلکہ توحید، رسالت اور معاد تک میں شیعی اور سنی نقطۂ نظر الگ الگ ہو گیا۔ ان میں سے ہر جگہ درحقیقت پیغمبر اسلامؐ کے بتائے ہوئے اسلام کا صحیح عقیدہ وہی ہے جسے "شیعیت" کہتے ہیں اور اس کے خلاف جو عقیدہ ہے وہ اس سے مختلف مکتب خیال کی پیداوار ہے جس نے مذہب کو غیر عقلی بنانا ہی اپنے مصالح کے لحاظ سے ضروری سمجھا۔

ہمارے امتیازی عقائد

یا

اسلام کے حقیقی اصول

توحید:۔

(۱) اللہ ایک ہے۔ محض ایک۔ ہر طرح سے ایک۔ یہ نہیں کہ اس میں ایک ذات ہے اور سات صفات اور یہ سب مستقل قدیم ہیں۔ اور ان نو کا مجموعہ ایک خدا ہے۔ یہ سنیوں کا عقیدہ ہے جو نصاریٰ کی تثلیث

سے تین گنا بڑھا ہوا ہے۔

قرآن نے نصاریٰ کو متنبہ کیا ہے کہ لا تقولوا ثلٰثۃ انما ھو اللہ واحد۔ اسی طرح ہمارا عام مسلمانوں سے یہی تقاضا ہے کہ لا تقولوا تسعۃ انما ھوا الٰہ واحد

اللہ کی ذات ہی ہر طرح کے کمال پر حاوی ہے۔ اس کے لئے ذات کے ماسوا صفات کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) وہ جسم اور جسمانیات سے بری ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کان آنکھ وغیرہ نہیں ہے۔ نہ وہ کسی مکان اور مستقر میں محدود ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہو اور عرش اس کا جسمانی مکان ہو۔

قرآن میں جو الرحمٰن علی العرش استویٰ ہے اس کے معنی غلبہ واقتدار کے ہیں جو خالق کے شایان شان ہے نہ کہ تمکن واستقرار کے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔

ہمارے خلاف محمد بن عبدالوہاب کے پیرو (وہابی) جماعت کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ وہ عرش پر متمکن ہے۔ عرش پر سے اترتا اور آسمانوں کی سیر کرتا ہے اور آسمانِ اوّل پر آکر صدا دیتا ہے کہ کون مجھ سے مغفرت کا طلبگار ہے کہ میں اسے بخش دوں! کون مجھ سے دعا مانگنا چاہتا ہے۔ جس کی دعا میں قبول کرلوں — یہ باتیں شانِ الوہیت کے خلاف ہیں۔ جن کا حقیقتِ اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

۳۔ جبکہ وہ جسمانیت سے بری، مکان وسمت وجہت کی پابندیوں سے برتر ہے تو اسی بنا پر ہم جانتے ہیں کہ آنکھوں سے اسے دیکھنے کا تصور بھی غلط ہے نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ کیونکہ جو شئے آنکھوں سے دیکھی جائے وہ سمت وجہت اور مکان میں محدود بن جائے گی اور یہ بات

شانِ الٰہی کے بالکل منافی ہے اور جبکہ اس کی الوہیت میں حال و مستقبل اور دنیا و آخرت کا کوئی فرق نہیں تو نفی رویت میں دنیا اور آخرت کا فرق قرار دینے کے کیا معنی ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کا اعلان ہے

لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر

ہمارا عقل کے اسی فیصلہ اور قرآن کے اسی اعلان پر ایمان ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے مسلمان قیامت میں اس کے دیدار کی امید لگائے ہوئے ہیں جو تعلیم اسلام اور قرآن کے خلاف ہے۔

(۲) **عدل**۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کا ہر فعل وہی ہوتا ہے جو درست و مناسب اور خیر ہو اور اس کے ہر کام میں کوئی مقصد صحیح مضمر ہوتا ہے کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ نہ ظلم اور شر کا اس میں گزر مانا جا سکتا ہے۔

یہی وہ عقیدۂ **عدل** ہے جو توحید کے بعد ہمارے اصول دین کا ایک جز ہے دوسرے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اللہ قادرِ مطلق ہے۔ لہٰذا وہ جو چاہے کرے اور اس لئے ظلم و جور ہر بات اس کے لئے روا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ جنگل لا دالا وہ اصول ہے جسے قہر و غلبہ کے جواز کے لئے سلاطین با اقتدار نے اپنے اعمال کو محاسبہ کی گرفت سے نکالنے کے مقصد سے وضع کیا ہے اور اسی کو سے جا کر سیاست کے زیرِ سایہ رائج شدہ اسلام کے اصول عقائد میں اللہ پر منطبق کر دیا ہے جو اللہ کی شانِ جلال و کمال کے خلاف ہے۔ اور اسی لئے قرآن نے بار بار اس کے خلاف اعلان کیا ہے۔ کبھی مثبت طور پر اس طرح کہ

تمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا لا مبدل لکلماتہ

"تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور عدالت میں بھرپور ہے اس کی بات کبھی بدلتی نہیں" — اور کبھی منفی صورت سے ان الفاظ

ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ "اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا"
ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ "اللہ کے یہاں ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہے" ہمارا عقیدہ یہی ہے اور یہی حقیقی اسلام کی تعلیم ہے۔

۵- ہمارے نزدیک انسان فاعل مختار ہے اور وہ خود اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ اسی سے اس کو جزا و سزا کا استحقاق ہے۔

اس کے خلاف دوسروں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی افعال کا اصل فاعل پروردگار ہے اور انسان اس کے افعال کا آلۂ کار ہے۔ اس صورت میں اس کو جزا و سزا کا دیا جانا خالق کی طرف سے ظلم قرار پاتا ہے جو اصول عدل کے خلاف ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے۔ وما ظلمھم اللہ ولکن انفسھم کانوا یظلمون "اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ وہ خود اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے"۔ اس طرح صاف فعل ظلم کی اللہ سے نفی کی گئی ہے اور اسے بندوں کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیم یہی ہے۔

نبوّت۔

۶- ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خالق نے خلائق کی ہدایت کیلئے اپنی طرف سے رہبر مقرر کئے۔ ان رہبروں کو انبیاء و مرسلین کہتے ہیں۔ یہ انبیاء و مرسلین انسانی اخلاق و کردار اور بلند اوصاف میں وہ معیاری درجہ رکھتے تھے کہ خلق خدا کے لئے نمونہ بن سکیں۔ اس لئے ان کے افعال میں عمداً اور سہواً کسی طرح بھی کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ انبیاء ہر طرح کے گناہوں سے ہر عمر میں معصوم ہوتے ہیں۔ ان سب میں افضل و برتر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ اور اس لئے آپ کی سیرت مبارک بھی اتنی بلند تھی کہ وہ عام خلق خدا ہی کے لئے نہیں بلکہ

انبیاء و مرسلین کے لئے بھی معیاری نمونہ تھی۔ اور اسی لئے مثل قرآن مجید کے آپ کی سیرتِ طیبہ اور سنتِ مبارکہ بھی قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے قانونِ اسلام کا ایک اہم ماخذ ہے۔

ہمارے خلاف دوسرے مسلمان لفظاً انبیاء کی عصمت کا اقرار کر لیتے ہیں مگر کبھی تو ان کی زندگی کے مختلف حالات کے لحاظ سے تفریق کرتے ہیں کہ رسالت کے بعد وہ معصوم تھے مگر رسالت ملنے سے پہلے گناہ کا وقوع ہو سکتا ہے۔ کبھی افعال و اعمال کی نوعیت اور رسالت اور بشریت کی حیثیتوں میں فرق کرتے ہیں کہ بحیثیت رسول جو اقوال و افعال ہوں وہ غلطی سے بری ہوتے ہیں اور بحیثیت بشر جو ہوں ان میں غلطی کا امکان ہے۔

اسی کا ایک شاخسانہ وہ ہے جو اس زمانہ میں بڑی شدت اختیار کر گیا ہے کہ کتاب خدا یعنی قرآن صرف قانونِ اسلام کا سرچشمہ ہو سکتا ہے اور سنتِ رسولؐ وقتی چیز تھی۔ وہ کوئی ناقابل تبدیلی شے نہیں ہے۔ جس کی پیروی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضروری ہو۔

یہ سب تصورات ہمارے نزدیک شانِ رسالت کے خلاف ہیں پیغمبر کی بشریت کا بلند معیار ہی تو خالق کی طرف سے رسالت کے لئے ان کے مبعوث ہونے کی اصل وجہ ہوتا تھا۔ جیسے قرآن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ اَللّٰهُ یَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ "اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں قرار دے"؟ پھر ان کے کردار میں بشریت کے پہلو کو نیچا اور رسالت کے جنبہ کو اونچا قرار دینا کہاں درست ہو سکتا ہے؟ سنت رسولؐ اور سیرت مقدسہ کی پیروی کی دعوت بھی خود قرآن میں ہی صاف صاف موجود ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (اے رسولؐ)
ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تمہیں دوست رکھیگا۔

اگر صرف قرآن کافی ہوتا تو پیغمبر کی پیروی پر رضائے الٰہی کا انحصار نہ کیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول کے اقوال و اعمال کے مقابلہ میں حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ لگانا خود کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ہے

امامت :-

۷۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح نبوت ورسالت کا تقرر خالق کی جانب سے ہوتا ہے اسی طرح رسول کے بعد حکومت الٰہیہ کے نائب کا تقرر بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کے اجماع و شوریٰ وغیرہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے خالق کا مقرر کردہ تاقیامت قائم ہے۔ دوسرے مسلمانوں نے رسولؐ کے بعد اس اختیار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

قیامت :-

۸۔ قیامت کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے جو قرآن و حدیث پر مبنی ہے کہ جزا و سزا کے لئے اسی جسم اور اسی روح میں دوبارہ تعلق قائم کرکے ہر شخص کو نشاۃ ثانیہ عطا کیا جائے گا۔ اور حساب و کتاب کے بعد اچھوں کو بہشت میں اور بروں کو دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح خود ایک جوہر ہے۔ جو اس جسم سے مفارقت کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کی اکثریت جسم سے الگ روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی اور معاد کے معنی یہ قرار دیتی ہے کہ جزا و سزا کے لئے جسم میں پھر روح پیدا کی جائیگی۔

اس صورت میں عالم برزخ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک ایک مسلمہ حقیقت ہے کوئی شے نہیں رہتا۔

ہم اس کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔

فقہی اختلافات

یہ تو وہ اختلافات تھے جو اصول عقائد سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد مسائل واحکام شرعیہ میں بے شمار اختلافات ہو گئے ہیں۔ جن میں ہمارا مسلک ہمیشہ تعلیم اہل بیت ؑ کے مطابق ہوتا ہے اور دوسرے مسلمان یہ اقرار کرتے ہیں کہ اہل بیت ؑ رسول ؐ کی تعلیم یہی ہے مگر خود عملی طور پر ابو حنیفہ وغیرہ کی پیروی کرتے ہیں۔ جیسے وضو میں ہمارا مسلک پیروں کا مسح جو قرآن مجید کی تعلیم کے عین مطابق ہے اور دوسروں کا مسلک پیروں کا دھونا جو قرآن کے خلاف ہے۔

نماز میں ہمارا طریقہ ہاتھ کھولنا جو اہل بیت رسول ؐ ہی نہیں بلکہ اہل سنت کے بھی چار اماموں میں سے امام دار الہجرہ مالک بن انس کے فتوے کے مطابق ہے جو یقیناً سنت رسول ؐ سے مدینہ منورہ میں قیام کی بنا پر زیادہ واقف ہو سکتے تھے اور سنیوں کا طریقہ ہاتھ باندھنا ہے جو رسول ؐ کی وفات کے ڈیڑھ صدی بعد کوفہ میں پیدا ہونے والے عالموں کے فتوے کے مطابق ہے۔

ایسے ہی دیگر زندگی کے شعبوں کو سمجھنا چاہیے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

حکومتوں کا پروپگنڈا

اور

ہمارے خلاف اتہامات

چونکہ ہم نے خدا ورسولؐ کی وفاداری کے پیش نظران حکومتوں کو تسلیم نہ کیا جو مسلمانوں میں تخت وتاج کی مالک بن گئی تھیں۔ اس لئے ہمیشہ حکومت کی مشینری ہمارے خلاف متحرک رہی۔ ہمارے خلاف طرح طرح کے پروپگینڈے کئے گئے۔ جنہوں نے مستقل اتہامات کی شکل اختیار کرلی اور حکومت کے کاسہ لیس اور اکثریتی خیال کے علما نے انہیں اپنی کتابوں میں درج کردیا۔

یہ اتہامات وہ ہیں جنہیں حقیقت پسند افراد کو ہم سے متنفر بنانے کیلئے ہمیشہ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ پھر اس میں عوام کی اکثریت نے جو ہمارے خلاف تھی ہر دور میں اپنی افواہوں سے اضافہ کیا۔ جن کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ہمارے خلاف نئے نئے اتہامات کی پیداوار بڑھتی رہتی ہے۔

ان میں سے کچھ اتہامات اور ان کے مقابلہ میں جو اصل حقیقت ہے اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ (معاذ اللہ) پشیمان ہوتا ہے۔" یہ ہماری جانب وہ تہمت ہے جسے اپنی کتابوں میں درج کرنے سے سوادِ اعظم کے بڑے بڑے مقدس و متورع علما بھی نہیں جھجکتے۔ حالانکہ ہم اللہ، اس کے ملائکہ، تمام مرسلین اور بندگان صالحین کو گواہ کرکے یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ ہم پر محض تہمت اور افترا ہے۔

یہ بالکل ویسا الزام ہے جیسا نسخ کے عقیدہ کی بنا پر تمام مسلمانوں کے خلاف یہود و نصاریٰ الزام لگاتے ہیں کہ اللہ شریعتوں میں تبدیلی کرتا ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اسے پچھتاوا ہوتا ہے اور اس لئے ایک قانون کو منسوخ کر کے وہ دوسرا قانون نافذ کرتا ہے۔ تمام مسلمان اس کے جواب میں یہی کہتے ہیں کہ نہیں۔ تبدیلی پچھتاوے کی بنا پر نہیں بلکہ حالات و مصالح کی تبدیلی کی بنا پر ہوتی ہے۔ بس اسی طرح ہم تقدیرات الٰہیہ میں بدا کے قائل ہیں جس کے معنی یہی ہیں کہ مصالح و حالات کی تبدیلی سے مقدرات میں تبدیلی کی جاتی ہے۔ اس کی نظیریں تمام مسلمانوں کے متفق علیہ مسلمات میں موجود ہیں آخر مغفرتِ ذنوب، قبولیتِ دعا، شفاعت، صدقہ و خیرات سے ردِ بلا وغیرہ کیا ہے؟ یہ سب احکام میں تبدیلیاں ہی تو ہیں۔ بس اسی کو بدا کہتے ہیں۔ جس کا قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہے کہ "یَمْحُوا اللّٰهُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ اُمُّ الْکِتَابِ" اللہ جو بات چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو بات چاہتا ہے قائم رکھتا ہے۔ اور علم کا اصل خزانہ اس کے پاس ہے اور یہ عقیدہ تو قرآن میں یہود کا بتایا گیا ہے کہ ازل میں اللہ کو جو فیصلے کرنا تھے وہ اس نے کر دیئے۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اور اسکی قرآن نے بڑی شدت کے ساتھ رد کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَقَالَتِ الْیَهُوْدُ یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ اَیْدِیْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا بَلْ یَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ اور یہودیوں کو سنو۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں وہ اب کچھ نہیں کر سکتا۔ خود انہی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونگے اور یہ اپنے اس قول سے ملعون قرار پائیں گے۔ اللہ کے ہاتھ تو ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔"

اسکے بعد یہ پروپگنڈے کی طاقت نہیں تو اور کیا ہے کہ یہود کے خیال کے مطابق انکار بدا تو اسلامی عقیدہ قرار پاجائے اور وہ عقیدہ جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہے اسے یہ بھیانک لباس پہنا دیا جائے کہ شیعہ (معاذ اللہ) اللہ کی پشیمانی کے قائل ہیں۔

۲۔ یہ بھی ہماری طرف نسبت دیدی جاتی ہے کہ شیعہ حضرت علیؑ کو رسول اللہؐ پر فضیلت دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ خرافات بھی ہماری طرف منسوب کر دی جاتی ہے کہ جبریلؑ اصل میں رسالت کی وحی لیکر حضرت علیؑ کی طرف آئے تھے مگر دھوکے سے حضرت محمد مصطفےٰؐ تک پہنچا دی نعوذ باللہ من ھذہٖ الخرافات۔ شیعہ امامیہ اثنا عشریہ آج بحمداللہ دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں ہر جگہ انکے علماء ہیں انکی کتابیں ہیں اور انکے مدارس۔ کہیں بھی دریافت کر لیا جائے تو کہیں اسکی کوئی اصلیت نہ ملیگی۔ بیشک شیعہ بعد خاتم الانبیاءؐ حضرت علی بن ابیطالبؑ کو تمام کائنات سے افضل مانتے ہیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی امر بھی شیعوں کی طرف منسوب کرنا بہتانِ عظیم ہے۔

۳۔ ایک بہت چلتا ہوا الزام فرقہ شیعہ پر یہ ہے کہ ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ اس اتہام کے پردہ کو تفصیل سے ہم نے اپنے رسالہ "تحریف قرآن پر نظر" نیز مقدمہ تفسیر قرآن" میں چاک کیا ہے۔ یہاں بالاختصار یہ عرض ہے کہ اگر کچھ روایات کے وجود کی بنا پر پورے فرقہ کی جانب کوئی عقیدہ منسوب کرنا درست ہے تو ہم پوری قوت کے ساتھ یہ کہنے کے لئے تیار ہیں کہ بہ نسبت شیعوں سے پہلے سنی تحریف قرآن کے قائل ہیں کیونکہ کثرت سے ان کے یہاں روایتیں اسطرح کی موجود ہیں اور اگر صرف روایات سے کسی فرقہ کے عقیدہ کو دریافت نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ خود اس فرقہ کے علماء ان روایات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ محققین علمائے شیعہ قرآن کے الفاظ میں کسی زیادتی یا کمی ہونیکا کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ آج سے ایک ہزار سال پہلے ہمارے بڑے عالم جناب شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی نے اپنے رسالہ اعتقادات" میں لکھ دیا ہے کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن یہی ہے جو ابین الدفتین موجود ہے اس میں کوئی زیادتی یا کمی ہرگز نہیں ہوئی ہے۔ بے شک اس کی ترتیب شانِ نزول کے مطابق نہیں ہوئی ہے۔ اسے سب ہی مسلمان تسلیم کرتے

پر مجبور ہیں اور اکثر تسلیم کرتے ہیں۔

۴۔ بعض جسارت پسند ہماری طرف یہ عقیدہ بھی منسوب کر دیتے ہیں کہ شیعہ تناسخ کے قائل ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ افراد تناسخ اور انکار معاد کو ہم اسی طرح کفر سمجھتے ہیں جس طرح تمام مسلمان۔ ان ہمارے یہاں رجعت کے بارے میں احادیث وارد ہیں۔ مگر رجعت کو تناسخ قرار دینا بالکل ویسا ہے۔ جیسے کوئی حشر و نشر کو جو تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے تناسخ سے متحد بنا دے۔ تناسخ کیا ہے! ایک شخص کا مرنے کے بعد پھر دوبارہ کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا۔ یہ عقیدہ اسلامی کے خلاف ہے۔ مگر رجعت مثل قیامت کے اس شخص کا اپنے اسی جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جانا ہے۔ اسے تناسخ سے کیا واسطہ!

قرآن مجید میں اسے حشر ہی کے لفظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ویوم نحشر من کل امۃ فوجا ممن یکذب بآیاتنا فھم یوزعون۔ ہم ہر امت میں کے کچھ افراد کو جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی محشور کریں گے۔ پھر جس طرح قیامت کا حشر کلی تناسخ سے مختلف چیز ہے۔ اسی طرح اس حشر جزئی کو بھی جو قرآن کی اس آیت میں مذکور ہے تناسخ میں داخل کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

۵۔ بڑی مشہور تہمت ہماری جانب سب و شتم اور دشنام طرازی یعنی گالم گلوچ کی نسبت ہے حالانکہ شیعوں کا معیار تہذیب و شائستگی عموماً دوسروں سے بدرجہا زیادہ ہے ہم میں بکثرت ایسے افراد ہیں جنکی زبان بچپنے سے لیکر آخر دم تک کسی ایک دفعہ بھی فحش کے الفاظ سے آشنا نہیں ہوئی مگر ضرورت اور موقع کے لحاظ سے کسی کے افعال پر انتقاد نقطہ نظر تہذیب و شائستگی کے ہرگز خلاف نہیں اور سب سے بڑی ضرورت اس گمراہی کا رفع کرنا ہے جو کچھ اشخاص کے ساتھ حسن ظن کی صورت میں صراط مستقیم سے علیحدگی کا باعث ہو رہی ہو۔ اس ضرورت سے قابل مذمت اشخاص کی مذمت قرآن مجید تک میں موجود ہے جس سے بڑھکر اخلاق لیئے کا معیاری نمونہ کوئی تصور میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح لعنت کو گالی قرار دینا بھی غلط ہے جبکہ قرآن میں متعدد جگہ لعنت موجود ہے ہم قرآن مجید کی پیروی میں جسطرح رسول اور آل رسول کو مستحق صلوات سمجھتے ہیں اسی طرح

مخالفین رسول و آلِ رسول کو مستحقِ لعنت سمجھتے ہیں۔ رہ گیا تبرّا کا لفظ۔ اس کے اصل معنی کسی سے ذہنی اور عملی بے تعلقی کے ہیں۔ اگر اسے گالی سمجھا جائے تو قرآن سے سورۂ برائت کو حذف کر دیا جائے جسکی ابتدا ہی تبرا سے ہوئی ہے۔

۶۔ ہماری طرف یہ غلط نسبت بھی ملا دی جاتی ہے کہ شیعوں کے یہاں جھوٹ بولنا جائز بلکہ واجب ہے۔ یہ بھی سراسر اتہام ہے۔ ہم جھوٹ کو گناہِ عظیم جانتے ہیں اور کاذبین کو لعنتِ الٰہی کا مستحق سمجھتے ہیں، اور اسی سبب سے صحیح بخاری کی اس حدیث کو کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین جھوٹ بولے ہم بالکل غلط اور خلافِ اسلام جانتے ہیں۔ لیکن کلمۂ حق کے اظہار اور دین کے اعلان کیلئے بھی ہمارے نزدیک مناسب موقع کی شرط ہے بعض وقت افشائے راز خود مفادِ دین کے خلاف ہوتا ہے۔ اسی طرح جان و آبرو کی حفاظت بھی ایک مسلّم الشان اسلامی فریضہ ہے جو اسی وقت نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ جب دینِ مبین کا تحفظ قربانی پر موقوف ہو گیا ہو۔ لہٰذا جب تک ایسی قربانی کا محل پیدا نہ ہو اس وقت تک حفاظتِ نفس کے لیے عقیدۂ حق کو پردہ میں رکھنا درست ہے جس کی تعلیم قرآن میں موجود ہے۔ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان اور دوسری جگہ صاف ارشاد ہوا۔ الا ان تتقوا منھم تقٰۃ تمام مفسرین متفق ہیں کہ یہ دونوں آیتیں تقیہ کے بارے میں ہیں پھر اس قرآنی تعلیم کے ہوتے ہوئے تقیہ کو جھوٹ کہنا کیا خود قرآن اور اسلام کے ساتھ نا روا گستاخی نہیں ہے؟ بے شک جب تحفظِ دین قربانی پر موقوف ہو جائے تو پھر تقیہ کا محل نہیں رہتا اور بسا اوقات تقیہ حرام ہو جاتا ہے۔ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی قربانی اسکی بہترین مثال ہے جس کی یادگار بفضلِ الٰہی ہم نے اب تک قائم رکھی ہے۔

۷۔ ہم پر یہ بھی اتہام ہے کہ ہم (معاذ اللہ) تعزیہ کا بُت بناتے ہیں اور اسے پوجتے ہیں مگر حقیقتِ امر یہ ہے کہ کوئی شیعہ تعزیہ کو مستحقِ پرستش نہیں سمجھتا۔ وہ صرف ضریحِ امام حسینؑ کی شبیہ ہے جو بطور یادگار بنائی جاتی ہے اور اس نسبت کی بنا پر اس کا احترام کیا جاتا ہے۔ اگر ہر احترام داخلِ پرستش ہو جائے تو پھر مسجد اور کعبہ اور قرآن سب ہی کا احترام پرستش قرار پائیگا اور شرک میں داخل ہوگا۔

۸۔ ایک افترا اور بہتان ہمارے خلاف یہ ہے کہ شیعہ عید نوروز اور عید غدیر پر معاذ اللہ ہر حرام کو حلال قرار دے لیتے ہیں۔ معاذ اللہ وکلا والی اللہ المشتکی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں عید نوروز اور عید غدیر بھی مثل عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے نمازیں اور دعائیں وارد ہیں جو ذکر الٰہی پر مشتمل ہیں اور ان متبرک دنوں میں ہمارے یہاں خیر و خیرات کا اہتمام دوسرے عام دنوں سے زیادہ کیا جاتا ہے اسکے خلاف جو بھی کہا جائے وہ افترا و بہتان کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۹۔ کہا جاتا ہے کہ شیعوں کے یہاں حضرت امام حسینؑ کی عزاداری کو کافی سمجھا جاتا ہے اور نماز و روزہ کسی چیز کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی — یہ بھی غلط اور بالکل غلط ہے۔ ہم نماز و روزہ کے وجوب کو ضروریات دین سے جانتے ہیں اور اسکے منکر کو کافر جانتے ہیں اور محبت اہل بیتؑ کا حقیقی تقاضا احکام الٰہی کی اطاعت ہی کو سمجھتے ہیں۔

اسکے علاوہ اور کئی بے بنیاد الزامات ہیں جو صرف نفرت پیدا کرنے کیلئے ہم پر عائد کر دی گئی ہیں مثلاً شیعہ اہلسنت کو جو پانی وغیرہ دیتے ہیں وہ تھوک کر دیتے ہیں یا تازہ تازہ تہمت جو پاکستان اور بالخصوص کراچی کے کچھ حلقوں میں چلی ہے کہ ہر سال شیعہ کسی سنی کو حلال کرتے ہیں اور ذوالجناح کی چادر پر جو سرخ دھبے ہوتے ہیں وہ اسی خون کے چھینٹے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی لچر، پوچ اور بے بنیاد باتیں ہیں جن کی رد کسی علمی رسالے کے شایان شان نہیں ہے۔

اللہ مسلمانوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ حق پرستی حق کے معیار سے غور کریں اور ایسی بیہودہ بکواسوں پر اعتنا نہ کریں جنہیں اہل باطل صرف حق سے متنفر بنانے کے لئے تصنیف کیا کرتے ہیں۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

"مذہب شیعہ"

ایک نظر میں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ
عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہِ الطَّاہِرِیْنَ۔

شیعیت کیا ہے؟

دینِ اسلام کو اس کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کے ساتھ اختیار کرنا۔ اسلام کے معنی ایک "سر نہادن بطاعت" کے ہیں اور دوسرے "سپردن" – یہ دونوں باتیں کس کے لیے؟ اللہ کے لیے اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حکومتِ الہٰیہ کو اس کے پورے تقاضوں کے ساتھ تسلیم کرنا جس کے لیے حاکم اور اس کے مرتب کردہ نظام کی معرفت ضروری ہے۔ یہ "اصولِ دین" ہیں اور پھر اس نظام کے قواعد و ضوابط کو معلوم کر کے ان پر عمل ہے۔ یہ "پابندیٔ شریعت" ہے جس کے خاص ارکان کو "فروعِ دین" کہتے ہیں۔

یہ عقائد وہ ہیں جو عمل کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اعمال وہ ہیں جو عقائد پر چلا کرتے ہیں۔

جامع لفظ سے تعبیر کرنا چاہیں تو برابر کے دو جز ہیں :۔
"حق شناسی" "فرض شناسی"۔اسی کو وسعت دی جائے تو عقائد و اعمال کی پوری دنیا آجائے اور انہی کے ماننے اور برتنے کا نام ہوگا "حقیقی اسلام" اور "شیعیت" جس کی تفصیل مجمل طور پر یہ ہے :۔

اصولِ دین :

(۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت (۵) معاد۔ اب ان میں سے ہر ایک کی کسی حد تک تشریح پر نظر ڈالیے :۔

توحید

یہ ایک جامع عنوان ہے جس کے تحت میں حسب ذیل حقیقتیں مضمر ہیں:۔
(۱) حدوثِ عالم لعینی دنیا اور اس کی ہر چیز نابود تھی۔ ہوا، پانی، آگ، زمین، چاند اور سورج اور ستارے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ موجود ہو اور وہ چھوٹے چھوٹے ذرے بھی جن سے اس تمام دنیا میں مختلف شکلیں نمودار ہوتی ہیں وہ بھی قدیم یعنی ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ان میں حرکت موجود ہے اور حرکت کا ہونا خود زوال اور تغیر کی نشانی ہے۔
(۲) خالق کا وجود : جب یہ تمام کائنات ہمیشہ سے وجود نہیں رکھتی تو ضرور اس کا کوئی وجود میں لانے والا ہے، اسی کو خالق کہتے ہیں۔
(۳) خالق کل جو ہے وہ سراسر "ہستی" ہے۔ اس لیے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ بھی اسی دنیا کا جزو ہو اور اس کے واسطے بھی کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہو۔

(۴) خالق نے اس دنیا کو ارادہ و اختیار کے ساتھ پیدا کیا ہے اس لیے کہ اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہیں اور ایک خاص انتظام نظر آتا ہے جو کسی بے شعور اور بے حس قوت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) کمالِ ذات مستغنی از صفات، یعنی خدا کو سراسر ہستی' ماننے ہی کا نتیجہ ہے کہ اس کی ذات ہر حیثیت سے کامل ہو کیونکہ نقائص اور خرابیاں سب "نیستی" کے پہلو سے پیدا ہوتی ہیں اور خدا کی ذات میں نیستی کا گزر نہیں۔ تمام صفات ثبوتیہ و سلبیہ کا خلاصہ اتنا ہی ہے نہ یہ کہ اس میں علاوہ ذات کے کوئی صفتیں ہوں اور خدا ذات اور صفات کے مجموعہ کا نام ہو جس طرح عیسائی اسے ایک ہوتے ہوئے "تین" مانتے ہیں۔ یہ تصور توحید خالق کے خلاف ہے اور تعلیم اہل بیتؑ کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔

(۶) کمالِ ذات کے تقاضے جنھیں صفاتِ ثبوتیہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ قدیم یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ کوئی اس کی ذات سے جدا گانہ صفت نہیں ہے بلکہ اس کے "سراسر ہستی" ہونے ہی کا تقاضا ہے کہ وہ "واجب الوجود" ہو یعنی اس کی ذات کے لیے "نیستی" ممکن ہی نہ ہو اور جو واجب الوجود ہو وہ ضروری "قدیم" کے لفظ سے یاد کیا جائے گا کیونکہ "حادث" تو وہ ہوتا ہے جو "نیستی" کے بعد "ہست" ہوا ہو اور یہ وہی ہوگا جس کی ذات سے "ہستی" الگ ہو مگر جہاں "ہستی" ذات سے جدا ہو ہی نہ، اس میں نیستی کا شائبہ کہاں ممکن ہے لہذا اسے یہی ماننا پڑیگا کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۲۔ قادر یعنی ہر چیز پر قابو رکھتا ہے اور کسی امر میں بے بس نہیں کیونکہ عاجزی نقص ہے اور قدرت کمال اور یہ بات معلوم ہو چکی کہ اس کی

ذات کامل ہی کامل ہے ناقص نہیں ہے۔

بیشک محال یعنی غیر ممکن چیزوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ان سے خدا کی قدرت کا تعلق ہو لیکن اس سے خدا کی ذات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

۳۔ عالم یعنی وہ ہر شے کا جاننے والا ہے اس لیے کہ جہالت نقص ہے اور خدا کی ذات ہر نقص سے بری ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز اور چھوٹی سے چھوٹی بات ہر ایک خداوند عالم کے علم میں ہے۔ یہی مطلب ہے اس کا کہ وہ حاضر و ناظر ہے۔ اس کے علم میں کبھی تغیر نہیں ہوتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی امر کو پہلے نہ جانتا ہو پھر اس سے واقف ہو اور اس لیے اس کے افعال میں ندامت اور پشیمانی کا گزر نہیں ہے۔

۴۔ چونکہ قدرت اور علم کا مالک ہے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

۵۔ اس کے صفاتِ ثبوتیہ میں مُدرِک بھی ہے۔ اس کے معنی صحیح طور پر یہی ہیں کہ وہ تمام چیزوں کا جو احساس سے متعلق ہیں جاننے والا ہے۔ جس طرح سموعات یعنی آوازوں کے جاننے کی بنا پر سمیع اور مُبصَرات یعنی دیکھنے کی چیزوں کے جاننے سے بصیر ہے۔ یہ عالم ہونے کے مفہوم کے شعبے ہیں۔ الگ الگ صفتیں نہیں ہیں۔ نہ یہ سمجھنا صحیح ہے کہ خدا کے جسمانی طور پر آنکھ اور کان ہیں جن سے وہ دیکھتا اور سنتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے۔

۶۔ قدرت کو علم مصالح کے مطابق صرف کرنے کی بنا پر وہ مُرید ہے یعنی ارادہ کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور کارہ ہے یعنی جو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔

۷- اس کے متکلم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ زبان ودہن سے کلام کرتا ہو بلکہ اپنی قدرت سے اپنے علم کے مطابق جب چاہتا ہے اپنی طرف نسبت کے ساتھ کلام پیدا کرتا ہے۔

۸- نقائص سے کلیتہً بری ہونا: اس کے تحت میں جو کچھ باتیں آئیں انھیں صفات سلبیہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں چند باتیں جو خصوصیت کے ساتھ سمجھنے کی ہیں حسب ذیل ہیں:-

۱- خدا کا کوئی شریک نہیں۔ یہ اصل توحید ہے۔ اس کا ثبوت اسی سے ظاہر ہے کہ خدا "کامل وجود" ہے۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے کی ضرورت ہو تو وہ کامل نہ رہے گا، ناقص ہو جائے گا۔

اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کی طاقت کا مجموعہ ایک سے زیادہ نہیں ہے تو دوسرا بیکار محض ہے اور اگر زیادہ ہے تو ہر ایک ناقص اور محدود ہے اور خدائی کے قابل نہیں ہے۔

۲- خدا مرکب نہیں ہے یعنی اس کے اجزا نہیں پائے جاتے کیونکہ اس صورت میں وہ ان اجزا کا محتاج ہوگا اور اجزا اس سے مقدم ہوں گے لہٰذا وہ سب کا پیدا کرنے والا نہیں قرار پا سکے گا۔

۳- خدا جسمیت نہیں رکھتا کیونکہ ہر جسم کا مرکب ہونا ضروری ہے اور یہ معلوم ہو چکا کہ خدا مرکب نہیں ہے۔

۴- خدا کسی مکان اور سمت میں نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ محدود ہو جائیگا اور محتاج قرار پائے گا اور اسکی ذات پابندی واحتیاج سے بری ہے۔

۵- حلول واتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز دوسرے میں ہو کر پائی جائے اس طرح کہ اسکی صفت بن جائے جیسے رنگ وبو پھول میں یا دو چیزیں اس طرح ایک ہو جائیں کہ ایک کی طرف اشارہ عین دوسرے کی

طرف اشارہ قرار پائے۔ خدا کی ذات اس سے بالکل بری ہے کیونکہ اس صورت میں وہ محتاج اور محدود ہو جائیگا اور ناقص کے ساتھ یکساں بلکہ ایک ہو کر خود بھی ناقص ہو جائے گا۔

۶۔ وہ مرئی نہیں ہے یعنی آنکھوں سے دیکھنا اس کو غیر ممکن ہے کیونکہ آنکھوں سے وہی چیز دیکھی جاتی ہے جو سامنے ہو اور رنگ و شکل رکھنے والا جسم ہو۔ خدا نہ جسم ہے نہ رنگ و شکل رکھتا ہے نہ کسی خاص سمت میں محدود ہے۔ اس لیے اس کے دیدار کا اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

۷۔ اس کی ذات میں تغیرات کا ہونا اور حالتوں میں تبدیلی پیدا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ پیدا ہونے والی حالت اگر کمال ہے تو اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لیے ہمیشہ سے یہ کمال ثابت ہوگا اور اگر کمال نہیں ہے تو اس کی ذات سے اس کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ بیشک اس کے افعال دنیا میں مصالح کے مطابق مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور مصلحتوں کی تبدیلی سے ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ انھی کو "بداء" کہا جاتا ہے لیکن ان تمام تبدیلیوں کا علم اسکو ہمیشہ سے ہوتا ہے اس لیے نہ وہ علم کے تغیر کا سبب ہیں اور نہ پشیمانی و ندامت کا نتیجہ

۸۔ خدا کی ذات سے علاوہ صفتیں نہیں ہیں اس لیے کہ اگر خدا کی صفتیں ذات کے علاوہ ہوں تو خود ذات کمال سے خالی ہوگی اور صفتوں کی محتاج ہوگی پھر اسکو ان صفتوں سے متصف ہونے کے لیے کسی دوسرے سبب کی ضرورت ہوگی تو خدا کی ہستی اپنے کمال میں غیر کی محتاج ہو جائیگی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ غیر اس سے مقدم ہوگا۔ اس طرح توحید کا جو اصل اصول ہے قلع قمع ہو جائے گا۔

عدل :

خدا کے افعال سب حکمت اور مصلحت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ کوئی برا کام نہیں

کرنا اور نہ کسی ضروری کام کو ترک کرتا ہے۔ اس میں حسب ذیل باتیں داخل ہیں :۔

۱۔ دنیا کے تمام افعال بجائے خود یا اچھے ہیں یا بُرے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی بات کی اچھائی برائی ہماری عقل پورے طور پر نہ سمجھ سکے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ حقیقتاً بھی وہ اچھے یا برے نہیں ہیں۔ خدا جو کام کرتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہے بُرا کام وہ کبھی نہیں کرتا۔ خدا ظلم اور ناانصافی سے بری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بندوں کو غیر ممکن باتوں کا حکم دے یا ایسے کام کرے جو بالکل فضول ہوں اور جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ تمام باتیں نقص ہیں اور خدا ہر نقص سے بری ہے۔

۲۔ خدا نے انسان کو اس کے افعال میں خود مختار بنایا ہے یعنی وہ جو کچھ کام کرتا ہے اپنے ارادہ واختیار سے کرتا ہے۔ بیشک یہ قدرت خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی ہے اور جب وہ چاہتا ہے تو اس قدرت کو سلب کر لیتا ہے۔ لیکن جب وہ قدرت کو سلب کرے تو انسان پر ذمہ داری باقی نہیں رہتی یعنی اس صورت میں جو کچھ سرزد ہو اس پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔

خدا بندوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔ اچھے کاموں پر وہ انعام عطا کرتا ہے اور برے کاموں پر سزا دیتا ہے۔ اگر اس نے انھیں مجبور پیدا کیا ہو یعنی وہ خود ان کے ہاتھوں سب کچھ کام کراتا ہو تو احکام نافذ کرنا اور جزا وسزا دینا بالکل غلط اور بے بنیاد ہوگا۔ خدا کی ذات ایسے غلط اور بے جا طرز عمل سے بری ہے۔

۳۔ خدا کو بندوں کے تمام افعال کا علم ہمیشہ سے ہے لیکن اس کا علم ان لوگوں کے افعال کا باعث نہیں ہوتا بلکہ چونکہ یہ لوگ ان افعال کو اپنے اختیار سے کرنے والے ہیں اس لیے خدا کو انکا علم ہے۔

۴۔ خدا کے لیے عدالت کو ضروری قرار دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ظلم یا فعل قبیح یا عبث پر قادر نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ خدا کی کامل ذات اور اس

کے علم و قدرت کے لیے پریشانیاں نہیں ہے کہ وہ ظلم و فعل قبیح وغیرہ کا ارتکاب کرے۔ اس لیے ان افعال کا صادر ہونا اس سے بالکل غیر ممکن ہے۔

عقیدۂ توحید و عدل کا انسانی معاشرہ پر اثر:

توحید سے عالمِ انسانیت کو ایک مشترک نقطہ کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے جو سب کا مرکز قرار پائے۔ ہزار در ہزار نسل، وطن، قوم اور رنگ کے تفرقوں کے باوجود دنیا منسلک ہو جاتی ہے۔ ایک نظام میں اس ایک ہستی کے اقرار سے جو سب کا خالق اور معبود ہے۔

پھر یہ کہ اس سے انسان میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ مطلق العنان نہیں ہے اگر سب ذاتی خواہشوں کے غلام ہوتے تو ہر ایک کی طبیعت اور خواہش کے اختلاف سے مقصد اور عمل میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا مگر سب ایک حاکم کے فرماں بردار ہیں اس لیے ان کا ہم آہنگ عمل اور مقصد ایک ہونا چاہیے۔ یہ حاکم کیسا ہے؟ حاضر و ناظر ہے ہر جگہ موجود ہے اور ہر بات کو جانتا ہے اس لیے انسان کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کوئی بات خلافِ قانون بجا نہ لائے کسی کام کو چوری چھپے کرتے ہوئے مطمئن نہ ہو کہ کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ اسی نے دیکھا ہے جس کے ہاتھ میں جزا و سزا ہے۔

وہ اکیلا ہے۔ کوئی اس کا مدِ مقابل نہیں۔ اس لیے بس اسی کی رضامندی کی فکر رہنا چاہیے اور اسی کی ناراضی سے اندیشہ کرنا چاہیے۔ اس کی طاقت ہر ایک سے غالب ہے اس لیے ناحق کسی طاقت سے مرعوب نہ ہو۔ وہ ہر بات پر قادر ہے۔ اس لیے اپنی ناتوانی سے کبھی ناامید نہ ہو۔

اس عقیدہ سے ایسی انسانی برادری کی تشکیل ہوتی ہے جس میں ہر ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و مساوات کا احساس رکھتا ہو اور سب ایک نصب العین پر گامزن ہوں۔ سب اپنی خواہشوں کو مشترک مقصد اور اصول میں فنا کر دیں اور سب اپنے واحد

حاکم کی رضامندی کے خلوت اور انجمن ہر حالت میں طلبگار رہیں اور کسی وقت قانون کے احترام کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس جماعت کے افراد میں خود داری ہو کہ وہ کسی مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکائیں۔ بلند حوصلگی ہو کہ کسی دشوار مقصد کو ناممکن نہ سمجھیں اور اعتماد ہو جس سے کبھی اپنے دل میں یاس کا گزر نہ ہونے دیں۔ یہی وہ عناصر ترقی ہیں جو بلند مرتبہ اقوام کے شایان شان ہیں۔

عدل کے ماتحت یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا قانون جو اس کے تمام کاموں میں جاری ہے وہ عدالت ہے لہٰذا وہ بندوں سے بھی انصاف اور عدالت کا طالب ہے۔ اس نے ہمیں ایک امانت دی ہے جس کا نام "قوت اختیار" ہے۔ ہمیں اس اختیار کو قانون عدالت کے مطابق صرف کرنا چاہیے۔

اس عقیدہ سے اس برادری میں جو انسانیت کے حدود میں قائم کی گئی ہے تبادلۂ حقوق اور انصاف و مساوات کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس برادری کے افراد ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ یہ ظلم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر دولت و ثروت یا طاقت و اقتدار میں جو فوقیت نظر آتی ہے یہ بالکل وقتی ہے اور عارضی۔ خالق کی نگاہ میں ان سب کے لیے ایک قانون ہے کہ بلندی ان کی کردار سے وابستہ ہے۔ گناہ اگر غریب کرے تو سزا ملے گی۔ اور امیر کریگا تو سزا پائے گا۔ وہاں اس کی دولت مندی کچھ کام نہ آسکے گی نہ وہ رشوت دے کر اپنے بچاؤ کا سامان نکال سکے گا۔ اسی طرح اچھا کام اگر امیر کرے گا تو جزا پائے گا اور غریب کریگا تو جزا پائے گا۔ اسکی غربت اسکی کس مپرسی کا باعث نہ ہوگی۔ اس طرح ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے اعمال کی جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ افراط اور تفریط اسراف اور کنجوسی سب ظلم ہیں اور ہر چیز میں وسط کا نقطہ عدالت کا مرکز ہے۔ انسانی کمالات کی دنیا اسی اعتدال کے نقطہ پر مبنی ہے۔

خدا کو عادل سمجھنا اس اعتدال کی پابندی کا واحد محرک ہے اور اسی لیے جو اس

اعتدال پر قائم رہیں انھیں عادل کہا جاتا ہے اور سچے مسلمان وہی ہیں جو عدالت کی صفت سے ممتاز ہوں۔

نبوت :

اس کے تحت میں حسب ذیل باتیں ہیں :۔

۱۔ انسانی جماعت کو صحیح راستے پر چلانے کے لیے خدا کی جانب سے رہنما اور مصلح مقرر ہوتے رہے ہیں جن کے ذریعہ سے ان کو خداوندی احکام پہنچتے رہیں اور انتظام خلق درست ہو۔ ان مصلحین کو جو خدا کی طرف سے احکام پہنچانے کے لیے مقرر ہوتے ہیں نبیؑ اور رسولؑ کہتے ہیں اور انسانوں کی بہبودی کے لیے جو تعلیمات خدا کی طرف سے کسی معلم کے ذریعہ سے آتے ہیں ان تعلیمات کے مجموعہ کو "شریعت" کہتے ہیں اور وہ رسول کے ذریعہ سے دنیا کو پہنچتے ہیں۔

۲۔ انسانی آبادی کا کوئی خطہ اور کوئی طبقہ خدا کی جانب سے رہنمائی سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ممکن ہے کہ بعض اقوام اور بعض ممالک کے متعلق ہم کو صحیح علم نہ ہو کہ ان کی بھی رہنمائی خدا کی طرف سے کن اشخاص سے متعلق تھی لیکن یہ کلیہ بہرحال صحیح ہے کہ ہر قوم کے لیے خدا کی طرف سے رہنما ضرور قرار دیا گیا ہے۔

۳۔ انبیاء یعنی خدا کی طرف کے مقررہ شدہ مصلحت عملی حیثیت سے دنیا کے لیے نمونہ ہوتے ہیں اس لیے انھیں گنہگار نہیں ہونا چاہیے اور نہ غلطیوں میں مبتلا ہونا چاہیے نہ بھول چوک میں گناہ کا مرتکب ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو انکے ہاتھوں خلق خدا کے گمراہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہوگا۔ اور ایسے اشخاص کا جن سے یہ اندیشہ ہو خدا کی طرف سے مقرر کیا جانا درست نہیں ہے۔

۴۔ خدا کی طرف سے مقرر شدہ نبی کے پاس کوئی ایسی غیر معمولی مخصوص بات ہونا ضروری ہے جس کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرے اور کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلہ میں اس کی مثال پیش نہ کر سکے۔ ایسی غیر معمولی بات کو "معجزہ" کہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو سچے

اور جھوٹے میں کوئی تمیز نہ ہوگی اور ہر شخص نبوت کا دعویٰ آسانی کے ساتھ کر سکے گا۔

۵۔ ہمارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ جو دنیا کے سامنے ہمیشہ کے لیے باقی ہے قرآن مجید ہے۔ یہ اس زمانہ کے لوگوں کے لیے بھی معجزہ تھا اس لیے کہ اسکی فصاحت و بلاغت انسانی طاقت سے بالاتر تھی اور اب بھی معجزہ ہے اور ہمیشہ معجزہ رہے گا۔

۶۔ قرآن خدا کا کلام ہے یعنی وہ رسولؐ کی ذاتی طاقت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ان کے دل پر اتارا گیا ہے۔ وہ پورا رسولؐ کے زمانہ ہی میں متفرق طور پر لکھوا لیا گیا تھا۔ بعد وفاتِ رسولؐ وہ تمام و کمال کتابی صورت میں جمع ہو گیا۔ نہ اس میں کوئی زیادتی ہوئی ہے اور نہ کمی اور نہ تبدیلی۔ ہاں اسکی ترتیب شانِ نزول کے مطابق نہیں ہے۔

۷۔ شریعتِ اسلام اپنی جامعیت کے لحاظ سے ہر زمانہ کے ضروریات کے لیے مکمل حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس شریعت کے بعد کسی شریعت کے آنے کی ضرورت نہیں رہی اور نہ حضرت محمد مصطفےٰؐ کے بعد کسی نبی و رسول کے آنے کا محل رہا۔ قرآن مجید میں واضح طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ سب سے آخری رسول ہیں اور خود پیغمبرؐ نے بھی بتلایا کہ آپ کے بعد کوئی نبی و رسول آنے والا نہیں ہے۔

عقیدۂ رسالت کا عملی تقاضا:

رسول خدائے احکم الحاکمین کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے احکام خدا کے احکام ہوتے ہیں لہٰذا کسی کو رسولؐ کے مقابلے میں رائے زنی، عقل آرائی اور طبع آزمائی کا حق نہیں ہے۔ نہ اس کے فیصلہ کے بعد کسی چون و چرا کا موقع۔ اس طرح رسولؐ کے اقتدار کے تحت آپس کی طرفداری، جاہ طلبی، خود غرضی، انانیت، جبروت اور نفسانیت سے پیدا شدہ ہر کشمکش کو جو جماعت کے افتراق کا باعث ہوتی ہے ختم ہو جانا چاہیے اور اسی میں جماعت کی تنظیم و ترتیب اور تمام افراد کی فرض شناسی کا راز مضمر ہے۔

امامت

چونکہ رسولؐ کی زندگی دارِ دنیا میں محدود ہے اور وہ شریعت جس کی تبلیغ رسولؐ کی زبانی ہوئی ہے اس کی حفاظت اور نیز افرادِ ملت کی عملی تربیت اور انکو احکامِ شریعت کی صحیح تعلیم دینے کی ضرورت ہے اس لیے رسولؐ کے بعد آپکا ایک جانشین ہونا ضروری ہے جو تمام افرادِ امت میں پورے طور پر اس رسولؐ کی شریعت اور تعلیم کی حفاظت کرنے کے قابل ہو۔ یہ جانشین امام ہوتا ہے۔ اور یہی رسول کا واقعی خلیفہ ہوتا ہے۔ اس جانشین کا انتخاب خدا کی جانب سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر رسولؐ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد عام افراد کو ان کی رائے خواہش اور مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو مطلق العنانی اور خود غرضی برسرِ کار آ جائے گی جس کا نتیجہ افتراق و انتشار و ابتری کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور اس طرح جو شیرازہ پیغمبرِ خدا کی اطاعتِ مطلقہ کی بنا پر جمع ہوا تھا وہ بکھر جائے گا۔ امامت منصوصہ کا عقیدہ اس اجتماعی انتشار کا سدِباب ہے۔ اس کے تحت میں حسبِ ذیل امور ہیں:۔

۱۔ رسولؐ کے بعد بھی خداوندی قانون پر دنیا کو چلانے کے لیے مرکز موجود رہتا ہے۔

۲۔ یہ مرکز ایسا ہوگا جو خود قانون پر عمل کا بہترین نمونہ ہو۔ اس لیے اسے بھی گناہوں اور خطاؤں سے بری ہونا ضروری ہے ورنہ پھر اس کے ہاتھوں خلقِ خدا کی گمراہی کا امکان ہوگا اور مفادِ امامت ختم ہو جائے گا۔

۳۔ اسلام کسی شہنشاہیت کی بنیاد قائم نہیں کرتا بلکہ انسانیت کا نظام بناتا ہے اور ایک قوم کی تشکیل کرتا ہے جو انسانیت کا صحیح نمونہ ہو اور اس نظامِ انسانیت کے لیے ایک محافظ قرار دیتا ہے جو تمام انسانوں کا واحد مرکز ہو۔ یہ اپنے زمانہ میں رسولؐ ہیں اور رسولؐ کے بعد ان کے نامزد کردہ جانشین یعنی امام اور اگر امام براہِ راست رہنمائی کے لیے سامنے نہ ہوں تو ایسے افراد جو ان کے تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ مطلع اور عامل ہوں۔

۴۔ امام کے مقابلہ میں کسی کو حکومت کا حق نہیں ہے اور جو حکومت اس طرح کی قائم ہو وہ حکومت غیر شرعی ہوگی۔

۵۔ نظریۂ امامت میں صرف قرابت یعنی رسولؐ سے رشتہ داری کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ اصل معیار صفات کی بلندی اور اس کے لحاظ سے خالق کی جانب سے بحیثیت جانشینِ رسولؐ نامزد ہونا ہے اور اسی لیے محبتِ اہل بیتؑ رسولؐ جو نجات آخرت کے لیے ضروری ہے اور بغیر اس کے انسان باایمان نہیں سمجھا جاسکتا یہ انھی ہستیوں کی محبت ہے جو اپنے کردار کے لحاظ سے "معصوم" ہیں اور جنھیں خالق کی طرف سے ہدایت خلق اور نیابت رسولؐ کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

۶۔ چونکہ ہدایت خلق اور حفاظت شریعت کا کام مستقل طور پر قائم ہے اس لیے اس سلسلہ کی کسی فرد کا آخر عمر زمانہ تک موجود رہنا ضروری ہے اور جب کہ وہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو تو اسے پردۂ غیبت میں باقی و برقرار اور اپنے طور پر برسرکار رہنا ضروری ہے۔

معاد : اس کے تحت میں حسب ذیل امور ہیں :۔

۱۔ خدا کی طرف سے بندوں کو ان کے اچھے اور برے افعال کا بدلا ملنا ضروری ہے جو اچھے کام کریں انھیں جزا اور جو برے کام کریں انھیں سزا ملے گی۔ اس لیے کہ خدا عادل ہے اور عدالت کا تقاضا یہی ہے۔

۲۔ جزا و سزا کے لیے ایک دن مقرر ہے جسے "قیامت" کہتے ہیں۔ اس دن سب مرنے والے دوبارہ زندہ ہوں گے تاکہ انھیں جزا اور سزا عطا کی جائے۔

۳۔ جزا یعنی اچھے کاموں پر جو انعام کا اعلان ہے۔ وہ کبھی ٹل نہیں سکتا لیکن گناہوں پر سزا کا جو اعلان ہے وہ صرف استحقاق کا پتہ دیتا ہے یعنی یہ شخص سزا کے قابل ہے لیکن عفو و کرم کے ماتحت ہوسکتا ہے کہ خدا اس سے درگزر کردے

اس کا نام "مغفرتِ ذنوب" یعنی گناہوں کی بخشش ہے۔

۴۔ ان گناہوں کی بخشش کبھی رسولؐ یا ائمہ دینؑ کی بارگاہِ الٰہی میں عرضداشت سے ہوتی ہے اس کو "شفاعت" کہتے ہیں۔

اصولِ دین کا خلاصہ یا اصل جوہر:

مذکورہ بالا اصول کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو مان کر ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوتی ہے جو خدا کی بادشاہت کو تسلیم کرے اور اسی کے ماتحت اس کے مقرر کردہ حاکم (رسولؐ) اور اس کے نائبین (اولوالامر) یعنی ائمہ معصومینؑ کے احکام پر وفاداری کے ساتھ عمل کرے۔ خالق کی عظمت کے مقابلہ میں کسی دنیوی طاقت سے مرعوب نہ ہو اور اس طرح کسی باطل اقتدار کی بیعت کے لیے تیار نہ ہو اور اقتدارِ الٰہی کے مقابلہ میں خود اپنے ذاتی اختیار اور خود رائی سے کبھی کام نہ لے اور اس کے مقرر کردہ مرکز سے منحرف نہ ہو۔ اسی کا نام "ہے شیعیت" اور یہی "ہے حقیقتِ اسلام"

اصولِ دین کے نمایاں پہلو یہ ہیں:۔

۱۔ خالق کی ذات کو اسکے شایانِ شان کمال کے ساتھ ماننا۔ اسکا نام توحید ہے۔

۲۔ خالق کے افعال کو اس کی شایانِ شان حکیمانہ رفعت کے ساتھ ماننا۔ یہ عدل ہے۔

۳۔ رہنمایانِ دین کو جو اللہ کے مقرر کردہ ہیں کامل طور پر کردار کی ہر پستی سے بلند سمجھنا جس کا نام "ہے عصمت" یہ نبوت کا لازمی جزو ہے۔

۴۔ خالق کی طرف کے رہنمائی کے نظام کو تاقیامت باقی ماننا اور "حکومتِ الٰہیہ" کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ قبول کرنا۔ اس کا نام امامت ہے۔

۵۔ جزا و سزا کے لیے اس دورِ زندگی کے اختتام کے بعد ایک دوسرے دورِ حیات کو تسلیم کرنا۔ اسے معاد کہتے ہیں۔

خصوصیات مذہب شیعہ

(عقائد کے لحاظ سے)

۱۔ تنزیہ خالق (یعنی خداوند عالم کے کمال ذات کے خلاف کسی طرح کے بھی نقص کسی طرح کی جسمانیت کسی طرح کی بھی مشابہت کو غیر کے ساتھ گوارا نہ کرنا۔

اسی بنا پر دنیا یا آخرت کسی عالم میں بھی وہ جسمانی آنکھ سے خالق کے دیدار کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اس کے لیے ذات کے علاوہ صفات نہیں سمجھتے کیونکہ اس طرح ذات اپنے کمال میں صفات کی محتاج قرار پاتی ہے۔

ذات خالق کے سوا کسی قدیم کا تصور نہیں کرتے مثلاً اگر ذات کے علاوہ اس کے کلام کو بھی قدیم سمجھا جائے یا مزید آٹھ صفتوں کو قدیم سمجھا جائے تو صفت قدم میں ذات الٰہی کے شریک دوسرے اصور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جس طرح تمام ادیان عالم میں دین اسلام میں توحید سب سے زیادہ مکمل ہے۔ اسی طرح تمام فرق اسلامیہ میں شیعی مذہب کی توحید سب سے زیادہ خالص ہے۔

۲۔ عدل الٰہی کو پورے اس کے تقاضوں کے ساتھ تسلیم کرنا جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کے افعال میں کوئی غلط کام، کوئی لغو کام اور کوئی برا کام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ شیعہ "حق کو طاقت" مانتے ہیں۔ اتنی ہمہ گیری کے ساتھ کہ خالق کے افعال میں بھی سوا حقانیت اور انصاف کے کسی دوسرے تصور کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ خیال کہ وہ قادر مطلق ہے لہٰذا اس پر کوئی پابندی نہیں نتیجہ ہے "طاقت کو حق" سمجھنے کا جو شہنشاہان خود مختار کی مطلق العنانی کا سنگ بنیاد ہے۔ شیعہ اس تصور کے شروع سے آخر تک خلاف ہیں

۴۔ شیعہ "تقدیر" یا "مشیت الٰہی" کے کسی ایسے تصور کو درست نہیں جانتے جو ظالموں اور بدکاروں سے ان کے افعال کی ذمہ داری کو سلب کر دے۔ اس طرح نہ خالق کے افعال میں شر کا تصور رکھتے ہیں اور نہ دنیا میں کسی شر کے وقوع میں اس کے ارادہ و عمل کی کارفرمائی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی سے ظلم اور ظالموں سے نفرت کی بنیاد مضبوط

ہوتی ہے اور یہی صحیح معنی میں اصول تبرا "کا سنگ بنیاد ہے۔

۵۔ شیعہ حسن و قبح کو عقلی جانتے ہیں یعنی شریعت کے احکام سے قطع نظر کرتے ہوئے بجائے خود بھی افعال میں اچھائی اور برائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض چیزوں کی اچھائی اور برائی کے پہلوؤں تک ہمارا ذہن نہ پہنچ سکے مگر ذاتاً ان میں اچھائی یا برائی ہے ضرور اور اسی اچھائی یا برائی کی بنا پر شریعت میں حلال اور حرام کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ نہ یہ کہ اندھا دھند جس چیز کو خالق نے چاہا حلال کر دیا اور جسے چاہا حرام کر دیا۔

شیعی مذہب کے اس اصول کی بنا پر عقل انسانی کے لیے شرعی احکام کے فلسفۂ تشریع پر غور و خوض کی راہیں کھلتی ہیں اور انسانی بصیرت کو جلا ہوتی ہے۔

۶۔ شیعہ حکومت الٰہیہ کو اس کے پورے تقاضوں کے ساتھ تسلیم کرنے کے حامی ہیں۔ اسلام کے معنی ایک "سر نہادن بطاعت" کے ہیں اور دوسرے "سپردن" کے۔ دونوں کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلہ میں انسان کا حق خود ارادی خواہ شخصی ہو یا جمہوری کوئی چیز نہیں ہے۔ حاکم مطلق صرف اللہ ہے اور جسے وہ اپنا نائب بنائے صرف اس کی اطاعت انسان پر فرض ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا حق حکومت نہیں رکھتا اور جو حکومت اس کے مقابلہ پر قائم ہو وہ ناجائز ہے۔

۷۔ شیعہ تعلیمات اسلامی اور کتاب و سنت کے علم کے لیے اس مرکز سے وابستہ ہیں جو خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بتایا ہوا تھا۔ کبھی اس طرح کہ انی تارك فيكم الثقلين كتاب الله وعترتی اهل بيتی ما ان تمسكتم بهما لن تضلوا بعدی "میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلبیتؑ ہیں۔ جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔"

کبھی فرمایا۔ مثل اهل بيتی كمثل سفينة نوح من ركبها نجا ومن تخلف عنها غرق وهوى۔ "میرے اہل بیتؑ کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے الگ ہوا وہ غرق ہوا۔"

کبھی فرمایا۔ انا مدینۃ العلم وعلی بابھا فمن اراد العلم فلیات الباب "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے تو جو علم کا طلبگار ہو اسے دروازہ پر آنا چاہیے"

فرقۂ شیعہ نے رسول اللہؐ کے بعد جس طرح حکومت کا حقدار صرف انھی کو سمجھا، جن کے لیے خدا اور رسولؐ کا اعلان ہو چکا تھا۔ اسی طرح دینی تعلیمات کے باب میں بھی صرف انھی کی رہنمائی قبول کی اور وہ انھی ارشادات کو اپنی تعلیم کا سرچشمہ مانتے ہیں جو قرآن حدیث رسولؐ اور ان اہل بیت معصومینؑ سے پہنچے ہوں جنھیں پیغمبرؐ نے اپنے علوم کا وارث دار بنایا اور بتایا تھا۔

اسلام کے عملی ارکان اور احکام شرعی

قانونِ الٰہی کے تحت میں کچھ فرائض مقرر ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی درستی کے لیے ضروری ہیں۔ان میں سے جو بہت اہم حیثیت رکھتے ہیں وہ "ارکانِ اسلام" کہے گئے ہیں جنھیں عام طور پر "فروعِ دین" کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اصولِ عقائد کے ساتھ وہی تعلق رکھتے ہیں جو شاخوں کو درخت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے اور بغیر ان پر عمل کے اسلام کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

قانونِ الٰہی کو مذہب کی زبان میں "شریعت" کہتے ہیں اور جو اس قانون کے تقاضے ہوں انھیں احکام شرعی کہا جاتا ہے۔

ضروریاتِ دین وہ شرعی احکام جو تمام مسلمانوں میں اس طرح تسلیم شدہ ہیں کہ بچہ بچہ انھیں جانتا ہے۔ انھیں "ضروریاتِ دین" کہا جاتا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا واجب ہونا، شراب، زنا اور سود خواری کا حرام ہونا بلکہ نماز کے کچھ شرائط اور کچھ کیفیات۔ مثلاً نماز کے لیے طہارت کا ضروری ہونا، قبلہ، شب و روز کی واجب نمازوں کی تعداد، ان کی رکعتیں اور قیام و قعود اور رکوع و سجود کا جزو نماز ہونا وغیرہ۔ یہ بھی ضروریات دین میں داخل ہیں جن کا منکر کافر ہے۔ اس طرح اگر فہرست ضروریات

دین کی مرتب کی جائے تو وہ کافی بسیط ہو گی۔

احکامِ شرع کے ماخذ

احکامِ شرع حاصل کرنے کے چار ذریعے ہیں:۔

۱۔ قرآن: اس میں جن آیات کے معنی ظاہر ہیں انھیں خود سمجھ کر عمل کرنا فرض ہے اور جن کے معنی مجمل یا مبہم ہیں ان کی شرح کو احادیث معصومینؑ سے معلوم کرنا چاہیے۔ مثلاً یہ کہ ان آیتوں میں رائے زنی کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ حدیث: یعنی رسول اللہؐ اور آپ کے جانشین جو امام تھے ان کے اقوال و افعال۔

۳۔ اجماع: اس میں عام اشخاص کا کسی بات پر متفق ہونا کوئی چیز نہیں جب تک کسی ذریعہ سے یقین نہ ہو جائے کہ امام بھی ان سے متفق ہیں۔ اس کا موجودہ زمانہ میں حاصل ہونا غیر ممکن ہے۔

۴۔ عقل: یقینی طور پر جو عقل کے فیصلے ہوں جیسے امانتداری کا مستحسن ہونا، خیانت کا فعل قبیح ہونا۔ یہ فیصلے عقل کے بھی مستند ہیں۔ مگر قیاس یعنی ایک چیز کے شرعی حکم سے دوسری چیز کے شرعی حکم کا صرف گمان کی بنا پر اپنے دل سے نکالنا۔ یہ ہمارے نزدیک بے اصل ہے اور اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

اصولِ عملیّہ

جس چیز کے بارے میں مذکورہ ماخذوں سے کوئی علم حاصل نہ ہو سکے اور اس میں شک ہو اسے کیا سمجھا جائے اور عملاً کیا کیا جائے؟ اس کے قواعد و ضوابط جو مذکورۂ بالا ماخذوں ہی سے حاصل ہوئے ہیں "اصولِ عملیّہ" کہلاتے ہیں۔ یہ چار ہیں۔

۱۔ استصحاب: یعنی جو بات پہلے ہو اسے باقی سمجھا جائے جب تک کہ اس میں تبدیلی کے وقوع کا علم نہ ہو۔

۲۔ برائت: یعنی جس شے کے متعلق شرع کی جانب سے فعل یا ترک کی پابندی ثابت نہ ہو اسے جائز سمجھنا چاہیے۔

۳۔ احتیاط: یعنی جب شرع کی جانب سے وجوب یا حرمت کی پابندی عائد ہونا ثابت ہو مگر پتہ نہ ہو کہ کیا واجب ہے یا کیا حرام ہے یا اس پابندی کے ادا کرنے کے طریقہ میں شک ہو تو ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ یقینی طور پر انسان بری الذمہ ہو جائے اور حکم مولا کی تعمیل یقینی طور پر ہو جائے۔

۴۔ تخییر: جبکہ فعل یا ترک کی پابندی عائد ہونے کا یقین ہو مگر تعیین کے ساتھ معلوم نہ ہو اور احتیاط کی کوئی صورت ہو ہی نہ تو کسی بھی ایک پہلو پر عمل کرنے کا اختیار ہو گا۔

یہ تمام قاعدے جیسا کہ کہا گیا طبع زاد یا خود ساختہ نہیں ہیں بلکہ انہی شرع کے ماخذوں سے ثابت ہیں لہٰذا ان پر عمل درحقیقت انہی شرعی دلائل پر عمل ہے۔ کوئی الگ چیز نہیں ہے۔

اجتہاد و تقلید:

مذکورہ بالا ماخذوں اور ان سے متفاد اصولی قواعد سے احکام شرعیہ کو سمجھنے کی کوشش کا نام اجتہاد ہے نہ کہ دل خواہ احکام تراشنے کا، اور جو لوگ اس طرح احکام کو خود سمجھ سکیں وہ "مجتہد" کہلاتے ہیں اور جو اتنی قابلیت نہیں رکھتے کہ وہ خود اس طرح احکام کو سمجھ سکتے ہوں تو ان کے لیے صحیح طریقہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے کا یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اپنے بھروسے کے مجتہد کی طرف رجوع کریں اور اس سے مسائل کو دریافت کر کے ان پر عمل کریں۔ اسکا نام "تقلید" ہے۔

وہ کوئی پیری مریدی کی طرح کی چیز نہیں ہے اس لیے نہ مجتہد سے بیعت کرنا ہوتی ہے اور نہ کسی رسم کے ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ مجتہد کو اطلاع تک دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ کا مقلد ہوتا ہوں۔

وہ بس مابین خود و خدا احکام الٰہی پر عمل کرنے کا ایک امکانی ذریعہ ہے اور اسکے سوا کچھ نہیں۔

نماز اور اس کے لیے ضروری چیز طہارت

عملی ارکان میں سب سے اہم نماز ہے اور نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔

نجاسات: طہارت کے لیے سب سے پہلے ضرورت نجاستوں سے علیحدہ رہنے کی ہے جیسے

پیشاب، پاخانہ، خون وغیرہ — ان میں سے اکثر چیزوں سے آلودگی طبی حیثیت سے بھی امراض کا سبب ہے لیکن اس نجاست میں اصل دارومدار حکم شرع پر ہے۔ اس حکم شرعی کا باعث یہ طبی مضرت بھی ہو سکتی ہے۔ اور بسا اوقات دوسری مصلحتیں بھی ہو سکتی ہیں جیسے نفرت پیدا کرنا یا ایسے لوگوں کے میل جول سے روکنا جن سے انسان کے لیے دینی حیثیت سے خطرہ ہے۔

ایک ضمنی مقصد ان تمام چیزوں سے علیحدہ رہنے میں صفائی بھی ہے مگر اصل مقصد صرف صفائی نہیں ہے۔ چنانچہ ان نجاسات میں علاوہ ان گندہ چیزوں کے جیسے پیشاب پاخانہ وغیرہ ایک نشہ دار سیال چیز یعنی شراب وغیرہ بھی ہے۔ اس کی نجاست بظاہر اسکی حرمت کو طاقت پہنچانے کے لیے ہے تاکہ انسان اس سے متنفر ہو کر رغبت نہ کرے۔ فعل حرام کی وجہ سے جنابت میں مبتلا ہونے والے کا پسینہ بھی نجس قرار دیا گیا جس سے اس فعل شنیع کی برائی کا ذہن نشین کرنا مقصود ہے اور اسی طرح غیر مسلمین کی نجاست کا حکم جو فقہ جعفری کے مخصوصات میں سے ہے۔ یہ عقائد کفریہ سے ذہن کو دور کرنے کا ایک قوی ذریعہ ہے جس کی پابندی تعلیمات اہل بیتؑ کے رو سے قطعی طور پر ضروری ہے۔

مُطہّرات

جب کوئی شے مذکورۂ بالا نجاستوں سے نجس ہو جائے تو اس کے پاک کرنے کے لیے سب سے اہم شے پانی ہے۔ یہ عارضی نجاست رکھنے والی ہر شے کا مطہر ہے۔

دوسرے زمین: اس کے ذریعے سے جوتوں کے تلے، ننگے پیر چلنے والوں کے پیروں کے تلوے، گاڑیوں کے پہیے وغیرہ غرض ہر چیز جو عموماً زمین پر چلتی ہے اس نجاست سے جو اسی نقل و حرکت میں نجس مقامات پر چلنے سے پیدا ہو پھر اسی نقل و حرکت کے ذیل میں خود بخود پاک ہوتی رہتی ہے۔

تیسرے آفتاب: اس کے ذریعے سے غیر منقول چیزیں جیسے دیوار، در، درخت اور میوہ جو درخت پر ہو وہ اگر بحالت تری نجس ہوں تو دھوپ سے خشک ہو کر پاک ہو جائیں گی۔ — یہ مطہرات وہ ہیں جن سے عارضی نجاستیں دور ہوتی ہیں اور جو اصلی نجاست ہے جیسے پاخانہ، خون، کتا، سوّر اور کافر وغیرہ اسکی اگر نوعیت بالکل بدل جائے

اسطرح کہ وہ پہلی شے باقی ہی نہ رہے جیسے جل کر راکھ ہو جائے یا کتا نمک زار میں گر کر نمک ہو جائے تو اب جو شے وجود میں آئی ہے وہ پاک سمجھی جائے گی۔ اسی طرح کافر اگر مسلمان ہو جائے تو اب نجاست کفر اس کی ختم ہو گئی اور وہ مسلمان ہو کر طاہر ہو گیا۔

وہ سیال چیز جو بغیر کسی قید و اضافت کے پانی نہیں کہی جا سکتی۔ آب مضاف کہلاتی ہے اس سے کوئی شے پاک نہیں ہو سکتی اور وہ ذرا سی بھی نجاست کے پڑ جانے سے پورا نجس ہو جائے گا چاہے کتنا ہی زیادہ ہو لیکن آب مطلق یعنی جو حقیقی معنی میں پانی ہو اس کی کئی قسمیں ہیں:۔ ایک آب جاری یعنی جس کا کوئی خزانہ ہے جس سے اس کا اتصال ہے خواہ قدرتی ہو جیسے دریا چشمہ اور کنواں وغیرہ یا بنایا ہوا ہو جیسے نل کا پانی جو بڑی بڑی ٹنکیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ پانی جب تک برس رہا ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے یہ قسم پانی کی نجاست کے اتصال سے اس وقت تک نجس نہیں ہوتی جب تک نجاست سے بو، رنگ یا مزہ اس کا بدل نہ جائے اور اگر تبدیلی ہو جائے تو وہ اس وقت تک نجس رہے گا جب تک وہ تبدیلی باقی ہے اور جب وہ تبدیلی ختم ہو جائے تو وہ پانی خود بخود پاک ہو جائے گا۔

دوسرے آب کثیر یعنی ٹھہرا ہوا پانی جو کُر بھر ہو یا اس سے زیادہ۔ اسکا حکم یہ ہے کہ وہ نجس تو اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ نجاست سے رنگ یا بُو یا مزہ نہ بدلے لیکن اگر یہ تبدیلی ہو جائے تو پھر وہ خود سے پاک نہیں ہوگا بلکہ زوال تغیر کے علاوہ ایک کُر پانی اس میں ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔

تیسرے آب قلیل یعنی کُر سے کم پانی۔ یہ ایک قطرہ نجاست سے بھی نجس ہو جائے گا اور پاک اسی صورت سے ہو سکے گا کہ ایک کُر پانی سے اس کا اتصال ہو۔

نماز میں جسم کا نجاست سے پاک ہونا لازم ہے اور لباس کا بھی سوا ایسے چھوٹے لباس کے جیسے ازار بند وغیرہ جس سے مرد کے لیے بقدر ستر نماز میں ضروری ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ سجدہ گاہ یعنی پیشانی کے رکھنے کی جگہ کو طاہر ہونا لازم ہے۔

طہارت شرعیہ یعنی رفع حدث:

حدث ایک قسم کی اندرونی نجاست کا نام ہے اس کے لیے سابقہ نجاستوں سے پاک ہونے کے علاوہ غسل یا وضو کی ضرورت ہوتی ہے جس حدث کے دور کرنے کے لیے غسل کی ضرورت ہو اسے حدثِ اکبر کہتے ہیں اور جس کے دور کرنے کے لیے وضو لازم ہوتا ہو اسے حدثِ اصغر کہتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے غسل یا وضو ممکن نہ ہو تو دونوں صورتوں میں تیمم لازم ہوتا ہے۔

چونکہ عام حالات میں زیادہ تر نماز وضو سے ہوتی ہے لہذا پہلے اسی کو بیان کیا جاتا ہے۔

وضو اگر پیشاب پاخانہ وغیرہ ہوا ہو یا سو چکا ہو اور ایسا کوئی امر ہو جس سے غسل واجب ہوتا ہے تو اب نماز کا وقت آنے پر وضو واجب ہوگا۔

وضو کی ترکیب قرآن مجید میں موجود ہے:۔

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین "جب نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو تو اپنے چہروں اور کہنیوں تک کے ہاتھوں کو دھوؤ اور مسح کرو اپنے سروں کا اور پیروں کا گٹوں تک"۔ اس میں صاف پیروں کا ذکر سر کے بعد مسح کے تحت میں ہوتا ہے اس سے پیروں کا مسح کیا جانا ہی ثابت ہوتا ہے جس پر فرقہ شیعہ کا عمل ہے۔

غسل غسل جو واجب ہیں وہ کچھ مرد و عورت میں مشترک ہیں اور کچھ عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں جو مشترک ہیں وہ جنابت، غسلِ اموات اور غسلِ مسِ میت ہیں اور جو عورتوں سے خاص ہیں وہ حیض و استحاضہ اور نفاس ہیں۔

ترکیب غسل کی سب میں ایک ہے کہ اگر حوض، نہر یا تالاب وغیرہ موجود ہو تو غسل ارتماسی ہو سکتا ہے کہ نیت کے ساتھ ایک دم غوطہ لگائے نہیں تو ترتیبی کرے۔ اور وہ اس طرح کہ نیت کے ساتھ پہلے سر و گردن دھوئے۔ پھر داہنا حصہ جسم کا، پھر بایاں حصہ۔ جو اعضاء وسط میں ہیں اور ایک ہی ہیں جیسے ناف وغیرہ انھیں دونوں طرف کے دھونے میں ملائے۔

ان میں سے ایک یعنی غسل مس میت کا وجوب فقہ جعفری سے مخصوص ہے یعنی جب روح جسم سے نکلنے کے بعد جسم سرد ہو جائے اور ابھی غسل میت نہ ہوا ہو تو جو شخص اس دوران میں جسم کو چھو لے اس پر غسل واجب ہو گا اسے فقہ اہل سنت میں واجب نہیں قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ احادیث میں وہاں بھی اس کا ذکر ہے۔

نماز کے دیگر شرائط

ستر عورتین: یہ شرط مرد اور عورت سب کے لیے ہے اس کے علاوہ سوا چہرے اور دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کے باقی تمام جسم کا چھپانا بھی لازم ہے۔ مرد کے لیے یہ ضروری ہے کہ لباس خالص ریشم کا نہ ہو نیز سونے کی کوئی چیز بطور زینت پہننا ناجائز ہے۔ عورت کے لیے یہ دونوں پابندیاں نہیں ہیں۔ بیشک ایک یہ پابندی سب کے لیے ہے کہ غیر ماکول اللحم کا کوئی جز لباس سے متصل نہ ہو اور لباس غصبی نہ ہو۔

قبلہ یعنی کعبہ کی سمت رخ ہونا۔ یہ نماز فریضہ میں بلاشبہ واجب و لازم ہے اور اس میں فرقِ اسلامیہ کے درمیان کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔

نماز واجب کے اقسام

نماز کی اصل شرع میں جو قسمیں واجب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

نمازِ پنجگانہ جو ہر شب و روز میں ہے اور ہفتہ کی ایک نماز جمعہ اور سال کی ایک عید الفطر اور عید الاضحیٰ (بقر عید) کی نمازیں اور خاص حالات سے متعلق نمازِ آیات جو چاند گہن، سورج گرہن اور زلزلہ وغیرہ میں ہوتی ہے۔

نماز جمعہ کا وجوب عینی اور اسی طرح نمازِ عیدین کا وجوب فقہ جعفری کے رو سے مشروط ہے اس امر کے ساتھ کہ امام معصومؑ کی قیادت میں وہ ادا ہو۔

اگر امام معصوم کی قیادت میں نہیں ہے تو پھر نمازِ جمعہ کو ہمارے اکثر علماء واجب تخییری سمجھتے ہیں یعنی جمعہ کے دن اختیار ہے کہ ظہر ادا کرے یا جمعہ ادا کرے بشرطیکہ جماعت کے

ساتھ ہو سکے ورنہ ظہر پڑھنا معیناً لازم ہے کیونکہ جمعہ فرادیٰ طور پر نہیں ہو سکتا۔

عیدین امام معصومؑ کی قیادت نہ ہونے کی صورت میں مستحب ہے۔ واجب نہیں ہے اور اسے فرادیٰ اور جماعت دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

ترکیب نماز

نماز کی ترکیب قرآن مجید میں تو ہے نہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عمل سے ثابت ہوئی ہے یعنی آپ نے نماز پڑھ کر دکھائی کہ اس طرح نماز پڑھا کرو اور رسولؐ کے عمل کو صحیح طور پر ان کے اہل بیت طاہرین علیہم السلام جیسا بتا سکتے ہیں دوسرے اجنبی افراد نہیں بتا سکتے چنانچہ شیعہ نماز کے اسی طریقہ پر قائم ہیں جو اہل بیت طاہرینؑ سے ثابت ہے جس کے امتیازی خصوصیات میں یہ ہے کہ نماز کے قیام میں ہاتھ کھلے رہیں۔ امام مالک جو مدینہ منورہ یعنی وطن رسولؐ کے باشندہ ہونے کی وجہ سے سیرت رسولؐ سے بہ نسبت بیرونی علماء کے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں وہ بھی اسی کے قائل تھے چنانچہ اہل سنت میں سے بھی مالکی حضرات عموماً ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورۂ حمد اور دوسرے سوروں کے ساتھ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ لازمی جزو ہے جسے بآوازِ بلند کہنا بہتر ہے۔ اس میں امام شافعی اور ان کے تابعین شیعوں سے متفق ہیں۔ اس کے علاوہ سجدہ میں یہ پابندی ہے کہ زمین یا نباتات زمین ہی پر سجدہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ کھانے اور پہننے کی چیز نہ ہو۔ آسانی کے لیے سجدہ گاہ رکھی جاتی ہے تاکہ کسی وقت دقت نہ ہو۔ احادیث اہل سنت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سجدہ کی جو کیفیت ثابت ہوتی ہے وہ اس کے مطابق ہے۔

حالت سفر میں ہر چہار رکعت والی نماز دو رکعت ہو جائے گی اسے قصر کہتے ہیں۔ قصر کا حکم قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے۔ نیز حالت سفر میں روزہ کو ترک کر کے کسی اور زمانہ میں اس کی قضا کا حکم بھی قرآن سے ثابت ہے جس پر فرقہ شیعہ کا عمل ہے۔

نماز جماعت نماز کا بجماعت ہونا افضل ہے اور اسکا ثواب عظیم ہے مگر شیعہ ہر کس و ناکس کی اقتداء میں نماز درست نہیں سمجھتے بلکہ جماعت کے لیے یہ ضروری ہے

کہ جس شخص کے پیچھے نماز پڑھے وہ عادل ہو۔

"عادل" کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کبیرہ سے کلیۃً پرہیز رکھتا ہو اور صغیرہ گناہ پر بھی اصرار نہ ہو یعنی اگر ہوتا ہو تو اتفاق سے عمل میں آتا ہو اس کا خوگر نہ ہو۔ اسکے علاوہ ایسی باتوں سے پرہیز کرے جو عام طور پر انگشت نمائی کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ باتیں "خلاف مروت" کہلاتی ہیں۔

نماز جماعت میں فقہ جعفری میں کچھ اور شرطیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ امام اور ماموم کے بیچ میں کوئی دیوار وغیرہ حائل نہ ہو ورنہ اقتدار درست نہ ہوگی بلکہ اسطرح کھڑا ہونا چاہیے کہ امام کو دیکھ رہا ہو یا ایسے شخص کو جو امام کا مشاہدہ کر رہا ہے اس کے علاوہ اگر امام اوپر اور ماموم نیچے ہو یعنی درمیان میں دو ایک سیڑھیاں ہوں تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

روزہ: سال کے ایک مہینے میں جو ماہ رمضان ہے شروع سے آخر تک ہر دن طلوع صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک روزہ واجب ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان اصل حکم میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور روزہ میں جن چیزوں کو ترک کرنا لازم ہے جنھیں "مفطرات صوم" کہتے ہیں ان میں بھی کوئی خاص اختلاف نہیں ہے مگر فقہ جعفری میں صرف سورج کا نگاہ سے چھپ جانا افطار کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ جب مشرق کی طرف کی سرخی دور ہو کر ذرا سیاہی چھا جائے اس وقت روزہ کھولنا چاہیے۔

قرآن مجید میں روزہ کی حد یہ بتائی گئی ہے کہ اتموا الصیام الی اللیل (یعنی "روزہ کو رات تک پورا کرو") اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صرف سورج کے آنکھ سے چھپ جانے پر رات کا اطلاق کسی طرح نہیں ہوتا۔

زکوٰۃ: قرآن میں زکوٰۃ کا اکثر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ اس پر واجب ہوتی ہے جس کے پاس بقدر نصاب مال سال بھر رکھا ہے۔ اس کے احکام میں فرق اسلامیہ کے درمیان بظاہر کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔

خمس: حقوق مالیہ میں زکوٰۃ کے علاوہ خمس کے متعلق قرآن مجید میں نص صریح موجود ہے واعلموا انما غنمتم من شیٔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمی

والمساکین وابن السبیل"۔ جو کچھ بطور مال غنیمت تمھیں حاصل ہو اس میں پانچواں حصہ خدا اور رسولؐ اور مخصوص صاحبانِ قرابت اور یتیموں، مسکینوں اور اپنے وطن سے دور افتادہ پریشان حال آدمیوں کا ہے"۔ اس نص کے بعد یہ تو گنجائش نکل سکتی تھی کہ "ما غنمتم" کی تشریح کے ماتحت ان اموال کی تعیین میں اختلاف ہوتا جن میں خمس واجب ہے چنانچہ علمائے شیعہ کے درمیان اس بارے میں کسی حد تک اختلاف ہے مگر اصل حکم خمس کو تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہونا چاہیے تھا مگر صورتِ واقعہ یہ ہے کہ صرف فقۂ جعفری کے پیروؤں میں یہ حکم قرآنی آج تک باقی سمجھا گیا ہے اور شریعت کے پابند افراد اس پر عامل ہیں باقی فقہ کے دوسرے مکاتب خیال میں خمس کو احکام شریعت سے خارج کر دیا گیا ہے جبکہ کوئی جواز از روئے قرآن نہیں نکلتا۔ یہ ایک اور حیرتناک بات ہے کہ سادات آلِ رسولؐ کے لیے دو خصوصی حکم از روئے شریعت ثابت ہیں۔ ایک یہ کہ زکوٰۃ غیر سادات کی ان پر حرام ہے اور دوسرے یہ کہ خمس میں انکا حق ہے۔ پہلا حکم ظاہری طور پر قرآن میں موجود نہیں ہے بلکہ سنت سے ثابت ہے اور دوسرا قرآن مجید میں موجود ہے لیکن شیعوں کو چھوڑ کر دوسرے مسلمانوں میں پہلا حکم تو مسلّما باقی رہا ہے جو سادات کے زکوٰۃ سے ممنوع ہونے کا تھا اور دوسرا جو سادات کو خمس کے ملنے سے متعلق تھا، فقۂ اسلامی سے خارج کر دیا گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حج زندگی میں ایک بار بشرطِ استطاعت حج ہر مسلمان پر فریضۂ لازم ہے جس پر تمام فرقِ اسلامیہ کے ساتھ فرقۂ شیعہ کا بھی ایمان ہے مگر خاص مسئلہ جو از روئے قرآن ثابت ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو خانہ کعبہ کے باشندہ نہ ہوں، دور سے جائیں "حج تمتع" لازم ہے یعنی پہلے عمرہ کا احرام باندھیں اور پھر عمرہ کے احکام پورے کرنے کے بعد اس احرام کو ختم کر دیں اور دوبارہ آٹھ ذی الحج کو حج کا احرام باندھ کر عرفات جائیں اور مناسک حج بجا لائیں۔ حضرت عمر نے اپنے دورِ خلافت میں نکاحِ متعہ کے ساتھ حج تمتع کو ممنوع قرار دے دیا۔ اسکے زیر اثر حج تمتع میں یہ تو نہیں ہو سکا کہ دوسرے مسلمان اسے ممنوع سمجھ لیں اور عمل بالکل ترک کر دیں مگر وہ اسے ضروری لازمی نہیں سمجھتے۔ شیعہ بمتابعت قرآن باہر سے جانے والوں کے لیے اسکو تعیین کے ساتھ لازم سمجھتے ہیں۔

اس کے علاوہ احرام کی کچھ پابندیاں مرد کے لیے فقہ جعفری میں زیادہ ہیں مثلاً بحالتِ رفتار سر پر سایہ کرنا درست نہیں ہے۔ یہ سب پابندیاں رسولؐ وآلِ رسولؐ کے احکام کی بناء پر ثابت ہیں جن پر عمل کرنا شیعوں کے یہاں ضروری ہے۔

جہاد

یعنی نصرتِ دین میں تلوار یا دوسرے خوں ریز اسلحہ کے ذریعے سے مقابلہ کرنا اس میں پیش قدمی کرنا شیعی فقہ کے رو سے بغیر معصوم کی سربراہی یا اجازت خاص کے نہیں ہو سکتی اس لیے کہ جان دینا شہادت اسی وقت قرار پا سکتا ہے جب فی سبیل اللہ ہو اور فی سبیل اللہ یعنی رضائے الٰہی کے صحیح معیار کی شناخت یقینی طور پر معصوم ہی کی نگاہ کر سکتی ہے۔

ہاں جب کوئی حملہ آور ہو تو دفاعی طور پر جنگ کرنا بہرصورت درست ہے۔

maablib.org

مذہب شیعہ اور تبلیغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید المرسلین وآلہ الطاہرین

اسلام میں تبلیغ کی اہمیت

اسلام تبلیغی مذہب ہے اور جب سے اس کی بنیاد پڑی تبلیغ کا پہلو اس کے تعلیمات کا جزو اعظم اور اس کے آئین و اصول میں پیش پیش رہا۔ اس کا نشو و نما، ترقی و وسعت اور اسکی ابتدائی و انتہائی کامیابیاں سب تبلیغ ہی کے ذریعہ سے ہیں۔ اور یہی اس کی ہر دلعزیزی و مقبولیت کا راز ہے۔

وہ لوگ جو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ تلوار کو قرار دیتے ہیں انھیں اس پہلو پر غور کر لینے کی ضرورت ہے کہ تلوار اٹھانے کے لیے خود ایک طاقت و قوت درکار ہے اور اس طاقت و قوت کا حصول تلوار کا رہین منت نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ ذریعہ کہ جو اسلامی ترقیوں کے لیے سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ وہ رسول کی قولی عملی تبلیغ ہی ہے اور کچھ نہیں۔

روحانیت فنا ہو چکی تھی - مذہب کی عمارت میں اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ انسانیت کے خط و خال بگڑے ہوئے تھے اور بہیمیت و حیوانیت کا دور دورہ تھا۔ رواداری و ہمدردی بے معنی الفاظ بن چکے تھے۔ اور گمراہی و ضلالت کا سیلاب پوری طاقت کے ساتھ بڑھا ہوا تھا۔ اس تاریک دور شرک و جاہلیت میں ایک زلزلہ خیز نعرۂ توحید تھا جو قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا کی آواز کے ساتھ زمین و آسمان کی درمیانی فضاؤں میں گونجا تھا۔ اور جس میں وہ

قوتِ انقلاب تھی کہ جس نے عالم کو کایا پلٹ کر دیا اور بڑی سے بڑی مادی طاقتوں کو شکست دی۔

اس میں وہ مقناطیسی جذب تھا جس نے قوتِ احساس رکھنے والے قلوب کو ایک غیر مصنوعی کشش کے ساتھ کھینچ لیا۔ اور ان کے جسم و روح، طرزِ عمل اور نظامِ زندگی میں وہ غیر معمولی انقلاب پیدا کیا کہ وہ ایک نئے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ ونحن لہ عابدون)

یہ مختصر کلمۂ توحید اگر کسی فوج و لشکر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر اس میں تلوار کی برش، نیزہ کی چمک اور توپ کی گرج ہے تو یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اسلام تلوار کی قوت اور فوج و لشکر سے پھیلا ہے اور اگر ایسا نہیں بلکہ وہ صرف ایک روادارانہ دعوتِ حق اور تبلیغ حقانیت ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کی نشر و اشاعت کا ذریعہ تبلیغ حق اور بس تبلیغ۔

وہ انذر عشیرتک الاقربین کی مخصوص و محدود دائرہ میں دعوت ہو یا قم فانذر کا عمومی حکم، اس کی تعبیر بہرحال تبلیغ ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے اور انما انت منذر میں رسولِ اسلام کے فرائض کو صرف تبلیغ میں منحصر کرتے ہوئے انا ارسلناک کافۃ للناس بشیراً ونذیرا میں انکے دعوتِ حقانیت کے صرف دو پہلوؤں کو روشن کیا گیا ہے ایک بشارت اور دوسرے انذار یعنی وعدۂ جنت اور وعید نار جو تبلیغ ہی کے دو شعبے ہیں اور ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن کے جامع الفاظ سے تبلیغ کا دستور عمل اور واضح کارگذاری پیش کیا گیا ہے جس کے مندرجہ ہدایات کے مطابق تبلیغ کے فریضہ کو انجام دیے

ہونا چاہیے۔ اور ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر کے حکم محکم سے ہمیشہ کے لیے دعوت و تبلیغ کے سلسلہ کے باقی رہنے کی پیش بندی کی گئی جس پر کاربند ہونا ہر زمانہ میں فرض کی حیثیت سے لازم ہوا۔

ان آیات میں غور کرنے سے صاف یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نشرو اشاعت کے سلسلہ میں جو خاص طریقہ کار مقرر کیا گیا ہے وہ دعوت و تبلیغ ہے اور اسی کو برابر ہر صورت سے نمایاں کیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے لیکن نشرو اشاعت کے سلسلہ میں فوج کشی و صف آرائی وہ اسلام کے اصول اساسی میں کسی جگہ نظر نہیں آتی، ورنہ ادع الی سبیل ربک کے الفاظ میں سب سے پہلے یا بعد دعوت بالسیف کا تذکرہ ضرور ہوتا۔

بلکہ لا اکراہ فی الدین - افکرہ الناس حتیٰ یکونوا مومنین مآانت علیھم بمصیطر کے الفاظ میں جبر و قہر کی نفی کی گئی ہے اور مآ علی الرسول الا البلاغ کہہ کر رسول کے فرض کو حصر کے ساتھ تبلیغ میں معین کیا گیا ہے۔

تاریخ اسلامی کا سرسری نظر سے مطالعہ بھی اس امر کے اندازہ کے لیے کافی ہوگا کہ رسول اسلام کے طرز عمل میں بھی یہ پہلو پیش از پیش ملحوظ تھا اور وہ دعوت و تبلیغ کے فرض کو اپنا اولین نقطہ نظر سمجھتے تھے اور وہی آپ کی صداقت کا اصلی جوہر اور آپ کی کامیابی کا حقیقی رمز تھا، مکہ کی فضا جہاں تین سو ساٹھ بتوں کی ثنا و ستائش کا غلغلہ بلند تھا وہاں دعوت حقانیت کا ایک حیرت انگیز مجسمہ اپنی خاموش و پرامن تبلیغ میں مصروف تھا اور دنیا کی باطل طاقتوں کو اپنے روحانی پیغام کے بے شور و شر نغموں سے متزلزل بنائے ہوئے تھا۔

مہاجرین کی پوری جماعت جس کے کارنامۂ عمل سے اسلامی تاریخ کے ورق آج تک لبریز ہیں بلکہ انصار کی بھی جماعت جن کی فداکاری وجاں نثاری کے پُرصداقت عہدو پیمان رسول کی ہجرت کے لیے محرک ہوئے۔ وہ سب اسی خاموش تبلیغی دور کے نتائج ہیں اور اسلامی کامیابیوں اور سربلندیوں اور اس کے سنہری واقعات کا تعلق زیادہ تر اسی جماعت کے ساتھ ہے ورنہ اسلام کے آخری زمانہ میں اور اسلامی مجاہدات کے بعد جو مدافعانہ ضروریات سے مجبور ہو کر کیے گئے تھے جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان میں سے تو بیشتر مولفۃ القلوب اور ادنیٰ درجہ کے اشخاص ہیں جن کا اسلام کے روشن وزریں خصوصیات میں نہ کوئی ہاتھ ہے اور نہ کوئی تعلق۔ اس سے یہ نتیجہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا حقیقی جوہر نشر و اشاعت دعوت و تبلیغ تھا اور اس کے بہترین نتائج کامیابی صرف اسی کا نتیجہ ہیں اور ہیں۔

علاوہ ان کارگذاریوں کے جو رسالتمآبؐ بذات خود تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں انجام دے رہے تھے، حضرت نے تبلیغی کام کو وسیع پیمانہ پر آگے بڑھانے کے لیے تبلیغی وفود بھی روانہ فرمائے جن میں ملک حبش، فارس اور اسکندریہ ایسے دور دراز ممالک بھی شامل ہیں اور یمن کی جانب اپنے ابن عم امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب کو یہ کہکر روانہ فرمایا کہ لان یھدی اللہ بک واحدا خیرلک من الدنیا وما فیھا "تمہارے ہاتھ سے ایک شخص کی ہدایت ہو جائے تو یہ تمہارے لیے تمام دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔"

اس وقت بھی کہ جب اسلام کا مجاہدانہ دور شروع ہو چکا ہے رسالت مآبؐ کے طرزِ عمل سے یہ امر صاف نمایاں ہے کہ آپ کا اصل نقطۂ نظر جنگ کرنا اور فتح و ظفر حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ آپ حتی الامکان ایسے مواقع بہم پہنچاتے ہیں کہ جنگ کی

نوبت نہ آئے۔

حدیبیہ کی صلح میں جو اکثر جنگجو طبائع پر گراں بھی گزری یہ پہلو بہت زیادہ نمایاں ہے اسلام کے احکام شرعی اور فرائض مذہبی میں بھی جہاں تک دیکھا جائے بہت زائد تبلیغی مفاد مدنظر رکھا گیا ہے۔

پانچوں وقت کا بلند بانگ نعرۂ توحید جو اذان کی صورت سے بلند ہوتا ہے وہ اسی تبلیغ کی غرض سے ہے اور نماز جماعت کا حکم اور اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا اہتمام اور پھر حج میں تمام اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر مجتمع ہونے کی دعوت شوکت اسلامی کے مظاہرہ کی نہایت واضح حیثیت رکھتی ہے۔

رسالتمآب کی زندگی کے آخر کا سب سے بڑا عظیم الشان واقعہ وہ بھی حضرت کی تبلیغی زندگی کا انتہائی اہم باب ہے جس کے متعلق خاص طور سے حضرت احدیت کی طرف سے حکم محکم نازل ہوا تھا کہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس اور اسی فرض تبلیغ کے ادا ہونے کے بعد یہ پیغام پہنچا تھا کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا اور رسالتمآب نے اس تبلیغ کو ہمہ گیر وغیر محدود بنانے کے لیے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں یہ ارشاد فرمایا کہ فلیبلغ الشاھد الغائب اس وقت موجود رہنے والوں کا فرض ہے کہ وہ ان تک جو موجود نہیں ہیں اس کی تبلیغ کر دیں۔

رسولؐ اسلام کے بعد مسلمانوں کے زاویۂ نظر میں اختلاف

مذکورہ بالا واقعات اور نیز اسلامی تاریخ کے ہر حصہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رسالتمآب کی زندگی کا حقیقی نصب العین اور نقطۂ نظر تبلیغ تھا اور وہی اسلام کی

ترقی و اشاعت کا واحد ذریعہ ہے اور اس درمیان میں رسالتمآب کا تلوار اٹھانا اور میدان جنگ میں آنا صرف ضمنی حیثیت رکھتا ہے جو موانع کے رفع کرنے اور جارحانہ طاقتوں کے دفع کرنے کے لیے تھا۔ اور اس کو براہِ راست اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لیکن انسانی افراد کا بیشتر حصہ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر تنگ نظر او ظاہر بیں ہوتا ہے وہ اپنے پست خیالی اور مادہ کے قیود میں گرفتاری کی وجہ سے ہرایت کے وجوہ و اسباب کو مادیات میں تلاش کرتا ہے۔ اور ایک بات کو نکال کر اسی کو واحد سبب قرار دے لیتا ہے اور اس لیے اسلام کی نشر و اشاعت کو جو تمام تر روحانی تعلیم و تلقین اور دعوت و تبلیغ پر مبنی تھی۔ مادی طاقت و قوت کا نتیجہ خیال کر کے بہت سے اس کے مخالفین یہ کہنے لگے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اور اس کی ترقی و اشاعت صرف جنگ و خونریزی کا نتیجہ ہے۔

ہمیں ان سے شکایت ہے اور بجا شکایت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جذبۂ عداوت اور تعصب اور ذوقِ اعتراض و نکتہ چینی کی بنا پر اسلامی تاریخ کے واقعات کو انصاف اور صبر و سکون کے ساتھ پڑھا ہی نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے اور اس وقت ہمارے حیرت اور افسوس کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود مسلمانوں نے رسالتمآب کی کامیابی اور اسلام کی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی و اشاعت کے حقیقی فلسفہ پہ غور نہیں کیا۔ اور وہ اس میں صحیح نقطہ پر نہ پہنچ سکے۔

رسالتمآب کے بعد مسلمانوں میں جو افتراق پیدا ہوا اور وہ اقلیت و اکثریت دو حصوں میں منقسم ہو گئے اس میں اکثریت نے یہی سمجھا کہ رسولؐ کی کامیابی کا حقیقی راز صرف تلوار میں مضمر تھا۔ اور جب ہی انھوں نے بڑی کشادہ حوصلگی کے

ساختہ تلوار کھینچ لی اور بے دھڑک دوسروں کے مقابلہ پر اس کا استعمال شروع کر دیا اور آس پاس کے ممالک پر فوج کشی اور حملہ آوری میں پوری طاقت صرف کر دی اور اس طرح دنیا کے امن و امان کو خاک میں ملا کر اسلام کو جو سلم یعنی صلح پسندی سے مشتق ہے ، امن و امان کا دشمن ثابت کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اغیار کا یہ الزام کہ "اسلام تلوار سے پھیلا" اس کی ذمہ داری بہت کچھ ان ہی اہل اسلام کے سر ہے جنھوں نے عملی طور پر اسلامی مفاد اور رسالتمآب کے نصب العین اور مقصد نظر کی غلط ترجمانی کی اور یہ ثابت کیا کہ اسلام کی ترقی و اشاعت تلوار کھینچنے پر موقوف ہے۔ ایک طرف تو تیغ آزمائی و صف آرائی میں یہ انہماک اور دوسری طرف اسلام کے حقیقی مفاد یعنی علمی تحقیقات اور مذہب کی حقیقی تبلیغ و تعلیم کو اس طرح پامال کر دیا کہ وہ فنا کے قریب پہنچ جائے ، وہ دور کس حد تک روشن کہے جانے کے قابل ہے جس میں معارف و حقائق کا چرچا نہ رہے ، فلسفۂ الٰہیات اور علم کلام کے مسائل گوشۂ گمنامی میں پڑ جائیں۔ تصنیف و تالیف کا دروازہ بند ہو اور روایت احادیث پر سخت پابندیاں عائد ہوں ، کتب علمیہ کی چھان بین اور جستجو تو کجا ، علمی تحقیقات کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں۔

علمی دنیا میں یہ امر کیا اچھی نظر سے دیکھا جا سکتا ہے کہ اس عصر میں اگر کسی شخص کے دل میں کوئی شبہہ پیدا ہو اور وہ کسی مذہبی مسئلہ کے متعلق تحقیقات کرنا چاہتا ہو تو عوض اس کے کہ اس شبہہ کو حل کیا جائے اور اس کی تسکین کی کوشش کی جائے اس کو تازیانہ سے تنبیہہ کی جاتی تھی۔ اور اکثر ضرب شدید تک نوبت پہنچا دی جاتی تھی۔

ملاحظہ ہو امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم ، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

بسیدنا عمر سدّ باب الکلام والجدل وضرب صبیغا بالدرة لما ورد علیه سؤالا فی تعارض ایتین من کتاب الله تعالیٰ وھجرہ وامر الناس بھجرہ" سیدنا عمر نے علم کلام اور مذہبی بحث کے دروازہ کو بند کر دیا اور انہوں نے ایک شخص کو جس کا نام صبیغ تھا دُرّہ سے مارا جب اس نے آپ سے قرآن مجید کی دو آیتوں کے باہمی اختلاف کے متعلق سوال کیا اور اس کو جلا وطن کر دیا اور تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس سے قطع تعلق کر دیں۔"

شارح قاموس سید مرتضیٰ زبیدی اپنی کتاب اتحاف السادة المتقین فی شرح احیاء علوم الدین مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۱۹۸ میں مذکورہ بالا عبارت کے تحت میں لکھتے ہیں:-

"رأیت بخط الحافظ الذھبی فی کتاب لہ سماہ نعم السمر فی سیرة عمر ما نصہ حدثنا مکی بن ابراھیم حدثنا الجعد بن عبد الرحمٰن عن یزید بن خصیفة عن السائب بن یزید قال اتی رجل عمر فقال یا امیر المؤمنین انا لقینا رجلا یسأل عن تاویل القران فقال اللھم مکنی منہ فبینا عمر جالس اذ جاءہ وعلیہ عمامة وثیاب فقال یا امیر المؤمنین والذاریات ذروا فالحاملات وقرا قال عمر انت ھو فقام الیہ وحسر عن ذراعیہ فلم یزل یجلدہ حتی سقطت عمامتہ فقال والذی نفس عمر بیدہ لو وجدتک محلوقا لضربت بہ راسک البسوہ ثیابہ واحملوہ علی قتب واخرجوہ حتی تقدموا بہ بلادہ ثم لیقم خطیبا فلیقل

ان صبیغا اتبغی العلم فاخطأہ فلم یزل وضیعا فی قومہ حتی ہلک وکان سید قومہ"

"حافظ ذہبی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تصنیف "نعم السمر فی سیر عمر" میں مسلسل سند کے ساتھ تحریر ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر کی خدمت میں آکر بیان کیا کہ ایک شخص ہے جو تاویل قرآن کے متعلق کوئی سوال پیش کرتا ہے، یہ سنکر حضرت عمر نے کہا خدا کرے وہ میرے ہاتھ آجائے، اتنی دیر میں وہ شخص آگیا، اس کے سر پر عمامہ تھا اور جسم پر اچھا خاصہ لباس تھا اس نے کہا یا امیر المومنین یہ آیت ملاحظہ ہو۔ والذاریات ذرواً فالحاملات وقرا۔

حضرت عمر: "اچھا تو ہی وہ ہے۔" بس یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور آستینیں چڑھا کے کوڑے مارنا شروع کر دیے اتنے کوڑے لگائے کہ اس کا عمامہ گر گیا اور کہا کہ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں عمر کی جان ہے اگر میں تیرا سر منڈا ہوا پاتا، تو تیرے سر پر بھی کوڑے لگاتا۔" اچھا اب اس کو اس کے کپڑے پہناؤ اور اس کو ایک اونٹ پر سوار کر کے یہاں سے نکال باہر کرو اور جب یہ اپنے شہر پہنچے تو وہاں کھڑے ہو کر عام اعلان کرے کہ صبیغ کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن غلط راستہ اختیار کیا۔

بس وہ دن تھا کہ اس کے بعد سے صبیغ اپنی قوم میں ذلیل ہو گیا حالانکہ وہ اپنی قوم میں سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے اہل بصرہ کو لکھ دیا اس کے ساتھ نشست برخاست نہ کرنا۔

ابو عثمان نہدی کا بیان ہے کہ "کان لو اتانا ونحن مائۃ تفرقنا عنہ" جب وہ آجاتا تھا تو سو آدمی بھی ایک جگہ بیٹھے ہوتے تو وہ سب فوراً متفرق ہو جاتے تھے۔"

سلیمان بن یسار کا بیان ہے کہ ان صبیغ بن عسل قدم المدینۃ فجعل یسأل عن المتشابہ فبعث الیہ عمر و اعد لہ عراجین النخل فلما حضر قال لہ من انت قال عبد اللہ صبیغ قال وانا عبد اللہ عمر ثم قام فضرب راسہ بعرجون فشجہ ثم تابع ضربہ حتی سال الدم علی وجہہ فقال حسبک یا امیر المومنین فقد واللہ ذہب ما کنت اجد فی راسی

صبیغ بن عسل ایک شخص تھا وہ مدینہ آیا اور بعض متشابہ آیتوں کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ حضرت عمر نے اس کو بلوا بھیجا اور پہلے سے بہت شاخیں درخت خرما کی اپنے پاس رکھوا لیں جب وہ آیا تو حضرت عمر نے پوچھا تو کون ہے اس نے کہا کہ خدا کا بندہ صبیغ۔ عمر نے کہا اور میں ہوں خدا کا بندہ عمر۔ یہ کہہ کر اٹھے اور ایک شاخ خرمے کی لیکر اس کے سر پر ماری جس سے اس کے زخم آگیا۔ پھر برابر اس کو مارتے رہے یہاں تک کہ خون بہہ کر اس کے چہرے پر آگیا۔ اس نے کہا بس بس یا امیر المومنین کافی ہے۔ اب وہ خیال میرے دماغ سے نکل گیا جو گردش کر رہا تھا۔"

یہ الفاظ بہت معنی خیز ہیں جبر و تشدد اور سختی و تعزیر اگر کسی علمی اعتراض اور الجھن دماغی کے لیے تسکین کا ذریعہ بن سکتی ہے تو بے شک حضرت عمر کی یہ کاوش نتیجہ خیز ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

ابن سیرین کہتے ہیں کتب عمر الی ابی موسیٰ ان لا یجالس صبیغ وان یحرم عطاءہ ورزقہ

حضرت عمر نے ابو موسیٰ اشعری کو جو بصرہ کے حاکم تھے لکھا تھا کہ صبیغ کے پاس کوئی بیٹھے اٹھے نہیں اور بیت المال سے جو اس کا مقررہ ماہوار وظیفہ ہے وہ بند کر دیا جائے۔

سیتیب کی روایت ہے کہ انہ حلف لابی موسیٰ الایمان المغلظۃ ما یجد فی نفسہ مما کان شیئاً فکتب فی ذلک الی عمر فاجابہ اظنہ محل صدق فخل بینہ وبین الناس۔

صبیغ مذکور نے ابو موسیٰ سے بڑی سخت قسمیں کھا کر بیان کیا کہ اب بالکل وہ سابقہ خیالات اس کے دل میں نہیں رہے، ابو موسیٰ نے اسے حضرت عمر کو لکھا، انھوں نے فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ سچ کہتا ہے اس کے بعد سے لوگوں کو اس سے ملنے جلنے کی ممانعت نہیں رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہبی سوال پر سختی و تشدد کسی طرح مناسب نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سختی و تشدد کے بعد معترض کا یہ کہہ دینا کہ اس کی تسکین ہو گئی اس کے تسکین قلب کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس قسم کے طرز عمل سے عام افراد کو یہ خیال قائم کر لینے کا موقع مل سکتا ہے کہ سوال لاجواب تھا اور سوائے مظاہرۂ جبر و تشدد کے اس کا کوئی حل موجود نہ تھا۔

اس دور میں تصنیف و تالیف اور کتابت علوم و معارف کا کام بھی جو مفید ترین شعبہ ہے ایک مخصوص نظریہ کے ماتحت صرف نظر انداز نہیں بلکہ ممنوع قرار پا گیا تھا اور مسلمانوں کو علمی و مذہبی آثار کے قلمبند کرنے سے منع کیا جا رہا تھا۔

وہی مخصوص نظریہ جس کی بناء پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتابت قرطاس کو بلا ضرورت سمجھا تھا۔ اسی کی بنا پر اب عام ارباب قلم کو کتابت احادیث سے منع کیا جاتا تھا۔ اور فرمایا جاتا تھا کہ لاکتاب مع کتاب اللہ۔ خدا کی کتاب کی موجودگی میں اب کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے"

امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح کے شروع میں دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے۔ اختلفوا فی کتابۃ الحدیث فکرھھا طائفۃ منھم عمر بن الخطاب

"احادیث کے قلمبند کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے جن میں سے حضرت عمر ہیں"

عروہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے احکام حلال وحرام کے قلمبند کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر بعد میں آپ کی رائے میں تبدیلی ہوئی۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ انی کنت ارید ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیھا وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشیئی ابدا۔

"میرا ارادہ ہوا تھا کہ احادیث کے قلمبند کرانے کا انتظام کروں لیکن مجھے خیال آیا کہ بہت سے لوگ سابقہ امم، اقوام میں انھوں نے کتابیں تصنیف کیں تو ان ہی کتابوں کے ہو رہے اور کتاب خدا کو ترک کر دیا۔ میں خدا کی قسم کتاب خدا کے ساتھ کسی چیز کی آمیزش میں ہونے دوں گا"

دوسرے لوگوں میں بھی بعض افراد نے اس خیال میں آپ کے ساتھ اتفاق کیا۔ ابن سیرین کہتے تھے، انما ضلت بنو اسرائیل بکتب ورثوھا عن ابائہم۔ "بنی اسرائیل جو گمراہ ہوئے وہ ان ہی کتابوں سے جو باپ دادا سے انھیں پہنچی تھیں"

زہری کا قول ہے کہ تا نکرہ کتاب العلم "ہم لوگ علمی مطالب کے قید تحریر میں لانے والوں کو ہمیشہ بری نظر سے دیکھتے تھے۔"

یہ تو علمی و تبلیغی شعبوں کی خانہ ویرانی تھی لیکن اس کے برخلاف فوج کشی وصف آرائی میں انہماک۔ آس پاس کے ممالک پر جارحانہ حملوں کا جوش، اسلامی مملکت کی توسیع کا خیال اور فتح و ظفر کا خروش جس کی بنا پر اس زمانہ کو نشر و اشاعت اسلام کا سب سے زائد زریں دور کہا جاتا ہے وہ اعلیٰ پیمانہ پر جاری تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کے ذمہ دار افراد نے نشر اسلام کے رمز کو علوم و معارف کی وسعت حقائق مذہب کی تعلیم، اخلاق جمیلہ کی تلقین اور سیرت نبیؐ کی عملی حیثیت سے تبلیغ میں مضمر نہ سمجھا تھا، بلکہ تلوار اور صرف تلوار ہی میں۔

لیکن وہ جماعت کہ جو اقلیت میں تھی اور شروع میں اتنی کم کہ شمار میں آنے کے قابل نہ تھی۔ اس نے نشر و اشاعت حق کے اصل مرکز کو سمجھ لیا تھا اور اس جوہر کی حفاظت میں اس نے پوری کوشش صرف کی اور اس نقطۂ نظر کی تبلیغ میں جسے وہ سچائی کے ساتھ حقیقی اسلام کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتی تھی۔ پرامن تبلیغ و تلقین کے سلسلہ کو اختیار کیا اور ملک کی پرامن فضا کو مکدر کیے بغیر وہ اشاعت حق کے فرض کو انجام دیتی رہی۔

یہ جماعت شیعی جماعت ہے جس کی ابتدا رشد و نما، ترقی و وسعت سب تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ سے ہوئی اور اس نے اس فرض کو پوری جانفشانی و تندہی کے ساتھ انجام دیا۔

مذہب شیعہ کی سب سے پہلی تبلیغ

یہ امر تاریخی حیثیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد سب سے پہلی جماعت جس نے اکثریت اور دیدبۂ حکومت کے خلاف تبلیغ حق کی آواز بلند کی ہے وہ صحابۂ کرام میں سے بارہ آدمیوں کی جماعت تھی۔ خالد بن سعید بن العاص۔ ابی بن کعب ابوذر غفاری، مقداد بن اسود کندی، عبادہ بن صامت، سلمان فارسی۔ ابوالہثیم بن تیہان، عمار بن یاسر، خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین، سہل بن حنیف، ابوایوب انصاری، جابر بن عبداللہ۔

یہ لوگ تھے جنھوں نے ابتدائی دور میں مسجد نبوی کے اندر نماز جمعہ کے بعد ہی کھڑے ہو کر باری باری اعلان حق کے فرض کو انجام دیا۔ اور انتہائی جرأت کر کے ایمانی قوت اور جوش وخروش کے ساتھ بسیط تقریروں میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔

علامہ فضل بن شاذان نے جو دوسری صدی ہجری کے محدث اور مورخ ہیں ان تقریروں کو اپنی کتاب رجال میں مکمل طور سے درج کیا ہے۔ اور صدوق ابن بابویہ قمی کی کتاب امالی اور طبرسی کی کتاب الاحتجاج میں بھی ان کا تذکرہ ہے

یہ مذہب شیعہ کی سب سے پہلی تبلیغ تھی جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اس اعلان کے ساتھ ادا کی گئی اور یہی حضرات وہ تھے جنھوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انتہائی پر امن طریقہ سے مذہب تشیع کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔

سلسلۂ تبلیغ میں پہلا دورۂ سفر حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے تبلیغ کے دائرہ کو وسیع کیا اور مذہب شیعہ کو حجاز کی چو حدی سے باہر دوسرے ملک میں شائع ومنتشر کیا۔ اس وقت جب حضرت عثمان نے

ان کو شام بھجوا دیا ہے اور ملک شام کے پائے تخت "دمشق" میں ان کا رہنا حکومت شام کے ملکی مصالح کے خلاف ثابت ہوا تو ان کو شام کے بیرونی دیہات اور کوہستانی علاقہ کی طرف جس کا نام "جبل عامل" ہے روانہ کر دیا گیا۔ یہاں انھیں شیعیت کی تبلیغ کا کافی موقع مل گیا۔ اور سب سے پہلے جس قریہ میں ان کا داخلہ ہوا وہ "میس" ہے اور اسی نے پورے طور سے ان کی دعوت پر لبیک کہی۔ دوسرا قریہ "صرفند" ہے جہاں کے رہنے والوں نے تشیع کو قبول کیا اور یہاں حضرت ابوذر کے نام کی ایک مسجد اور زیارت گاہ بطور یادگار اب تک قائم ہے (العرفان ج ۲ ص ۴۶۲)

اسی سلسلۂ تبلیغ میں ان کو وہ سخت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں جن کا آخری دلسوز نتیجہ "ربذہ" کے بے آب و گیاہ چٹیل میدان غربت میں ایک حسرتناک موت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تبلیغ شیعیت کے مختلف دور

بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنت میں تشیع کا نام بھی لینا جرم سمجھا جاتا تھا اور کیا مجال تھی کہ کوئی شخص عقیدۂ تشیع کا اظہار بھی کر سکے۔

مگر مبارک تھیں وہ ہستیاں جنھوں نے سلطنت وقت کے تمام جاہ و جلال، شوکت و جبروت، کے باوجود اپنے فریضۂ تبلیغ حق میں کوتاہی نہیں کی۔ انھوں نے قید و بند کی سختیاں گوارا کیں سولیوں پر جانا اور تلواروں سے گردنوں کا قلم ہونا منظور کر لیا مگر کھنچی ہوئی تلواروں کی چھاؤں میں بھی ان کی زبانیں اعلائے کلمۂ حق میں مصروف رہیں۔

اموی سلطنت کے دور میں حجر بن عدی، میثم تمار، رشید ہجری اور آخر میں سعید بن جبیر تابعی اور بنی عباس کے دور میں ابن سکیت نحوی وغیرہ، شہدائے راہ حق ہیں جنھوں نے حق گوئی کے جرم میں پاداش قتل کو برداشت کیا۔

بہت سے کارپردازان تبلیغ تھے جنھوں نے تقیہ نہیں کیا، جیسے کمیت بن زید اسدی جن کی زلزلہ افگن شاعری سرتاسر تبلیغ مذہب کا پہلو لیے ہوئے تھی اور اسی طرح فرزدق، دعبل، سید حمیری وغیرہ۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے زمانہ میں تقیہ کی پابندیاں بہت کم تھیں، اس لیے شیعی علم کلام نے خوب ترقی کی اور مبلغین کو ایک حد تک آزادی سے دعوت و تبلیغ کا موقع ملا۔

ان میں ہشام بن حکم، ہشام بن سالم، قیس ماصر، مومن الطاق وغیرہ بڑے متکلمین ہیں جنھوں نے مناظرات و مصنفات کے ذریعہ سے مذہب شیعہ کے بڑے خدمات انجام دیے۔

اصحاب ائمہ کا دور ختم ہونے کے بعد علمائے مذہب کا دور شروع ہوتا ہے جس میں تبلیغ مذہب کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔

ان میں سے ہر دور کے سرآمد مبلغین اور ان کے علمی و تبلیغی خدمات کا تذکرہ بہت زیادہ بسط و تفصیل کا محتاج ہے جس کے لیے اگر زمانہ مہلت دے اور توفیق الٰہی شامل حال

ہو تو ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ اس وقت نہ تو وقت ہے اور نہ موقع و محل کا اقتضاء ان تمام مبلغین کے تذکرہ کی اجازت دیتا ہے۔

مملکتِ ایران میں صفوی سلاطین خدا ان کی روحوں کو اپنی رحمتِ کاملہ سے سیر و سیراب فرمائے، انھوں نے ایران میں مذہبِ شیعہ کی نشر و اشاعت میں پورے انہماک کے ساتھ (مگر بزورِ شمشیر نہیں) کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے کہ ایران پورا ایک شیعی ملک کی شکل میں آگیا۔

ہندوستان میں مذہب شیعہ کی تبلیغ

ہندوستان میں شیعی

مذہب کی تبلیغ کا سہرا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایرانیوں کے سر ہے اور ان میں بہت زیادہ سادات کو خصوصیت ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے زرخیز اور مال و دولت کا خزانہ مشہور رہا ہے۔ اس لیے غیر ممالک کے لوگ جب پریشانی میں مبتلا ہوتے تو سب سے پہلے اپنے درد کا درمان یہی سمجھتے تھے کہ ہندوستان چلے آئیں۔

یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں شریف مسلمانوں کے خاندان بہت کم ایسے ہوں گے جن کا رشتہ ایران و عراق سے جڑا ہوا نہ ہو۔

سلاطینِ مغلیہ کے دورِ حکومت میں بڑے بڑے ارکانِ دولت اور ذمہ دار اجزائے مملکت زیادہ تر ایرانی نژاد اور

شیعہ تھے۔ اور ان ہی کے ذریعے سے علمائے شیعہ کا جو زیادہ تر ایرانی یا عراقی ہوا کرتے تھے سلسلۂ آمد و رفت قائم تھا اور اکثر حضرات کو ان میں سے یہاں قیام کا موقع حاصل ہوتا تھا۔

صوفیت کے برعکس نے میرے خیال میں تشیع کی پرورش میں بڑا کام کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر صوفیائے کرام کے خیالات بعض امور میں شیعوں سے ملتے جلتے اور ان کے قریب ہوتے ہیں اور کم از کم ان کو تعصب شیعوں سے اتنا نہیں ہوتا جتنا دوسرے بہت سے افراد کو۔ حیدر آباد میں شیعیت کی تبلیغ اسی تصوف کے پردے میں شاہ طاہر رحمۃ اللہ علیہ نے کی جو ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت ہے اور تاریخ کی رو سے ناقابل انکار امر کہ اس تمام طول طویل مدت میں شیعی افراد کتنے ہی برسراقتدار ہوئے اور حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور جاہ و منصب حاصل کیے، مگر ان کی ترقیاں شخصی و انفرادی تھیں۔ اجتماعی و مذہبی حیثیت سے کوئی تبلیغ و اشاعت مذہب کی اس دور میں نظر نہیں آتی۔

اس اعتبار سے اولیت کا شرف صرف ایک مجاہد ملّی کو حاصل ہے۔ جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے پیدا ہوا اور جس نے اپنے ثبات و استقلال، ولولۂ عمل، اخلاص قلب اور جوش مذہبی سے زمین کو آسمان بنا دیا۔

اور ہندوستان بالخصوص صوبۂ اودھ کی مذہبی فضا میں وہ تشیع کی روح پھونکی جس کے روز افزوں نتائج آج شیعوں کی اڑھائی کروڑ کے قریب مردم شماری کی صورت میں نظر آ رہے ہیں۔

یہ بزرگ ہستی مجددِ ملتِ حقہ حضرت غفرانمآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ کی تھی جنھوں نے عراق و ایران سے تکمیلِ علوم کرکے ہندوستان مراجعت کی اور لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر شیعیت کا عملی حیثیت سے سنگِ بنیاد قائم کیا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سب سے پہلی نماز جماعت جو اس ملک میں شیعوں کی منعقد ہوئی ہے وہ ۲۷ رجب ۱۲۰۰ھ کو مسجد حسن رضا خاں واقع[1] گول دروازہ لکھنؤ میں تھی جس میں جناب غفرانمآب مقتدا اور بادشاہ مع ارکانِ دولت اور عام مومنین شہر مقتدی تھے۔ اس کے قبل کوئی نماز جماعت شیعوں کی اس ملک میں نہ ہوئی تھی۔

انھوں نے "عماد الاسلام" لکھ کر ملتِ حقہ کی ناقابل تزلزل بنیاد قائم کی اور "ذوالفقار" "صوارم" "حسام" سے جہاد مذہب میں بیش قیمت کارنامے پیش کیے۔

ان کی اولاد اور تلامذہ نے ان کے قائم کیے ہوئے شجر کو سربلند و شاداب رکھنے میں پوری کوشش صرف کی اور ملتِ حقہ کے گراں بہا

---

[1] افسوس ہے کہ اس مسجد کا نام و نشان بھی اب نہیں ہے۔ کوٹھیاں اور دوسری عمارتوں کی بنیاد اس مسجد کی خراب شدہ بنیادوں پر قائم اور تاریخ و جبارتِ مذہبی کے لیے ماتم کا سرمایہ ہے۔

خدمات انجام دیے۔ جن کے بہترین نمونے جناب سلطان العلماء رضوانمآب طاب ثراہ کی ضربت حیدریہ وطعن الرماح وغیرہ۔ سید العلماء علیین مکان کی حدیقۂ سلطانیہ، مولانا مفتی محمد قلی صاحب اعلی اللہ مقامہ کی تشئید المطاعن جناب مفتی میر محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ کی روائح القرآن و جواہر عبقریہ مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی استقصا الافہام اور عبقات الانوار کی صورت میں موجود ہیں اور جن کے تبلیغی نقوش ملت بیضا کے صفحات پر روشن حروف میں ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔

زمانہ رنگ بدلتا ہے۔ اور ضروریات زمانہ میں بھی اس کے ساتھ انقلاب ہوتا ہے، ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان شرفاء اپنے ایرانی نژاد ہونے کا احساس رکھتے تھے۔ اور اس لیے اپنی اصلی زبان فارسی رکھنے کو فخر سمجھتے تھے۔ اس زمانہ کے عوام تک فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے اور فارسی کتابوں کا شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ کے ارباب قلم اپنی مصنفات بھی فارسی میں زیادہ تر تحریر کرتے تھے۔ لیکن زمانہ نے ورق پلٹا، اردو نے فارسی کی جگہ حاصل کی اور رفتہ رفتہ فارسی ترک ہونا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اب فارسی مثل عربی کے ایک علمی زبان ہو گئی ہے جس کے جاننے والے خال خال نظر آتے ہیں اور زیادہ تر عام افراد فارسی کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ تبلیغی مصنفات اہل ملک کے سامنے خود ان ہی کی مادری زبان اردو میں پیش کیے جائیں۔

گذشتہ دور کے علماء میں جناب تاج العلماء سید علی محمد صاحب

قبلہ نے اس ضرورت کا خاص طور سے احساس فرمایا تھا انھوں نے مبسوط و مختصر گراں قدر عربی تصانیف کے علاوہ جن کی فہرست طویل ہے مذہبی حقائق کو اردو کے لباس میں پیش کرنے کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ ان کا "ترجمہ قرآن" اپنے رنگ کا نرالا اور واحد ترجمہ ہے جو بہت حد تک اس مقصد کا ترجمان ہے اور ان کی بعض دوسری کتابیں بھی اس قسم کا ایک مخصوص سرمایہ ہیں۔

مرحوم و مغفور علامہ حکیم غلام حسنین صاحب کنتوری اعلی اللہ مقامہٗ کا بھی ذکر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تبلیغ مذہب میں کیا اور مضامین و مولفات کے ذریعہ سے شکوک و توہمات کا بڑے درجہ تک استیصال کیا۔

فخر الحکما ، مولانا سید علی اظہر صاحب نے "رسالۂ اصلاح" کا اجراء کیا اور اس طرح نیز مستقل تصانیف کے ذریعہ سے تبلیغ مذہب کے ہزاروں برس گزرنے پر بھی نہ بھولنے والے خدمات انجام دیے اور مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری مرحوم نے اپنی عمر کا آخری حصہ تمام تر تصنیف و تالیف میں صرف کرکے سنجیدہ طبقہ کے لیے انتہائی مفید ذخیرۂ معلومات پیش کیا اس کے بعد مدرسۃ الواعظین اور امامیہ مشن دونوں ادارے آپ کے سامنے ہیں جو تقریری و تحریری تبلیغ کے مقصد سے قائم ہوئے اور شروع شروع میں قوم نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی ضرورت

کا احساس و اعتراف کیا مگر اب تک یہ اس ترقی کے درجے تک نہیں پہنچے ہیں جو کسی اہم مقصد کے شایانِ شان ہے۔

maablib.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنی امیہ کے عداوتِ اسلام کی ایک مختصر تاریخ

اور

میدانِ کربلا کا عظیم کارنامہ

رسول اسلام کی آنکھیں بند ہونا تھیں کہ عالم میں فتنہ و فساد کی آندھیاں چلنے لگیں اسلام کے مقابل میں وہ کینے دیرینہ جو اب تک دلوں میں آتش زیر خاکستر کی طرح چھپے ہوئے تھے شعلہ ور ہو گئے مولفۃ القلوب منافقین جنکو رسول نے مصالح اسلامی کی بنا پر مال وزر کی بوچھاڑ سے اب تک موافق رکھا تھا رسول کی وفات کے بعد اپنے دلی مقاصد کے سرانجام دینے کیلئے آمادہ ہو گئے اور ایک طرف اسلام کو صفحہ عالم سے محو کر دینے کے منصوبے بندھ گئے دوسری طرف بنی ہاشم کو جن کی جانفروشیاں جنگ بدر و احد کے کفار و مشرکین کے خون کی ذمہ دار تھیں اور اب تک اسلامی ترقیوں کا سہرا بیشتر حد تک انکے سر تھا۔ اس کی وجہ سے مقتول کفار کے ورثہ میں ظاہری اسلام لانے کے بعد بھی انکا بغض و عناد جگہ کئے ہوئے تھا۔ حیات رسول ہی میں پوری کوشش کی گئی کہ ان افراد کی اہانت و تذلیل کی جائے مگر وحی کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اور رسول کی نہ چپ ہونیوالی زبان انکی مدح و ثنا کے دفتر کھولتے ہوئے دشمنوں کی محنتوں پر پانی پھیرتی رہتی تھی۔

اہلبیت سے بغض و حسد اور اسکے ساتھ اسلام کی دشمنی و عناد نے رسول کے بعد عجیب عجیب صورتیں اختیار کیں۔ جسکے ساتھ ملک و دولت کی ہوس اور نظم و نسق عالم کے طمع نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اسلام اور اسکے خاموش محافظوں کے برخلاف مخالفت کا وہ طوفان برپا ہو گیا کہ العظمۃ للہ مگر وہ حکیم الاسلام جو مدرسۂ قدرت میں سیاستِ مدن کا سبق حاصل کر چکا تھا اس وقت اپنے خاموش طرز عمل سے اسلام کی حفاظت

کر رہا تھا ورنہ اسلام اسوقت مٹ چکا ہوتا اور صفحۂ دنیا اسوقت تعلیمات اسلامیہ کے نقش سے سادہ نظر آتا بنی امیہ جن کی عداوت اسلام سے ضرب المثل تھی اور رسول کو جن کے ہاتھوں سخت ترین مصائب کا مقابلہ کرنا پڑے تھا وہ بھی ابھی تک ایکطرف اسلام کی قوت کیوجہ سے دوسری طرف اس خیال سے کہ شاید رسول کے بعد حکومت سلطنت انہیں نصیب ہو جائے اسلام کی مخالفت سے ساکت تھے لیکن زمانہ کا انقلاب کہ رسول کے بعد حکومت بنی ہاشم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی بنی امیہ تک نہ آئی تیم و عدی کے ہاتھ میں پہنچ گئی جس کیوجہ سے ان لوگوں کو ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی امید باقی نہیں رہی۔

پہلے ہی دور میں اسلام کے مٹانے کیلئے مکر و تزویر کا جال پھیلا دیا۔ ابوسفیان جو اسوقت اس گروہ میں بزرگ خاندان تھا وہ امیرالمومنین علی بن ابیطالب کے پاس آ کر کہنے لگا علیکم علی ھذا الامر ارذل بیت فی قریش اما واللہ لاملأنھا خیلاً ورجلا یعنی بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس خلافت کے بارے میں تم لوگوں پر سب سے رذیل خاندان قریش کا غالب آگیا خدا کی قسم میں تمہاری مدد کیلئے زمین حجاز کو سوار و پیادہ سے بھر دونگا (دیکھو استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول صفحہ ۳۷۱) یہ فتنہ آمیز اور زہرافشاں کلام تھا کہ اگر چل جاتا تو اسلام کا خاتمہ تھا وہ اعراب جو ابھی تک اسلامی تعلیمات و اخلاق سے پورے طور پر آشنا نہ ہوئے تھے اور اس کو بار گراں سمجھتے تھے کسی شدید خانہ جنگی کے بعد فوراً اسلام کو خیرباد کہہ دیتے تھوڑے بہت مسلمان باقی رہتے وہ طرفین کے جنگ و جدال میں کام آتے اسلام کا نام لینے والا بھی آج کوئی نہ ہوتا لیکن امیرالمومنین کی بصیرت افروز اور ثاقب نظر متکلم کے کلام سے پہلے اسکے ضمیر کو دیکھ رہی تھی جواب میں وہ صنعت لہجہ اختیار کیا گیا کہ دوبارہ ایسے کلام کی جرأت نہ ہو ارشاد ہوا کہ تو ہمیشہ اسلام کا دشمن رہا جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی۔

یہ پہلا وار تھا جو رسول کے بعد بنی امیہ کیطرف سے اسلام پر کیا گیا اگرچہ ناکام

ہوا مگر دل کی عداوت کہیں جا سکتی ہے وقتاً فوقتاً یہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی ادھر سے مایوس ہو کر بنی امیہ کو حکومت سے متوسل ہونا پڑا بعد اسطرف سے بمقتضائے وقت انکی پوری دلجوئی اور مراعات کی گئیں۔ شام کی حکومت کا امیر معاویہ کے پاس قائم ہونا بھی اسیوقت کا ایک کارنامہ ہے خوش قسمتی یا بدقسمتی سے حکومت کے تغیر کے دور میں قرعۂ فال بنی امیہ کے نام نکلا اور اس گروہ کو اسلام کیساتھ اپنی حسرتوں کے نکالنے کا پورا موقع مل گیا چنانچہ اس عہد میں صحابۂ رسول اور سچے اسلامی فرزندوں کیساتھ جو شرمناک برتاؤ اختیار کیئے گئے وہ تاریخ کے اوراق کو تاریک بنائے ہوئے ہیں پانی سر سے اونچا ہو گیا ظلم و ستم کو سہتے سہتے دونکے پیمانے چھلک اٹھے، جسکا افسوسناک نتیجہ قتل خلیفہ کیصورت میں ظاہر ہوا تاریخ کے دیکھنے سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہ کے سر دکھائی دیتی ہے۔

تاریخ نے اپنے ورق کو الٹا اور حق نے اپنے مرکز پر عود کیا مدینہ میں بڑے بڑے صحابہ رسول نے بالاتفاق امیرالمومنین علی علیہ السلام کی بیعت کی مگر شام کو جسکے اوپر معاویہ بن ابی سفیان پورے طور پہ قبضہ کر چکے تھے اسلامی متفق فیصلے کے سامنے سرنگوں نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔ خون عثمان کے بہانہ سے علیؑ بن ابی طالبؑ کے مقابلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا جنگ صفین کے سینکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کیطرح بہہ گیا اسلام کو کمزور بنانے میں بہت کچھ دخل رکھتے ہیں۔ آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک مکارانہ مصالحت کیساتھ ہوا جو ساتھیوں کی کمزوری اور بے ثباتی سے مجبور ہو کر امیرالمومنینؑ کو قبول کرنا پڑی۔ اگر دیانت و امانت سے کام لیا جاتا تو مسلمانوں کے درمیان سے اس ناگوار جھگڑے کا خاتمہ ہو سکتا تھا مگر افسوس کہ حرص و آز کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ و فساد کا ایک عظیم پیش خیمہ کر دیا اور عمرو بن العاص نے ابوموسیٰ اشعری کی سادہ لوحی اور کم عقلی سے فائدہ اٹھا کر مسئلہ تحکیم کو بازیچۂ اطفال و مکر و فریب کا

ایک کرشمہ بنا دیا جس کیوجہ سے اختلاف و افتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئی جنگ نہروان اور خوارج کے اسلام سوز حرکات کو بھی اسی جنگ صفین کا ایک شعبہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہ کے قدم پوری طاقت کیساتھ جم گئے تھے ادھر امیر المؤمنین علیہ السلام کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفت اہلبیت کا طوفان پوری قوت پر بلند ہو گیا امام حسن علیہ السلام کو انصار کی کمی اور دشمنوں کی کثرت کے سبب سے خانہ نشین ہونا پڑا بنی امیہ کو پوری آزادی حاصل ہو گئی دمشق بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ کے منبروں پر کمال جرأت کیساتھ اہلبیتِ رسول پر لعن و طعن کا بازار گرم ہو گیا اہلبیتِ رسول کی مخالفت میں خزانوں کے دروازے اور کیسہائے زر و جواہر کے منہ کھول دیئے گئے رواۃ احادیث کو ڈھونڈے جاتے تھے کہ وہ امیر المؤمنین کی مذمت میں وضع احادیث کریں ابوالحسن علی بن محمد مدائنی جو اسلامی مورخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے اپنی کتاب الاحداث میں اس زمانہ کی حالت کی عجیب و غریب الفاظ میں تصویر کھینچی ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

معاویہ نے ایک فرمان اپنے تمام گورنروں کے پاس بھیجا کہ میں اپنی ذمہ داری کو ہٹاتا ہوں اس شخص کی حفاظت سے جو ابوتراب کی فضیلت میں کوئی روایت بیان کرے بس پھر کیا تھا ہر شہر و قریہ میں اور ہر منبر پر خطباء و واعظین علی بن ابی طالب کے لعن کیلئے کھڑے ہو گئے سب سے زیادہ مصیبت اہل کوفہ کیلئے تھی کیونکہ اسمیں شیعہ اچھی خاصی تعداد میں تھے معاویہ نے وہاں زیاد بن سمیہ کو حاکم بنا دیا اُسنے چن چن کر ان کو قتل کرنا شروع کیا دست و پا قطع کئے آنکھیں نکالیں درختوں پر سولی چڑھایا یہانتک کہ کوئی مشہور و معروف شخص انہیں سے باقی نہیں رہا اسکے بعد صحابہ کبار کے فضائل میں احادیث وضع ہونا شروع ہوئے یہانتک کہ ہر خطہ عالم میں مشہور ہو گئے علی بن ابی طالب کی ذات سے اسلام کو جو ارتباط تھا اس کیوجہ سے محال

تھا کہ علی کی عداوت اسلام کی حدود تک نہ پہنچتی اس فسق و کذب اور ظلم وجور نے عالم اسلامی نقشوں کو فنا کر دیا اور دلوں سے اسلامی روح بالکل مفقود ہو گئی ۔

اس زمانہ کے بعض اہم خصوصیّات

امیر شام معاویہ اگرچہ صحابہ رسول میں محسوب کئے جاتے ہیں مگر انکی حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو ہر اسلامی تاریخ میں جلی حرفوں میں نمایاں نظر آتے ہیں جن سے اسلام کے ضعف و کس مپرسی کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔

(۱) جھوٹ اور خدا و رسول پر افترا پوری آزادی کیساتھ عمل میں لایا جانے لگا بلکہ حکومتِ وقت کیطرف سے اسپر جائزہ و انعام دیا جاتا تھا جیسا کہ ابو الحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں لکھا ہے کہ معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اسکا پورا نام مع پتہ کے میرے پاس لکھکر بھیجدو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے مالا مال کر دو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلتِ عثمان میں بہت سے احادیث پیدا ہوگئے پھر تمام گورنروں کو لکھا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے بارے میں روایات احادیث کیطرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابو تراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اسکے مقابل دوسرے صحابہ کیلئے بھی بیان کرو علی اور انکے شیعوں کی دلیل کے باطل کرنیکا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے یہ فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سینکڑوں حدیثیں صحابہ کبار کے مناقب میں بیان کی جانے لگیں جن کی کوئی اصلیت نہ تھی ذاکرین انکو منبر و منبر پڑھتے اور معلمین بچوں کو قرآن کیطرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں عورتوں اور غلام و ملازم تک کو یاد کراتے تھے "

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط

ہو کر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب و شتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا دمشق و شام کے ممبروں پر چالیس برس تک یہ منحوس رسم ادا ہوتی رہی بلکہ سنت بنالی گئی۔ ابو عثمان جاحظ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے معاویہ سے کہا کہ اب تو آپ نے اپنے مقصود کو حاصل کر لیا خدا کیلئے اب اس شخص (علی بن ابی طالب) کی جان چھوڑ دیجئے۔ معاویہ نے کہا۔ اگر ہرگز نہیں یہاں تک کہ اسی پر کمسن بچے تربیت پا جائیں اور سن رسیدہ لوگ آخر عمر تک پہنچ جائیں اور کسی شخص کی زبان پر فضیلت علی کی نہ آئے۔

سلطنت کی یہ کوششیں مگر خدا کی شان جس کو وہ عزت دینا چاہے اس کو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا اور جسکو وہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا اسلامی تصانیف کی ورق گردانی کیجئے کوئی کتاب ایسی نہ ملے گی جس میں علی کے فضائل کا دریا موج زن نہ ہو۔ ع چراغے را کہ ایزد بر فروزد

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کیساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمن بن سہل انصاری (صحابی رسول) نے شراب کے بارے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے ان مشکوں کو پھاڑ ڈالا معاویہ کو خبر معلوم ہوئی تو کہا اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے عبدالرحمن نے سنا تو کہا کہ خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالتمآب نے ممانعت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا ہمارے ظروف میں رکھی جائے اس واقعہ کو علامہ ابن اثیر جزری نے لکھا ہے (دیکھو اسد الغابہ مطبوعہ مصر جلد ثالث ص۳۱۹ نیز اصابہ ابن حجر جلد ۲ ص۴۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں ہی افراد سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا

(۴) بیگناہ مسلمانوں کا خون بہت بیدردی سے بہایا جانے لگا۔ سینکڑوں کلمہ گویوں

کی گردنیں تہ تیغ ہو گئیں یہ سمرہ بن جندب اور بسر بن ابی ارطاۃ اور زیاد بن امیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کا کارنامہ عمل ہیں عبداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں ذبح کر دیئے گئے جسکی وجہ سے وہ مجنون ہو گئیں ملاحظہ ہو استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدر آباد جلد اول صفحہ ۶۴ الناس علی دین ملوکہم حکومت جس رنگ پہ ہو گی زمانہ کا رخ اسی طرف پلٹ جائیگا خصوصاً وہ زمانہ جبکہ ابھی عربوں کے دل میں اسلام کے نقش تازہ بیٹھے ہوئے تھے پرانی عادتیں جاہلیت کی بو ابھی تک ناخنوں میں بسی ہوئی تھی وہ خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طرح پابند شریعت اور اسلامی قواعد کا جوا گردن پر سے اتر جائے سلطنت کی نظر میں خود دیانت و امانت کا کوئی پاس و لحاظ نہ تھا کھلم کھلا شریعت کی مخالفت اور اسلام فروشی کو طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا تصدیق کیلئے دیکھئے استیعاب ابن عبدالبر حتات مجاشعی اور جاریہ بن قدامہ اور احنف بن قیس تینوں شخص جنگ میں گئے حتات نے معاویہ کے پاس آکر شکایت کی کہ آپنے ان دونوں شخصوں کو میرے اوپر ترجیح دی اور انکا مجھ سے زیادہ پاس و لحاظ کرتے تھے معاویہ نے جواب دیا میں نے انکا مذہب مول لے لیا ہے حتات نے کہا کہ پھر مجھ سے بھی میرا مذہب خرید لیجئے (جلد اول صفحہ ۱۵۶) ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ان مورخین کے اقوال کی تکذیب کریں باوجودیکہ انکو امیر معاویہ سے حسن عقیدت تھی ہوتے ہوئے ایسے احادیث وضع کرنیکا کوئی باعث نہیں یا ان واقعات کو تسلیم کر لیں تو ایسی ظاہری توہین اسلام کی توقع ایک فاسق و فاجر معمولی شخص سے بھی نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ ایک مدعی خلافت بڑے شخص سے تو تاریخیں بہت سے ایسے واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں

دربارِ شام کا ایک حیرت انگیز واقعہ

اسلام کا مشہور و معروف مسلّم الثبوت مورخ طبری اپنی تاریخ میں ۴۰ھ کے واقعات لکھتے ہوئے رقمطراز ہے کہ عمرو بن عاص اہل مصر کے ایک گروہ کیساتھ ملاقات کو آئے اس زمانہ میں عمرو بن عاص معاویہ سے کچھ بر سر پرخاش تھے انہوں نے ان لوگوں کو سکھلا دیا کہ تم معاویہ کے پاس جانا تو اس کی توہین کرنا اور خلیفہ کہہ کر سلام نہ کرنا معاویہ کو جیسا ان

لوگوں کی خبر معلوم ہوئی تو وہ عمرو بن عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور دربانوں سے کہا کہ نابغہ کے لڑکے عمرو بن عاص نے شاید ان لوگوں کی نظر میں میرے مرتبہ کو سبک کر دیا ہے تم ان لوگوں کیساتھ جتنی سختی و شدت کر سکتے ہو وہ کرنا یہاں تک کہ یہ لوگ سمجھ لیں کہ انکی جان خطرہ میں ہے دربانوں نے بھی اسکی اطاعت کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص دربار میں معاویہ کیخدمت میں حاضر ہوا اسنے کہا السلام علیک یا رسول اللہ اور بقیہ لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی (تاریخ طبری صفحہ ۱۸۱) یہ واقعہ جب ہماری نظر سے گزرا تو حیرت و تعجب کی انتہا نہ رہی شام کے اسلامی دربار میں خلیفۂ وقت کو رسول اللہ کہہ کر سلام کیا جائے اور ان لوگوں کو سزا تو سزا تنبیہ بھی نہ کی جائے اس سے ضمیر کا پتہ صاف چلتا ہے اور حقیقی نصب العین بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے خود حاکم وقت کو جانے دو دمشق کے بھرے ہوئے دربار میں کسی ایک شخص کا بھی اس واقعہ پر چین بجبیں ہونا تاریخ میں نظر نہیں آتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت اسلامی جذبات کس حد تک فنا ہو چکے تھے اور ایمان کی حمایت کا چراغ کس درجہ خاموش ہو گیا تھا۔

بہر حال معاویہ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انہوں نے اپنی عمر گزار دی مگر وہ مسلمانوں کے سر پر ظلم و ستم کے ایسے دیوتا کو سوار کر گئے جسنے اسلام کے نظام کو بالکل درہم برہم کر دیا یزید کے اخلاق و عادات سے امیر معاویہ واقف نہ تھے یہ کسی عقل میں آنے کی بات ہے تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود یزید کی خصوصیات سے واقف تھے اور اسکا اظہار بھی کیا ہے علامہ ابن حجر مکی تطہیر اللسان والجنان میں جو معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے لکھتے ہیں کہ ایک دن امیر معاویہ بیٹھے بیٹھے بیکبارگی رونے لگے مروان نے کہا کیوں کیا ہوا؟ آپکے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ دنیا میں کونسی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو اب سن زیادہ ہو گیا ہڈیاں گھل گئیں جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے

لئے راہ راست کو حاصل کر لیتا (حاشیہ صواعق محرقہ مصر ص۵۶) دوسرے مقام پر علامہ مذکور لکھتے ہیں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کیساتھ مبتلا کر دیا جسنے انکو ہلاک کر ڈالا (حاشیہ صواعق ص۵۸)

اسکے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ یزید کے افعال و عادات سے بیخبر تھے اور اس کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی؟ یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی اور زر و جواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کر دئے گئے۔ یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے فسق و فجور نے دنیا کو پُر کر دیا ہر طرف معصیت خدا اور مخالفت شریعت کا بازار گرم ہوا مذہب بازیچہ اطفال اور اسلام زینت طاق نسیان بن گیا یزید کے اخلاق و عادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو ملوث نہیں کیا جا سکتا نہ اتنا موقع ہے کہ ان پر روشنی ڈالی جاسکے اسلام کی مستند تاریخیں امانت داری کے فرائض کو ادا کرتے ہوئے ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

واقدی نے مختصر الفاظ میں جسطرح یزید کی بدکرداری کی تصویر کھینچی ہے اسپر یہاں اکتفا کیجاتی ہے حنظلہ غسیل الملائکہ (صحابی رسول) کے فرزند عبد اللہ بن حنظلہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم یزید ایسا شخص تھا جو اپنے باپ کی بیویوں (اپنی ماؤں) سے اور اپنی بہنوں بیٹیوں سے نکاح کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا۔ اور نماز کو ترک کرتا تھا" اس روایت کو علامہ ابن حجر نے صواعق محرقہ ص۱۳۵ میں بھی لکھا ہے کیا اسلامی بادشاہ اور مجوس میں کوئی فرق ہوا؟ انتہائی فاسق و فاجر بھی اپنی ماں۔ بہنوں۔ بیٹیوں پر تصرف حمیت و غیرت بلکہ انسانیت کیخلاف سمجھتا ہے

بادشاہ وقت کے ان عادات و اخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑ لیا تھا اور اسلامیت بالکل فنا ہو گئی لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے کسی کے دہن سے صدائے اعتراض بھی بلند نہ ہوتی تھی۔ عبد اللہ بن عمر ایسے صحابی

رسول اور خلیفہ زادے جنہوں نے حضرت امیرالمومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کی بیعت مرتے دم تک نہیں کی انہوں نے یزید کے ہاتھ پر بخوشی بیعت کر لی تھی (فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی جلد ۲ صفحہ ...) سوائے تین شخصوں کے تمام صحابہ و تابعین یزید کو خلیفۂ رسول تسلیم کر چکے تھے وہ تین شخص حسین بن علی علیہ السلام، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر تھے ۔ یزید کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے اور سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کے لئے اہتمام کیا گیا گزشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہر بالبصیرت سمجھ سکتا ہے کہ علی بن ابیطالب کا فرزند اور رسول کے خاندان کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات کی موجودگی میں یزید کی بیعت کر لیتا تو کیا اسلام کا نام بھی عالم میں باقی رہ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں حسین کی غیرت و حمیت اور اسلامیت کبھی اسکو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے رسول کے دین کو برباد ہوتے ہوئے دیکھیں اور سکوت کریں حسین کا طرز عمل کتنے گہرے تدبیر پر مبنی تھا اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے ناقہم اور تاریخی اسباب و علل سے بیخبر افراد اعتراض کریں کہ حسین نے خود اپنی جان کو معرض خطر میں ڈالا۔ اگر مدینہ میں قیام کرتے اور یزید سے برسر پرخاش نہ ہوتے تو آپکا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا مگر حقیقت شناس باخبر افراد اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتے۔ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علی بن ابی طالبؑ کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھے نہیں دیکھ سکتے تھے اور ان کی خاموشی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی حسن مجتبےٰ ایسے صلح پسند جنہوں نے مسلمانوں کی جان بچانے کیلئے دنیاوی سلطنت کو ٹھوکر لگا دی اور جن کے خلق عظیم و حلم کا دشمنوں تک کو اعتراف تھا باوجود امور سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے اپنی زندگی کو دشمنوں سے محفوظ نہ رکھ سکے امام حسن نے

جسطرح معاویہ کے افعال سے درگذر کیا اور فتنہ و فساد کو خاموش کیا اسکا بدلہ ان کیطرف سے کیونکر ملا؟ اسکا جواب تمام انصاف پسند یا اطلاع مصنفین کی کتابوں سے مل سکتا ہے خواجہ حسن نظامی صاحب اپنی کتاب محرم نامہ ص[illegible] اور دوسری کتاب یزید نامہ ص[illegible] میں لکھتے ہیں۔

پہلا خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم و جدید محاکمہ تاریخی و قانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کر سکتا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام عراق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کیلئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کر دیا جاتا جسطرح امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا، اس صورت میں علاوہ اس بات کے کہ امام حسینؑ کی جان جاتی عالم پر حقیقت کے آشکار ہونے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جسطرح حضرت امام حسنؑ کی وفات کیمتعلق طرح طرح [illegible] [illegible] بنا پیش کر کے اصل واقعہ کو پردہ خفا کر [illegible] حضرت سید الشہداءؑ کی شہادت بھی ایک مشتبہ صورت میں [illegible] صاف سادہ صحابہ رسول یا امام حسینؑ کے ہمدرد جو آپ کو کربلا جانے سے روکتے تھے اور کہتے تھے کہ جوار رسول میں قیام کیجئے اس نکتہ پر متوجہ نہ تھے ان کو سید الشہداءؑ کیطرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ یہ لوگ مجھ کو کہیں چھوڑیں گے نہیں اور واقعہ بھی یہی تھا سید الشہداءؑ جو کچھ ہونیوالا تھا اس سے باخبر تھے اور آپ نے یہ خیال کر کے کہ جان جائے تو اسلام کو زندہ کر کے جائے اس سفر کو اختیار کیا تھا کربلا کے واقعہ نے یزید کے کفر و فجور کو طشت از بام کر دیا اور رسول اسلام کے نواسے کے قتل نے عالم کی آنکھیں کھولدیں کربلا میں مظالم کا خاتمہ ہوا ایک طرف شام و کوفہ کے لشکر کی بے رحمی، وحشیت اور ننگ انسانیت افعال دوسری طرف حسین بن علی اور انکے عزیزوں پر نثار کر لینے کے قابل رفقا کا صبر و حلم تحمل ثابت

قدم وفاداری اسنے دنیا کے سامنے حق و باطل کو علیحدہ کر کے پیش کر دیا عقلت و لاعلمی کے وہ گہرے پردے جو آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے ایک مرتبہ اٹھ گئے اور حقیقت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا شام اور اسکے اطراف کے عرب جس فضا میں پرورش پائے ہوئے تھے اسکا نتیجہ یہ تھا کہ رسول و آل رسول کے نام سے بھی واقف نہ تھے نہ سمجھتے تھے وہ بنی امیہ کے جابر بادشاہوں کو انسے کوشش کر کے اہلبیت رسول کا نام چھپایا جاتا تھا ان کے سامنے حقیقت کے واضح ہونیکا کوئی ذریعہ نہ تھا سوائے اس کے جو حسین نے اختیار کیا اور کربلا میں عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لانے کا بھی فلسفہ یہی تھا اگر تنہا سید الشہداء کربلا میں قتل کر دیے جاتے تو حقیقت کی وہ تبلیغ جو بصورت موجودہ ہوئی نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اہلبیت رسول کی اسیری اور ان کے ہر کوچہ و بازار میں پھرائے جانے اور اس پر ان کے صبر و ضبط جلال عصمت و طہارت اور جا بجا معارف و حقائق سے مملو خطبوں نے ہر گوشہ عالم کو حسین مظلوم کا مرثیہ خوان بنا دیا اور حقائق اسلام پر ایک عالمگیر روشنی ڈال دی۔

اے حسین بن علی میرا سلام آپ پر ہو آپ نے آخر دم تک فرض شناسی اور سکون و تحمل کو ہاتھ سے نہیں دیا آپ نے جان و مال، آبرو، ہر چیز کو اسلام پر فدا کر دیا، آپ نے اپنے نانا کی شریعت سے کسی چیز کو عزیز نہیں کیا۔

آپ نے دنیا کو توحید حقیقی کا نہ بھولنے والا سبق یاد دلایا، آپ خود وقتی طور پر مٹ گئے مگر اسلام کو زندہ کر گئے آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا شریعت میں ایک روح پھونک رہا تھا۔ مذہب آپ کا رہین منت ہے۔ اور اسلام آپ کے احسان سے سر نہیں اٹھا سکتا خدا آپ کے سامنے ہماری طرف سے تحیۃ و درود کے تحفے پیش کرے۔

یا لیتنا معک فنفوز فوزا عظیما۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلافتِ یزید کے متعلق آزاد رائیں

اور

ضمیر کی آوازیں

طبری نے لکھا ہے :-

حدثني الحارث قال
حدثنا علي عن مسلمة
قال فلما اراد معاوية
ان يبايع ليزيد كتب
الى زياد يستشيره فبعث
زياد الى عبيد بن كعب
النميري فقال ان لكل
مستشير ثقة ولكل
سر مستودع وان الناس
قد ابدعت بهم خصلتان
اذاعة السر واخرج
النصيحة الى غير اهلها
وليس موضع السر الا

مجھ سے حارث نے بیان کیا کہ مجھ سے
علیؒ نے مسلمہ کی زبانی نقل کیا،
ان کا بیان ہے کہ جب معاویہ نے
یزید کی بیعت کرانے کا ارادہ کیا
تو انھوں نے ایک خط لکھ کر زیاد سے
مشورہ طلب کیا۔ زیاد نے عبید بن
کعب نمیری کو اپنے پاس بلایا اور
کہا ہر مشورہ طلب کرنے والے کا ایک شخص
قابل اعتماد ہوتا ہے اور ہر راز کے
امانت رکھے جانے کا ایک
محل ہوتا ہے اور لوگوں کی تباہی کا
باعث دو چیزیں ہوتی ہیں ایک راز کا
انتشار کرنا اور دوسرے نصیحت کا نااہل کے

احد رجلين رجل اخرة
يرجو ثوابا ورجل
دنيا له شرف في نفسه
وعقل يصون حسبه و
قد مجمتها منك
فاحمدت الذي قبلك
فقد دعوتك لامر اتهمت
عليه بطون الصحف
ان امير المؤمنين
كتب الي يزعم انه قد عزم
على بيعة يزيد وهو
يخاف نفرة الناس ويرجو
مطابقتهم ويستشيرني
وعلاقة امر الاسلام
وضمانه عظيم ويزيد
صاحب رسلة وتهاون
مع ما قد اولع به
من الصيد فالق
امير المؤمنين
مؤديا عني فاخبره
عن فعلات يزيد
فقل له رويدك

سامنے پیش کرنا۔ اور راز کی حفاظت کے
لائق دو ہی طرح کے شخص ہو سکتے ہیں ایک
آخرت کا لحاظ رکھنے والا جو ثواب کا امیدوار
ہو اور ایک وہ دنیادار آدمی جو عزت و وقار
رکھنے کے ساتھ ایسے عقل و ہوش کا مالک
ہو جس سے اپنے شرف و وقار کو محفوظ رکھتا
ہو اور میں نے تمہاری ان دونوں حیثیتوں
سے جانچ کی ہے اور تمہیں اس معیار پر
پورا پایا ہے اور میں نے تمہیں ایک ایسے
اہم معاملہ کے لیے بلایا ہے جس میں خطوط
پر اطمینان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ ہے
کہ خلیفۂ وقت کا میرے پاس خط آیا
ہے جس میں ظاہر کیا ہے کہ وہ یزید کی
بیعت حاصل کرنے کا ارادہ کر رہے
ہیں اور اس میں انہیں لوگوں کے متنفر
ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خیال ہے
کہ وہ کسی طرح انہیں اپنے موافق
بنائیں اور اس بارے میں وہ
مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں
حقیقت امر یہ ہے کہ اسلام کا
معاملہ اور اس کی ذمہ داری
کا سوال بہت اہم ہے اور

بالامر فما تمن ان
يتم لك ما تريد
ولا تعجل فان دركا
في تاخير خير
من تعجيل عاقبته
الفوت فقال عبيد
له افلا غير هذا
قال ما هو قال لا
تفسد على معاوية
رأيه ولا تمقت اليه
ابنه والقى انا يزيد
سترا من معاوية
فاخبره عنك
ان امير المومنين
كتب اليك ليستشيرك
في بيعة وانك تخوف
خلاف الناس لهنات
ينقمونها عليه وانك
ترى له ترك
ما ينقم عليه فيستحكم
لامير المومنين
الحجة على الناس

یزید میں جو مطلق العنانی اور
لاپروائی ہے وہ ظاہر ہے، اس
کے علاوہ شکار کے ساتھ انہیں
غیر معمولی شغف ہے۔ لہٰذا تم
جا کر خلیفہ کی خدمت میں میرے
خیالات کی ترجمانی کرو، اور
انہیں یزید کے افعال و اعمال
کی اطلاع دو اور کہو کہ تھوڑی
تاخیر سے کام لیجیے تو بہت
ممکن ہے کہ آپ کا مقصد بہتر
طریقہ پر انجام پا جائے اور
جلدی نہ کیجیے، اس لیے کہ دیر
کرنے سے تھوڑا نقصان بہتر ہے
اس تعجیل سے جس کا نتیجہ یہ
ہو کہ مقصد بالکل فوت ہو
جائے۔ عبید نے کہا، اس
کے سوا ایک دوسری صورت
اختیار نہ کی جائے؟ زیاد نے
کہا، وہ کیا؟ کہا بہتر ہے کہ
معاویہ کی رائے کو غلط نہ
ٹھہرائیے اور انہیں ان کے
صاحبزادہ سے متنفر نہ بنائیے

ويسهل لك ما تريد
فتكون قد نصحت
يزيد وارضيت
امير المؤمنين وسلمت
مما تخاف من
علاقة امر الامة
فقال زياد لقد
رميت الامر بحجرة
اشخص على بركة
الله فان اصبت
فما لا ينكر وان
يكن خطاء فغير
مستغش وابعد ابلك
ان يشاء الله من
الخطاء قال تقول
بما ترى ولقضى الله
لغيب ما يعلم فقدم
على يزيد فذاكره
ذلك وكتب زياده
الى معاوية بامره
بالتؤدة وان لا يعجل
فقبل ذلك معاوية

اور میں معاویہ کی لا علمی میں
یزید سے جا کر ملوں اور انھیں
آپ کی طرف سے اس کی
اطلاع پہنچا دوں کہ خلیفۃ المسلمین
نے ان کی بیعت کے لیے
آپ سے مشورہ طلب کیا ہے
اور آپ کو ان کے کچھ ناگفتہ بہ
حرکات کی وجہ سے جنھیں ناپسند
کیا جاتا ہے عوام کی ناراضگی
کا اندیشہ ہے ۔ لہذا آپ کی
رائے یہ ہے کہ وہ ان ناپسندیدہ
باتوں کو ترک کر دیں" تاکہ اس
ذریعے سے اعلیٰحضرت ان کی
بیعت لوگوں سے لینے میں کوئی
کمزوری نہ محسوس کریں ، اور
آپ کے لیے بھی اس مہم میں
آسانی ہو ۔ اگر یہ کیا جائے
تو آپ کی یزید سے خیر خواہی
کا مظاہرہ بھی ہوگا اور اعلیٰحضرت
کے لیے بھی باعث خوشنودی
ہوگا اور آپ کو مسلمانوں کے
مفاد کے لحاظ سے جو دغدغہ ہے

وكف يزيد عن كثير مما كان يصنع ثم قدم عبيد على زياد فاقطعه قطيعة

(تاریخ طبری جلد ۴ ص ۱۶۹)

اس سے بھی محفوظ رہیں گے زیاد نے کہا وہ تو میں نے تمھارا انتخاب ہی بہت عمدہ کیا تھا، ٹھیک ہے بسم اللہ، روانہ ہو جاؤ۔ اگر تمھارا عمل صحیح ہوا تو وہ توقع کے بالکل مطابق ہوگا، اور اگر غلطی بھی ہوئی تو تمھاری خیر خواہی اور نیک نیتی ہر حال شبہ سے بالاتر ہے اور امید یہی ہے کہ تم غلطی کوئی نہ کروگے۔ کہا خیر یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ اور اصل واقعہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ وہ شخص یزید کے پاس گیا اور یہ سب تذکرہ کیا اور زیاد نے معاویہ کو خط لکھا جس میں ان کو تھوڑے سے توقف کا مشورہ دیا۔ چنانچہ معاویہ نے یہ مشورہ قبول کیا اور یزید نے بہت سے ان کاموں کو جن کا وہ مرتکب تھا ترک کر دیا۔ پھر عبید زیاد کے پاس آیا تو انھوں نے انعام میں اسے ایک جاگیر عطا کی۔

طبری نے اس واقعہ کا ذکر ۵۶ھ کے واقعات کے تذکرہ میں اس مناسبت سے کیا ہے کہ اس سال معاویہ نے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کیا۔ لہٰذا انھوں نے اس کے ذیل میں پہلے یہ عنوان قائم کیا کہ ذکر السبب فی ذالک اس کے اسباب کیا ہوئے؟ چنانچہ ان اسباب کے ذکر میں

پہلے تو مغیرہ کا معاویہ کو یہ خیال پیدا کرنا درج کیا ہے اس کے بعد زیاد سے مشورہ طلب کرنے اور اس کے نتیجہ کا تذکرہ کیا ہے جو ابھی بیان ہوا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغیرہ کی وہ تحریک اور زیاد سے یہ خط و کتابت سنہ ۵۶ھ میں ہوئی ہو۔ کیونکہ زیاد کی تو سنہ ۵۳ھ میں موت ہو گئی تھی، جیسا کہ دینوری اور طبری دونوں نے تصریح کی ہے اور مغیرہ کی موت اس کے پہلے سنہ ۴۹ھ یا سنہ ۵۰ھ میں ہو گئی تھی۔

مذکورہ بالا واقعہ پر غور کیجئے تو حسب ذیل نتائج آسانی سے برآمد ہوں گے:۔

۱۔ یزید کے قابلِ اعتراض افعال و اعمال اور مسلمانوں میں ان کے متعلق غم و غصہ کے جذبات کا اس کے باپ امیرِ شام معاویہ کو بخوبی علم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ زیاد ایسے اپنے ہوا خواہوں سے مشورہ لیتے وقت یہ نہ لکھتے کہ مجھے لوگوں کی نفرت کا خوف ہے۔

۲۔ اسلام کے وقار اور مسلمانوں کے مفاد کا خیال خود امیرِ شام کو اتنا بھی نہ تھا جتنا کہ ان کے گورنر زیاد نے اصلی یا نمائشی طور پر ظاہر کیا۔ اس لیے کہ زیاد نے عبید نمیری سے اپنی گفتگو میں علاوہ سیاسی پہلو کے علاقہ امر الاسلام و ضمانہ عظیم کہہ کر فی الجملہ دینی احساس کا پتہ دیا ہے۔ مگر امیرِ شام کے خط کا جو مضمون بیان کیا ہے اس میں قطعاً اس طرح

کے کسی احساس کا نام و نشان تک نہیں ہے، بلکہ صرف مسلمانوں میں ہیجان کا اندیشہ ظاہر کیا ہے اور یہ کہ ان کو کسی طرح اس پر تیار کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ امیر شام یزید کو ولی عہد بنانے کے شوق میں پیش خدا اس کے نتیجہ کے تصور سے بالکل بے نیاز ہو رہے تھے۔ اور انھیں خوف خلائق کے سوا خالق کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔

۳۔ زیاد اور عبید نمیری نے یزید کے افعال و اعمال کی طرف جن الفاظ میں اشارے کیے ہیں وہ اگرچہ سیاسی معیار پر بہت محتاط انداز میں ہیں، اور یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ بہت گھٹا کر ہیں مگر اس اجمال سے ان تمام تفصیلات کی تصدیق ہوتی ہے جو یزید کے متعلق دوسرے لوگوں نے صاف بتائے ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ نے یزید کی سیرت ان الفاظ میں بیان کی تھی۔ انہ رجل ینکح امہات الاولاد والبنات والاخوات ویشرب الخمر ویدع الصلوٰۃ۔ "وہ ایسا شخص ہے جو باپ کی عورتوں اور اپنی بیٹیوں، بہنوں تک کو نہیں چھوڑتا شراب پیتا، اور نماز ترک کرتا ہے۔"

(صواعق محرقہ، مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۲)

زیاد نے یزید کے اوصاف کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ صاحب رسلۃ و تھاون مع ماقد

اولع بہ من الصید۔ اس میں "عشق شکار" کا تو نام لے کر اظہار کر دیا ہے، جو سمجھنا چاہیے کہ اس کے جرائم میں سب سے ہلکا تھا، جب ہی نام لے کر اس کے کہہ دینے کی ہمت ہوئی۔ اس کے علاوہ باقی باتوں کو رسلۃ و تہاون کے دو الفاظ میں ملفوف کیا گیا ہے لغوی معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو رسلۃ کا مفہوم اردو کے ان الفاظ سے ادا ہوتا ہے:۔

چھٹا ہونا، بے قید ہونا، بے لگام ہونا، مطلق العنان ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرا لفظ تہاون کے معنی سستی، سہل انگاری، لاپروائی وغیرہ الفاظ سے ادا ہوتے ہیں۔ پہلا جزو چھٹا ہونا، بے قید ہونا، بے لگام ہونا یہ محرمات کے فعل (ینکح امہات الاولاد فالبنات والاخوات ولیشرب الخمر) پر منطبق ہے۔ اور دوسرا سستی اور لاپروائی " ترکِ واجبات (یدع الصلوٰۃ) پر صادق ہے۔

عبید کے الفاظ باوجود مزید اختصار اس سے زیادہ معنی خیز ہیں۔

"لہنات ینقمونہا علیہ"۔ ھَنٌ لغتِ عرب میں شرمناک، ناقابلِ اظہار چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اصلی معنی اس کے اس طرح ہیں:۔

ھن المرأۃ فرجھا وھماھنان وھتانان جمع ھنات وھنوات (قاموس) اسی لیے اردو زبان میں

اس کا ہم نے "ناگفتہ بہ حرکات" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے صرف "شوق شکار" مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو ان چیزوں کے مقابلہ میں اتنی سبک بات ہے کہ اس کا اظہار صراحتہً کیا جا سکتا۔ پھر اس میں جنسی تعلقات میں بے راہ روی اور مطلق العنانی نیز شراب خواری کے ایسے افعال قبیحہ مضمر نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟

۴۔ زیاد نے خود اپنی جگہ خوفِ آخرت کا کچھ احساس ظاہر کرنے کے باوجود امیر شام کو یزید کے افعال کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ اپنے پیغام میں انھیں نتیجۂ اخروی کی طرف متوجہ کرنے کا موقع نہیں دیکھا بلکہ صرف سیاسی پہلو کا ذکر کیا کہ جلد بازی کی وجہ سے مقصد کے فوت ہو جانے کا امکان ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاویہ کے اتباع خود بھی خلیفۃ المسلمین سے اس بارے میں بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے، کہ اندیشۂ آخرت کو وہ کوئی اہمیت نہ دے رہے ہیں اور نہ دیں گے۔

۵۔ واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبید بن کعب نمیری باوجود تاریخ میں بہت حد تک گمنام ہونے کے زیاد سے زیادہ سیاست داں اور مزاج حکومت کا لحاظ رکھنے والا تھا۔ کہ زیاد نے ہمت کر کے معاویہ سے جو کچھ "حق گوئی" کے طور پر کہنا چاہا اسے بھی اس نے روک دیا۔ ہاں چونکہ زیاد نے نمائشی لفظ اس کا اظہار کرنے

بھئے آخرت کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے اس نے بخیال خود ایسی تدبیر نکالی کہ یزید اور معاویہ دونوں خوش بھی رہیں اور فریضۂ دینی کی تکمیل بھی ہو جائے۔ مگر اس کے لیے اس نے جو صورت اختیار کی وہ کیا فریضہ سے سبکدوشی کے لیے کافی تھی؟ کیا عبید اور خود زیاد دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ صرف وقت کے سیاسی اندیشوں کی بنا پر یزید نے اپنے میں جو تبدیلی کی ہو وہ دیرپا نہیں ہو سکتی؟ کیا ابتدائے عمر سے پڑی ہوئی عادتیں واقعی ترک ہو جاتیں، جب کہ شاہزادۂ نامدار بلکہ خود اعلیحضرت کو آخرت کی بازپرس اور دین کے فرائض کا احساس خود ان کے علم میں قطعاً نہیں تھا تو فقط مسلمانوں کی زبان بندی کے لیے جو شاید کچھ تغیر کیا گیا ہو اس میں اصلیت کیا ہو سکتی تھی؟

یہ سب باتیں کیا زیاد اور عبید نہیں سمجھ سکتے تھے ظاہر ہے کہ وہ اتنے بھولے نہ تھے۔ خوب سمجھتے تھے مگر انھیں تو مسلمانوں کو بے وقوف بنانا تھا، جو ان کی سیاست ذاتی کا تقاضا تھا۔ اور خود اپنے کو بھی بے وقوف بنانا تھا تاکہ ان کی دینداری پر بظاہر کوئی حرف نہ آئے۔ مگر اس سبب سے کیا وہ خدا کو بھی معاذ اللہ بے وقوف بنا سکتے تھے؟ لاحول ولا قوۃ، یخادعون اللہ والذین اٰمنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون ۝

تاریخ اسلام میں

واقعۂ کربلا کی اہمیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ اسلام کی ابتدا کب سے ہوتی ہے ؟ مذہبی نقطۂ نظر سے تو اسلام اس وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ دنیا وجود میں بھی نہ آئی تھی اور آدمؑ و نیز دیگر انبیاء و مرسلین اسلام ہی کا پیغام لے کر دنیا میں آئے، لیکن مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص تاریخی حیثیت سے تاریخ اسلام کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے، کہ جب سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مبعوث برسالت ہوئے۔

اسوقت کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے مختلف ممالک میں جن رہنماؤں کی تعلیم جاری تھی ان میں کسی میں بھی ہمہ گیر انسانی برادری کا تخیل موجود نہ تھا۔ بلکہ یہ تعلیمات صرف ایک قوم، ایک ملک اور ایک زمانہ میں محدود تھے۔ ہندوستان ہی کو لیجئے یہاں جس طرح کی تعلیم رائج تھی۔ اس نے اپنے پیغام کو سمندر کے حدود کا پابند بنا دیا تھا، وہ اپنے ماننے والوں کو سمندر سے عبور کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ تو اسے سمندر پار والوں کے اصلاح کی فکر کیا ہوتی۔

دوسرا بڑا مذہبی ادارہ عیسائیت کا تھا۔ اس کی تعلیم کا زاویۂ نگاہ جو رائج یافتہ بائبل میں پایا جاتا ہے اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ کو صرف بنی اسرائیل کا باپ قرار دیتا ہے مگر اللہ کو صرف اس کے لطف و کرم اور عنایت کی بنا پر باپ کے نام سے تعبیر کیا جا سکے تو اس کی رحمت کا مستحق دنیا کے سارے انسانوں کو ہونا چاہئے۔ مگر عیسائیت

کی مذہبی تعلیم اس وسیع النظری سے خالی تھی۔

خود عرب کے لوگ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنا نام رکھا تھا "عرب" یعنی دل کی بات کو زبان سے ظاہر کر سکنے والے اور اپنے سوا دوسری قوموں کو کہتے تھے "عجم" یعنی گونگے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سوا دیگر اقوام کی زبانوں کو انسانی زبان ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔ بلکہ جیسے جانور کچھ آوازیں منہ سے نکالتے ہیں، ویسی ہی دوسری قوموں کی بولیاں ہیں۔

ایسے زمانہ میں حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ اسلام کا پیغام لیکر آئے۔ جس کا خاص جوہر تھا "بین الاقوامیت" یعنی وہ صرف عربوں کیلئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کیلئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے کل انسانوں کو اخوت اور مساوات کا سبق دیا ذات پات کے بدنما داغوں کو دامنِ انسانیت سے دھو ڈالا۔ کل انسانوں پر یکساں فرائض عائد کئے اور سب کے حقوق مساوی رکھے۔ آپ نے اعلان کر دیا لا فخر للقرشی علی غیر القرشی ولا للعربی علی غیر العربی کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور نہ عربی کو غیر عربی پر سب آدمؑ کی اولاد ہیں (خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

یہ اب ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جبکہ ہمارے کان سنتے سنتے عادی ہو چکے ہیں لیکن جس زمانہ میں رسولؐ ان خیالات کو پھیلا رہے تھے اس وقت دنیا ان سے بالکل اجنبی تھی۔ اس وقت دنیا کی تمام قوموں میں برادرانہ برتاؤ قائم کیا جانا کیا اپنے ہی ملک و قوم کے دوسرے قبیلہ کے افراد کو اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس ماحول کے اعتبار سے رسولؐ کا یہ اقدام ایک بڑی غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ قول بے عمل شغل ہے رسولؐ نے زبانی ہی تعلیم نہ دی بلکہ ہر موقع پر خود عمل کر کے دکھا دیا۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں سے دنیا کے سامنے ایک بین الاقوامی قوم کی تشکیل کر کے دکھا دی۔ جس میں اگر ایک طرف حمزہؓ و مصعبؓ ایسے قرشی تھے تو دوسری طرف ابوذر غفاریؓ اور مقداد کندیؓ

ایسے غیر قریشی اور عجمی سلمان فارسیؓ، بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ ایسے غیر عرب، اتنا ہی نہیں بلکہ سلمان کو مِنَّا اَهْلَ الْبَيْتِ کہہ کے اعزاز میں اپنے خاندان کا شریک کر لیا۔ اور بلالؓ کو مؤذن کے عہدہ پر فائز کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی بلند عہدہ و منصب کا اپنے ایمان و عمل سے حقدار ہو تو اس میں رنگ، نسل اور ملک کے افتراق کی ہرگز پرواہ نہیں کرنا چاہیئے

حقیقی مصلح وہی ہے کہ جو ماحول کے خلاف رائے عامہ کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ضروری اقدام عمل میں لائے۔

رسول اللہ کی جانب سے تمام دنیا کے سامنے ایک ایسی تعلیم پیش کرنا چاہتے تھے جو اسے بلند انسانی سطح پر پہنچا دے اسی لئے انہوں نے تمام اقوام عالم کے سامنے ایسا انداز اختیار کیا جس میں عقل و انصاف کی رو سے کسی کو بنائے مخاصمت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تمام قدیم پیشوایان مذاہب میں اسکا فیصلہ کرنے کیلئے کھڑے ہو جاتے کہ کون پیشوا حقیقت میں منصب رسالت پر فائز تھے اور کون نہیں تھے تو وہیں سے ایک جنگ ان شخصیتوں کے بارے میں قائم ہو جاتی جس کا کوئی عملی نتیجہ انسانی کردار کے مستقبل کے لحاظ سے نہ تھا۔ اسلئے انہوں نے اقوام عالم کے گزشتہ پیشواؤں میں سے نفی کسی کی نہیں کی۔ بلکہ قرآن میں کچھ کے نام کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ "کچھ پیغمبروں کا ہم نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے اور بہت سے پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا ہے" ہر ایک مذہب کے قدیم پیشوا کیلئے یہ امکان باقی رہ گیا کہ اسکا شمار بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں میں ہو اور اسطرح یہود کیلئے جس طرح یہ موقع ہے موسیٰؑ کی عظمت کے قائل رہتے ہوئے، عیسائیوں کیلئے موقع ہے کہ عیسیٰؑ کی عظمت بشری کے قائل ہوتے ہوئے اسلام کے دائرہ میں داخل ہو جائیں اسی طرح پارسیوں کیلئے موقع حاصل ہے کہ زردشت کی عظمت کو ماننے کے ساتھ، ہندوؤں کیلئے موقع ہے کہ اپنے سابق پیشواؤں کی عظمت کو انسانی حدود میں رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو قبول کر لیں اب ان سابق شخصیتوں کے احترام اور عدم احترام کی بحث نتیجہ خیز بھی نہیں، جبکہ آئندہ کیلئے لائحہ عمل سب کی طرف سے ایک قبول کر لیا جائے اور وہ وہی کہ جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

یہ ہے بین الاقوامی جماعت کو متحدہ مقصد پر مجتمع کرنے کا صحیح طریقہ جسے اسلام نے اختیار

کیا اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ بیشک قرآن عربی زبان میں اترا۔ اس میں ایک پہلو تھا اس کا کہ عرب قوم جو دوسروں پر فوقیت کی دعویدار تھی اسے اپنے لئے باعثِ فخر قرار دیتی۔ مگر قرآن نے اس پہلو کی تشریح کر کے عرب کے اس فخر کو ختم کر دیا۔ اس نے صاف الفاظ میں کہہ دیا (ولو نزلناہ علی بعض الاعجمین فقرأہ علیہم ما کانوا بہ مومنین) یعنی قرآن کے عربی زبان میں نازل ہونے کا سبب صرف یہ ہے کہ عربوں میں جہالت اور تنگ نظری ایسی ہے کہ اگر یہ کسی اور زبان میں نازل ہوتا تو یہ ایمان نہ لاتے برخلاف دوسری قوموں کے وہ اس تنگ نظری سے دور ہیں۔ وہ باوجود قرآن کے عربی ہونے کے ایمان لانے کیلئے تیار ہو سکتی تھیں۔ اس لئے قرآن عربی زبان میں اتارا گیا۔ اس طرح قرآن مجید نے جو ایک پہلو عرب کی فوقیت کا پیدا ہوتا تھا اسے ختم کر دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بین الاقوامیت کے یہ معنی نہ تھے کہ ایک قوم یعنی عرب کا غلبہ تمام دوسری قوموں پر ہو جائے بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ عرب اور تمام دوسری قومیں یکساں طور پر اسلام کے بلند و برتر نظریات عقلی اور اصول اخلاقی و اجتماعی کو قبول کر کے ایک متحدہ قوم بن جائیں۔ اس طرح وہ کسی سے کوئی چیز چھیننے کا در پے نہ تھا بلکہ سب کو مساوی طور پر کچھ دینے کیلئے آگے بڑھ رہا تھا اور اسی لئے کسی دوسری قوم کا آدمی اسلام قبول کر کے کسی شکست یا پسپائی کا احساس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ فخر اور نازش محسوس کرتا تھا۔

اسلام کے ان تعلیمات میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے صاف اعلان کر دیا کہ (لا اکراہ فی الدین) بلکہ تبلیغ مذہب کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ اپنی حقانیت اور عمل سے دلوں کو مسخر کیا جائے اور اپنے اصول کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ اس سے متاثر ہو کر اس کی خوبیوں پر غور کرے اور مسلمان ہو۔

یہ ہے اسلامی تاریخ کے دورِ اول کا وہ سرسری بیان جس سے اسلام کے اعلیٰ مقاصد اور رسولؐ کے تبلیغی طریقہ کا ایک تصور ذہن میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کا ورق الٹتا ہے۔ رسولؐ کی وفات ہوتی ہے اور مسلمانوں کے فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان فتوحات کی بنیاد اسی بین الاقوامی تخیل پر تھی جو اسلام نے مسلمانوں کے دماغ میں پیدا کیا تھا۔ مگر اس بین الاقوامیت کے حصول میں پیغمبرؐ کے طریق کار کی نوعیت پر عام طور سے غور نہیں کیا گیا۔ یا سمجھا ہی اسکی تہہ تک نہیں پہنچیں اور وہ پہنچنا چاہئے تھا

کیونکہ پیغمبر کے عمیق نگاہ کی تو تیغ و تفنگوں کے جوام سے کہ جن کا جمہور نام ہے فضول سی چیز ہے پیغمبر اسلام کے پیش نظر بھی فتوحات تھے اور مسلمانوں کی نظر میں فتوحات پر ہی مگر فتوحات کے مفہوم میں دونوں جگہ فرق تھا۔ مسلمانوں کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کے ملک ان سے لیکر اپنے بنا لئے جائیں۔ اور پیغمبر اسلام کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کو خود اپنا بنا لیا جائے جسکا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ملک اپنا ہو جائے۔ پہلی قسم کے فتوحات میں زمینوں پر قبضہ کیا جاتا ہے اور دوسری قسم کے فتوحات میں دلوں کو تسخیر کیا جاتا ہے۔

یہ فتوحات جنہیں مسلمانوں نے اپنا نصب العین بنایا اس سے ممالک تو اپنے ہو گئے مگر ممالک کے رہنے والے ان فتوحات سے ہرگز اپنے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس طرح کی فتح کا ایک خاصہ ہے یہ کہ مفتوح قوم میں فاتح کی طرف سے جذبۂ نفرت پیدا ہو جائے۔ جب دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا تو اچھائیوں پر نظر جائے گی نہیں اور جب اچھائیاں دیکھی نہ جائیں گی تو دلوں میں ایمان کا رجحان کیا پیدا ہوگا۔

اس قسم کے فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح کے خلاف فرد قرارداد جرم مرتب کرکے اور صحیح یا غلط مظالم کی داستانیں دہرائے۔ تاریخ پر نظر ڈالئے تو اسلامی فتوحات اس سے مستثنیٰ نظر آئیں گے۔

مان لیا جائے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام غلط ہے مگر اس غلط الزام کا عائد ہونا اور بالکل ایسے ہی الزام کا ایران کی طرف سے عائد کیا جانا جیسے مولانا شبلی نے شعر العجم میں بھی نقل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ایران کی قدیم شاعری اور ادبی لٹریچر کا ذخیرہ باقی نہیں رہا اس لئے کہ مسلمانوں نے ایران کے تمام قدیمی سرمایہ کو تلف کر دیا۔ ان غلط الزاموں کا بالکل یکساں دو ملکوں کی طرف سے عائد کیا جانا، خود اس کا ثبوت ہے کہ مفتوحہ ممالک کو فاتح جماعت کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ جبکہ مخاصمت تھی ویسی ہی جیسی ہر مفتوح قوم کو فاتح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

رسولؐ نے دکھا دیا تھا کہ دیکھو ممالک یوں فتح کیے جاتے ہیں حضرت علیؑ کو فتح یمن کے لئے بھیجا اور انہوں نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے تمام ملک کو اپنا بنا لیا۔ مگر مسلمانوں نے اس مثال کو یاد نہیں رکھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک تو اپنے ہو جائیں مگر ملک

والے اپنے نہ ہوں۔

آلِ محمدؐ جن کے سرگروہ حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تھے اس صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے اور اس کے نتیجہ کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بمصالح سیاست وقت کی رفتار میں مزاحمت مناسب نہیں سمجھی۔ مگر انہیں الگ تھلگ اور خاموش رہ کر بھی اس کام کو انجام دینا تھا جو پیغمبرِ اسلامؐ کی قائم مقامی میں ان کے پیش نظر تھا۔ اگرچہ ان کا کام بہت مشکل بن گیا تھا مگر ایک فرض شناس شخص مشکلوں سے گھبرا کر اپنے فرض کو ترک نہیں کیا کرتا۔ انہوں نے اپنا کام یہ قرار دیا کہ غیر ملک کی زمینوں کو مسلمان اپنے قبضہ میں لائیں اور ان کے دلوں کو آلِ محمدؐ اپنے عمل اور سیرت کے جذب سے اپنا بنائیں اور اس طرح ان میں اسلام کے ساتھ حقیقی ہمدردی پیدا کریں۔

اسی مقصد سے حضرت علیؑ نے اپنے زمانۂ خلافت میں بجائے مکہ یا مدینہ کے کوفہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ یہ عراق کا مرکزی شہر تھا جو ایران اور حجاز دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کوفہ فوجی چھاؤنی تھا۔ اور چھاؤنی میں بداخلاقیاں کثرت سے ہوتی ہیں۔ ایران کے لوگ جب یہاں آتے تو وہ ان ہی اخلاق و کردار کو جو یہاں نظر آتے اسلامی کردار خیال کرتے اور اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف ان کی نفرت مستحکم ہوتی جاتی۔

جناب امیرؑ نے یہاں قیام فرما کر اور اسے خاندانِ رسولؐ اور اپنے تربیت دادہ سچے مسلمانوں کی جماعت کا مرکز قرار دے کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ ایران والے قریب سے اسلامی اخلاق و آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے بلند انسانی خصوصیات کو محسوس کریں جبکہ آپ عملی طور پر اسی بین الاقوامی مساوات کو سختی کے ساتھ نباہ کر دنیا کو دکھا رہے تھے۔ جو پیغمبرِ اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ جہاں غیر قریشی مالک اشترؒ کی اتنی عزت تھی جتنی بڑے بڑے خاندانی قریشیوں کی نہ تھی۔ اور قنبر غلام کے ساتھ وہ مراعات تھیں جو بہت سے عربوں کے ساتھ نہ تھیں۔ جہاں انسانی حقوق میں مساوات کا اتنا خیال اور ملکی و غیر ملکی تفریق کے خلاف جہاد میں اتنا اہتمام تھا کہ عرب شہنشاہ زادہ (عبیداللہ بن عمر) نے اگر ایک ایرانی

ہرمزان کو ناحق قتل کر دیا تھا اور گذشتہ دورِ حکومت میں قاتل کی شخصیت کے اثر سے اس کا بدلہ نہ لیا گیا تھا تو اب حضرت علی ابن ابی طالبؑ خلیفہ ہونے کے بعد اعلان کر دیتے ہیں کہ اس ایرانی کے خون کا بدلہ لیا جانا قاتل سے ضروری ہے۔ اسلامی قانون میں عرب اور غیر عرب اور بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ عبید اللہ بن عمر جا کر حضرت علیؑ کے فریق مخالف یعنی معاویہ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر میدانِ جنگ میں حضرت علیؑ کے مقابلہ میں آ کر قتل ہوتے ہیں۔

کیا اس سے اسلام کی اس میں الاقوامیت کا جو اسکا طرۂ امتیاز ہے ایرانیوں کو اندازہ نہ ہوا ہوگا اور کیا اس سے انہیں اسلام کے بلند اصول کے ساتھ عقیدت نہیں پیدا ہوئی ہوگی؟

دوسرا واقعہ ایران کی شاہزادی کا حضرت امام حسینؑ کے عقد میں آنا تاکہ ایرانیوں اور عربوں میں رشتۂ اتصال قائم ہو جائے۔ اور ملک و قوم کی تفریق کے مٹا دینے کا عملی سبق دنیا کو دیا جائے۔ اس وقت جب شہنشاہ فارس کی بیٹی کے دامن پر کنیزی کا داغ آ رہا تھا۔ امیرالمومنینؑ نے اپنے عزیز فرزند کے ساتھ اس کا عقد کر کے اس کو دنیائے اسلام کی ملکہ بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر ایران کو اسلام کا گرویدہ بنانے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ آئندہ کے ہونے والے اسلامی پیشوا (زین العابدینؑ) اگر ایک طرف ملک عرب کے دینی شہنشاہ (محمد و علیؑ) کے پوتے ہیں تو دوسری طرف ملک فارس کے شہنشاہ (یزدجرد) کے نواسے بھی ہیں۔ اسکا نتیجہ تھا کہ مفتوحانہ نفرت جو ایران کو فاتح قوم اور اسکے مذہب سے ہونا چاہئے تھی دور ہو گئی اور اگر رہی بھی تو صرف ان اشخاص سے جنہوں نے براہِ راست ان پر فوج کشی کی تھی۔ لیکن اسلام اور رہنمایانِ اسلام سے مذہبی طور پر انہیں کوئی نفرت نہیں باقی رہی۔ بلکہ دلی محبت والفت اور والہانہ شیفتگی و گرویدگی پیدا ہو گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسکے بعد اسلامی علوم اور مذہب کی جتنی خدمت ایران نے کی اتنی خود عرب کو نصیب نہیں ہوئی۔

چاہے سوادِ اعظم کے وہ قدیم اور متوسط دور کے علما ہوں، جیسے بیہقی، نسائی، طبری، رازی، دوانی، جرجانی، نیشاپوری وغیرہ اور چاہے فرقہ امامیہ کے ہر

دور کے علماء ہوں جیسے قمی، طوسی، خوانساری، اصفہانی، رشتی، شیرازی، مازندرانی، طہرانی، یزدی وغیرہ سب ہی سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور ثبوت ایران کے مذہبی شغف کا دیکھئے کہ ایران میں جمشید کا قائم کیا ہوا تہوار "نوروز" ہمیشہ منایا جاتا تھا۔ یہ "نوروز جمشیدی" کہلاتا تھا جو اعتدال ربیعی کے موقع پر قائم ہوتا تھا اس کے مقابل میں "مہرگان" تہوار تھا جو اعتدال خریفی کے موقعہ پر یعنی موسم خزاں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کو اپنے قومی تہواروں اور قومی شخصیتوں کے ساتھ محبت ہوا کرتی ہے مگر چونکہ نوروز ہی کا دن مطابق ہوگیا حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کی جانشینی کے دن سے تو ایران نے اپنے مخصوص تہوار کی قومی خصوصیت کو قربان کردیا۔ اس مذہبی خصوصیت پر جو اس تاریخ کو حاصل ہوگئی تھی اور نوروز بجائے "نوروز جمشیدی" ہونے کے "نوروز اسلامی اور نوروز علویؑ" بن گیا۔ اب اس میں اسلامی نماز پڑھی جاتی ہے اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے اوصاف و مناقب بیان ہوتے ہیں اور جمشید کے ساتھ جو اس دن کا تعلق تھا وہ صرف تاریخ کے اوراق پارینہ کی زینت بن کے رہ گیا ہے۔

یہ وارفتگی اور شیفتگی مذہب کے ساتھ بضرب شمشیر تیغ سے حاصل نہیں ہوسکتی بلکہ اس میں آلِ محمدؐ کے اس اخلاقی جذب کی تاثیر ہے جس کی امیرالمومنین حضرت علیؑ نے ابتدا کی اور آلِ محمدؐ میں سے ہر فرد نے جسکو برقرار رکھا اور امام رضاؑ نے اپنے ولیعہدی کے دور اور زمانۂ قیام خراسان میں جسکو لازوال زندگی بخشدی

یاد رکھئے کہ دنیا کے ہر انسان کے چال چلن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ ہر شخص لامعلوم طریقہ پر اپنے افعال و حرکات سے دوسروں پر اچھا یا برا اثر ڈالتا رہتا ہے اور وہ دوسرے اپنے علاوہ دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے اس لحاظ سے کسی نیک شخص کی پارسائی، رحمدلی، فیاضی، ملنساری، ہمدردی وغیرہ اوصاف کو اہمیت نہ دینا غلطی ہے۔ مگر تاریخ کا ایک خاصہ ہے کہ وہ حرکت کو دیکھتی ہے سکون پر نظر نہیں ڈالتی۔

اگر آپ ملکوں کی تاریخ قوموں کی تاریخ اور شخصیتوں کی تاریخ کو پڑھئے تو آپ کو

جنگ ہنگامہ، شورش اور خونریزیوں کے حالات بڑے شرح و بسط کے ساتھ ملیں گے لیکن عباد و زہاد کی عبادتوں، ریاضتوں اور تعمیر خلق کی کوششوں کا تذکرہ اگر ملے بھی گا نہیں اور ملے گا تو ضمنی طور پر سرسری طریقے سے اور اختصار کے ساتھ

"تاریخ اسلام" اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ فارس و روم کے غزوات "تاریخ" کے صفحات پر چھا گئے۔ فتوح الشام، واقدی اور فتوح البلدان، بلاذری اسم بامسمیٰ ہو کر ان ہی موضوعات کی حامل بن گئیں۔ مگر یہودیوں کے باغ میں آب کشی کر کے بسر اوقات کرنے والا پیغمبرؐ کا جانشین اس دور کی تاریخ میں ڈھونڈھے نہیں ملتا۔ حضرت علیؑ کے علاوہ دیگر اماموںؑ کے واقعات زندگی صفحات "تاریخ" پر نہ آسکے۔ کیونکہ ان میں کمانوں کی کڑک، نیزوں کی چمک اور تلواروں کی جھنک نہ تھی۔ مگر خالد بن ولید سے لے کر ابو مسلم خراسانی تک جتنے جرنیل اور کرنیل تھے سب تاریخی شخصیت بنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ یہ شخصیتیں دنیا کی خاموش فضا میں تلاطم پیدا کرنے کی وجہ سے تاریخ کے معیار پر پوری اترتی ہیں اور زین العابدینؑ، محمد باقرؑ، جعفر صادقؑ، موسیٰ کاظمؑ وغیرہ اپنی عبادات اپنے علم اپنے صدق اپنے ضبط نفس وغیرہ صفات کمال کے باعث تاریخی معیار پر پورے نہیں اترتے اس لئے کہ وہ اپنی خاموش سیرت کے ساتھ دنیائے اسلام کی تعمیر میں کتنا ہی حصہ لے رہے ہوں مگر ان کی زندگی میں سکون ہے اور سکون تاریخ کا جزو بننے کے قابل نہیں۔ اس صورت سے جو اسلامی تاریخ مرتب ہوئی ہوتی اس میں یقیناً بس وہ خون آشام لڑائیاں ہوتیں جو اشاعت اسلام کے نام پر فتوحات کی حیثیت سے اس پاس کے ممالک پر فوج کشی کی صورت میں ہوئیں اور ایسی تاریخ سے مسلمان اپنی جگہ کتنی ہی نازش محسوس کرتے مگر غیر اقوام کی ہمدردی کا سرمایہ ان میں دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ضرورت تھی ایک ایسے واقعہ کی کہ جس میں ہو تو نوعیت جنگ کی، ہو باہمی تصادم اور کشمکش، زمین پر بہتے ہوئے خون اور تڑپتے ہوئے لاشے ہوں فتح اور شکست اور غالب و مغلوب کا انجام ہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ سب باتیں ہوں جن کی وجہ سے تاریخ کی نگاہ اٹھتی ہے۔ جن کی وجہ سے تاریخ اپنی آغوش

کو کھولتی ہے اور واقعات کو حیات بخش دیتی ہے۔ مگر اس جنگ کی تہ میں اسلام کے سچے اصول کی جاذبیت، اس کی مساوات و اخوت، اس کی خلق خدا کے ساتھ ہمدردی۔ اس کی حقوق اللہ وحقوق الناس کی محافظت اور اس کی انسانیت کی تعمیر میں تمام کوششوں کا نچوڑ اس طرح مضمر ہو کر اس جنگ کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں ایسی ہی یا اس سے بہتر تاریخی زندگی حاصل کر لیں جیسی فتوحات ملکی والی لڑائیوں کو حاصل ہے۔

اس واقعہ کے وجود کی وجہ سے تاریخ اسلام میں غیر اقوام کے لئے وہی جاذبیت اور وہی مقناطیسیت پیدا ہو سکے گی جو اصل اصول اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی سیرت و زندگی میں موجود تھی اور جس پر فاتحانہ لڑائیوں نے نفرت کے جذبات کا پردہ ڈال کر اقوام عالم کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ واقعہ کربلا بس ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یہ ایک جنگ تھی اور جنگ بھی انوکھی خصوصیتوں اور مخصوص ندرتوں کی حامل جن کی وجہ سے کسی دوسری جنگ سے زیادہ تاریخ اس کو محفوظ رکھنے پر مجبور تھی۔ یہاں بھی کھنچی ہوئی تلواریں تھیں۔ چمکتے ہوئے نیزے تھے۔ کڑکتی ہوئی کمانیں، اور سنسناتے ہوئے تیر تھے۔ زمین پر بہتا ہوا خون کٹتے ہوئے سر اور تڑپتے ہوئے لاشے اور پھر جنگ ایسی جس میں ایک طرف تیس ہزار اور دوسری طرف بہتر۔ ایک طرف سیر و سیراب اور دوسری طرف تین دن کے بھوکے پیاسے، ایک طرف تن و توش والے قد آور جوان اور دوسری طرف چند جوانوں کے علاوہ اسی برس کے بڈھے اور کمسن بچے۔ کون سی دنیا کی جنگ ایسی ہوئی ہوگی جس میں قاسمؑ ایسے نابالغ کمسن کا کیا ذکر علی اصغرؑ کا سا شیر خوار بھی قربان ہوا ہو۔

لہٰذا بحیثیت جنگ کے تاریخ مجبور تھی کہ اس واقعہ کے خصوصیات کو محفوظ کرے اب اگر یہ جنگ بھی محض کسی غیر مسلم جماعت اور دوسری قوم کے مقابلہ میں ہوئی ہوتی تو غیر اقوام کو اس سے ہمدردی نہ پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ اسے اسلام کی دوسری لڑائیوں کے ساتھ جو اقوام غیر اور دوسرے ممالک کے ساتھ ہوئی ہیں۔ منسلک کر کے اس سے غیریت بلکہ منافرت محسوس کرتیں۔ مگر اس جنگ کی

خصوصیت یہ تھی کہ رسمی طور پر کسی ایک مذہب کی حمایت میں دوسرے مذہب کے خلاف نہ تھی۔ بلکہ ظاہری طور پہ ایک ہی مذہب (اسلام) کے پیروؤں میں جو لوگ اس کے اخلاق اور بلند تعلیمات سے ہٹ گئے تھے۔ ان کے خلاف لڑی گئی تھی اس لئے دنیا کی دوسری قوم کو اس سے مخاصمت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور انہیں اس کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ان سے اسلام کے ان اصول اور اخلاقی حدود کا تعارف ہوتا ہے جو حسینؑ اور یزید کے درمیان خطِ فاصل بنے ہوئے تھے اور وہ جب حسینیت کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ان اصول پر غور کرتے ہیں تو ان کے دلوں پر اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہوتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جو پیغمبرِ اسلامؐ کے پیش نظر تھا اور جس کی حسینؑ نے اپنے خون سے تکمیل کی۔

یہ ایک بڑی خصوصیت ہے واقعۂ کربلا کی جو اسے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا مالک بنا دیتی ہے یعنی اگر تاریخ اسلام سے واقعۂ کربلا کو نکال لیا جائے تو غیر اقوام کی ہمدردی کے لئے کوئی چیز ہمارے پاس نہیں رہ جاتی اور یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو حسینی واقعات سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

پھر امام حسینؑ نے اپنے واقعات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو ایسا مدغم کر دیا ہے کہ حسینی تاریخ بغیر ان تعلیمات کے تذکرہ کے مرتب ہی نہیں ہو سکتی اور اس طرح ان واقعات کے ساتھ وہ تعلیمات بھی قہری طور پہ تاریخ کا جزو بن گئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے واقعۂ کربلا کی تاریخی حیثیت ایک مخصوص نوعیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

خم شمشیر تاریخ کا جزو بنتا ہے مگر خم محراب نہیں۔ تیروں کی بارش تاریخ کی توجہ مبذول کرتی ہے، خوفِ الٰہی سے آنسوؤں کی بارش نہیں۔ بپھر کٹتی ہوئی لاشوں کو تاریخ دیکھتی ہے سجدۂ الٰہی میں زمین پر گری ہوئی پیشانیوں کو نہیں۔ مگر حسینؑ نے کربلا میں یہ کیا کہ تیروں کی بارش میں نماز جماعت ادا کی۔ اب کیا ممکن ہے کہ تاریخ اس نماز کو نظر انداز کر دے۔ خنجر کی دھار کے نیچے خالق کا سجدہ کیا، اب کیا مجال

کہ تاریخ اس سجدے سے آنکھ بند کرلے۔

اس طرح امام حسینؑ نے تعلیمات اسلام کو تاریخی زندگی کا لباس پہنا دیا جس کی مثال واقعۂ کربلا کے سوا تاریخ اسلام کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتی۔

کربلا میں مادیت پرستی اور حق پرستی کا مقابلہ صاف نظر آتا ہے۔ جب میدانِ جنگ میں صفیں مرتب ہوتی ہیں اور فوج شام کا افسر عمر بن سعد تیر چلہ کمان میں جوڑ کر حضرت امام حسینؑ کی طرف رخ کرتا ہے، پکار کے اپنی فوج کو آواز دیتا ہے کہ گواہ رہنا پہلا تیر فوج حسینؑ کی جانب میں لگا رہا ہوں۔ یہاں گواہ کئے جا رہے ہیں فوج کے سپاہی۔ کاہے کے لئے؟ حاکمِ وقت کے سامنے گواہی دینے کے لئے۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مخلوق کی رضامندی اور مادی فائدے کا حصول مدِ نظر ہے۔ اور ادھر جب حسینؑ کا جوان بیٹا رخصت ہو کے مرنے چلتا ہے تو زبان پر کیا الفاظ آتے ہیں؟ خداوندا! گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جا رہا ہے، جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ کی تصویر ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف اللہ کی خاطر اور خالق کی رضامندی کے لئے۔

کیا تاریخ کربلا کی جنگ سے اس خدا پرستی کے مظاہرہ کو الگ کر سکتی ہے؟ ناممکن ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ گھریلو واقعات جن میں قرابتداروں کے باہمی حقوق گھر والوں کے ساتھ برتاؤ۔ باہمی محبت و سلوک کے کتنے ہی تابناک عمل کے جواہرات ہوں مگر تاریخ انہیں مڑ کر نہیں دیکھتی۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں اپنے عزیزوں کو اور اس سے بھی بڑھ کر اہل حرم یعنی بی بیوں اور بچوں کو ساتھ لائے اور اب حسینی کارنامہ کے ذیل میں اعزا کے حقوق قرابتداری، بہن اور بھائی کی غیر معمولی محبت۔ شوہر اور زوجہ کی باہمی وفاداریاں غرض کتنے لیے زندگی کے پہلو مضمر ہو گئے ہیں جنہیں عموماً تاریخ اپنے دامن میں لیتی ہی نہیں

اس کا قطعی ثبوت چاہتے ہوں تو یہ دیکھیئے کہ آخر حضرت امام حسینؑ ۱۰ محرم ۶۱ھ کے پہلے بھی تو امام حسینؑ ہی تھے۔ یقیناً آپ کی پوری زندگی ہی حقوق

اللہ اور حقوق الناس اور اعزا کے ساتھ صلۂ رحم اور گھر والوں کے ساتھ مراعات میں ایسی ہی شامل تھی کہ جیسی وہ کربلا کے میدان میں نظر آتی ہے۔ مگر کیا بات ہے کہ ستاون برس کی عمر میں صرف ایک ہی دن کے جزئیات و واقعات ہیں جو تاریخ کی زبان سے ہم تک پہنچے ہیں اور اس دن کے پہلے کے ستاون برس کے واقعات ہرگز مسلسل اور مرتب طور پر ہمیں دستیاب نہیں ہوتے

اب تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ صرف واقعۂ کربلا کی خصوصیت ہے کہ اس میں رزمیہ کارنامہ کے ساتھ چونکہ زندگی کے دوسرے پہلو منسلک ہو گئے تھے اس لئے انہیں تاریخی زندگی حاصل ہو سکی۔ اور اب آپ کو واقعۂ کربلا کی مخصوص اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی۔ جس نے تمدنِ اسلامی کے ہر اجتماعی اور انفرادی معاشرتی اور منزلی پہلو کو اس طرح تاریخ کا جزو بنا دیا جو بغیر اس کے قطعاً ناممکن تھا۔

اسیری اہلِ حرم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَاءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ وَاٰلِہِ الطَّاہِرِیۡنَ ؕ

واقعاتِ کربلا اپنی اہمیت کے اعتبار سے عالم کے واقعات میں اپنی آپ مثال ہیں۔ ان میں سے ہر واقعہ ان تمام وجوہ کو لیے ہوئے ہے جو کسی واقعہ کو اہم بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا تعلق براہِ راست ایک ایسی ہستی سے ہے جسکی عظمت شرق وغرب کے کروڑ ہا انسانوں کے دلوں کو سربسجود بنائے ہوئے ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ عالم کی ایک معتد بہ اور کثیر التعداد جماعت (شیعہ) اس مقدس ہستی کو امام مفترض الطاعۃ سمجھتی ہے۔ نیز اس حیثیت سے کہ ندرت اور بے مثالی میں اس کی نظیر ازل وابد کی حدود کے درمیان دیکھنے میں نہیں آئی اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ عظیم انقلابات وتغیرات کا پیش خیمہ قرار پایا۔ ان وجوہ کی بناء پر کوئی تعجب نہیں کہ یہ واقعات صدیاں گزرنے کے بعد بھی برابر افکار وعقول کے لیے مرکزِ توجہ بنے رہے اور ہمیشہ ہی انکے اسباب وعلل میں بحث کا سلسلہ قائم رہا۔

چنانچہ ہمارے سامنے اعتراض یہ پیش ہے کہ جب سید الشہداؑ کو معلوم تھا کہ وہ اس سفر میں شہید کیے جائیں گے۔ اور آپ کے بعد اہلِ حرم کی اسیری یقینی ہے۔ تو پھر ان اہلِ بیت کو

اپنے ساتھ لے کر نکلنے کے کیا معنی ؟ کیا یہ خود اپنے ناموس و عزت کو دشمنوں کے ہاتھوں ہتکِ حرمت کے لیے دے دینا نہیں ہے اور کیا سیاست و عاقبت اندیشی اس بات کی متقاضی نہ تھی کہ آپ ابن عباس اور دوسرے لوگوں کے مشورہ پر عمل کرتے جو اہلِ حرم کو مدینہ منورہ میں چھوڑ جانے کے حامی تھے۔

بحث کا پہلا رُخ

مذہبی نقطۂ نظر

اس موقع پر مجھے بہت سے علمائے مذہب کی طرح یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اس قسم کے سوالات کا جن میں ائمۂ دین یا انبیاء مرسلین کے طرزِ عمل پر نقطہ چینی کا عنوان ہو، ہمارے مذہبی اصول کی بناء پر موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ ہم کو ادلۂ قطعیہ اور براہینِ یقینیہ نے ایک ایسے مرکز پر پہنچا دیا ہے، جہاں سے امامت و نبوت و توحید کی کڑیاں اس طرح متصل ہو جاتی ہیں جن کے اندر جدائی ناممکن ہے۔ امام پر الزام اس کی ذات سے تجاوز کر کے رسول تک منتہی ہوتا ہے۔ اور آخر میں ذاتِ احدیت تک سرایت کرتا ہے۔ عصمت کے مسئلہ کو مخصوص ادلہ و براہین کے تحت میں طے کر لینے کے بعد اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان ذواتِ مقدسہ کے افعال کو محلِ نقد و اعتراض قرار دیا جائے۔ ان بزرگانِ دین کی مثال بالکل ایک ایسے شخص کی ہے جس کو سلطان نے پورے طور پر جانچ کر ایک بڑے منصب کے

لیے اہل سمجھ لیا ہو اور اسی اہلیت کی بنا پر اس کو سفیر بنا کر ایک خاص شہر میں بھیجا ہو کر وہاں مطلوبہ اغراض و مقاصد کی تکمیل کرے۔ سلطان کی جانب سے اس کو ایک مخصوص دستور العمل بھی دے دیا گیا ہو جس سے یکسر مو تجاوز کرنے کا اس کو حق نہیں ہے اسی صورت سے انبیاء و ائمہ اپنے اپنے دورِ رسالت و امامت میں ایک خاص دستور العمل کے پابند ہیں جس میں ابتدا سے دور سے لے کر انتہا تک ہر وقت کی مناسبت سے مخصوص حکم و مصالح کے ماتحت ایک حکم قرار دے دیا گیا ہے جس کی پابندی ان پر فرض ہے اور بعض مواقع پر جہاں مقصد کی تکمیل کے لیے قربانی کی ضرورت ہے۔ وہاں جس قسم کی قربانی ضروری ہو وہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ ان حکم و اسرار ہے جو اس قسم کے احکام کا منشأ ہیں رعیت کو بحث کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر یہ طریقہ (اصولی حیثیت سے کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو) موجودہ زمانہ کی آب و ہوا کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

آج کے زمانہ کا معترض اس طرح کا جواب سن کر اپنے اعتراض کی حقانیت کا زیادہ معتقد ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی جواب ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حسین ابن علی کی شخصیت پر معترض کے نقطۂ خیال اور زاویۂ اعتقاد کے مطابق نظر ڈالوں۔

maablib.org

بحث کا دوسرا رُخ

فلسفی حیثیت

میں حسینؑ کو صرف اس حیثیت سے دیکھتا ہوں کہ وہ ایک بلند مرتبہ عالی نسب باہمت انسان اور ایک محترم قبیلہ (بنی ہاشم) کے بزرگ خاندان اور سردار ہیں۔ جو اپنے تئیں حسب و نسب، اور ان اوصافؔ کمالات کے باعث جو انھیں حاصل ہیں یزید سے زیادہ خلافت و سلطنت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ جس صورت سے بھی ہو یزید سے کہ جو بلا استحقاق غاصبانہ طور پر مسندِ حکومت کا مالک بنا بیٹھا ہے، اپنے حق کو حاصل کریں۔ یا کم سے کم خود یزید کو خلیفۂ وقت تسلیم کر کے اس کی بیعت میں داخل نہ ہوں جبکہ یزید کے رسوائے عام اعمال آفتاب سے زیادہ روشن ہیں اور یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ اگر یزید اسی صورت سے خلافتِ اسلامیہ پر قابض رہا تو کچھ ہی دن میں شعائرِ اسلامیہ نیست و نابود اور شریعتِ نبویہ کے فرائض و سنن نسیًا منسیاً ہو جائیں گے۔ اسلامی افراد کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ چکے تھے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم کے فطری قانون کے مطابق ہر شخص کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی میں خاص لذت محسوس ہونے لگی تھی، وہ اشخاص جن کے دل میں احساس مذہبی باقی تھا سلطنت کے خوف اور اپنی کمزوری کے باعث سکوت پر مجبور تھے ان حالات کے اندر حسینؑ یزیدی سلطنت کا تختہ

اللہ کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا آخری نقطۂ نظر یہ بھی نہیں کہ خود تختِ حکومت پر بیٹھ کر دنیا کے مال و منال اور لذتِ حیاتِ دنیا سے متمتع ہوں بلکہ ان کا مقصود اصلی یہ ہے کہ امتِ اسلامیہ کو اس ظالم کے فولادی پنجہ سے رہا کریں۔ جس نے اس کو دینی و دنیوی ہر قسم کی ہلاکت میں ڈال رکھا ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ رائے عامہ کو یزید کے خلاف برافروختہ کر دیں۔ جمہور مسلمین، تمام رعایا کے سامنے یزید کی اخلاقی پستی اور اسلام دشمنی کو مجسم صورت میں پیش کریں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ یہ شخص کسی صورت سے سلطنتِ مسلمین کا حقدار نہیں ہے امام حسینؑ کو اس مقصد کے حصول میں اس سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ وہ اپنے نفس کو خطرات کے مقابلہ میں پیش کر دیں۔ اپنے تئیں ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بنا کر عالم کے سامنے ظالم اور مظلوم کا انتہائی حیرت انگیز مرقع دکھلا دیں۔ جس میں ایک طرف حق و صداقت رحم و کرم، اخلاصِ عمل اور وفا، ثباتِ قدم، جانبازی، صبر و تحمل اور دوسری طرف ظلم و ستم، جفاکاری، قساوتِ قلب، بے حمیتی، کم ظرفی، وحشیت و حیوانیت کا مکمل نقشہ موجود ہے۔ اور اس کے سبب سے مسلمانوں کے دلوں پر وہ چوٹ پڑے جس کا نتیجہ انقلابِ سلطنت کی صورت میں نمایاں ہو۔ صرف قتل ہو جانا اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا، عرب قوم میں بات پر مر مٹنا ایک معمولی بات تھی۔ عربی جانبازوں کی آخری سانسیں اکثر تلواروں ہی کی چھاؤں میں چلتی تھیں۔ پھر فرزندِ رسولؐ بھی اگر اپنی جان سے گزر کر قتل کو منظور کر لیتے تو اس کو کوئی اہمیت عام نفوس میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ حسینؑ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اہلِ حرم کو

اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہمدردی انسانی طبائع میں فطری طور پر داخل ہے اور بالخصوص عرب قوم میں غیرت و حمیت کے تحت میں یہ جذبہ خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ فرزند رسولؐ یزید اور اس کے بندۂ زر یقین رکھتے تھے کہ وہ بخیال خود فتح پانے کے بعد ان بے والی و وارث عورتوں کے ساتھ رحم و کرم کا کچھ خیال بھی نہ کریں گے اور مظالم و مصائب کا سلسلہ ان اہلِ حرم کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رہے گا۔ خاندانِ رسولؐ کے مخدرات مختلف شہروں میں پھرائے جائیں گے۔ قید خانہ میں مقیم کیے جائیں گے اور ان کے ساتھ ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھا جائے گا۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ فوراً نہیں تو کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی اور دلوں میں جذبات حزن و ملال سے تلاطم برپا ہوگا۔ یقیناً بنی امیہ کی سلطنت تباہ ہوگی حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ظاہری صورت سے تو یزید نے حسینؑ اور ان کے تمام انصار و اعوان کو قتل کر ڈالا لیکن حقیقتاً حسینؑ نے یزید اور تمام بنی امیہ کو ان کی پوری سلطنت سمیت قتل کیا۔ حسینؑ کی فتح ہوئی اور یزید کی شکست۔ اور شکست بھی ایسی کہ روز قیامت تک جس کے بعد فتح نصیب نہیں ہو سکتی۔

سید الشہداؑ کا تبلیغی نقطۂ نظر

امامؑ کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیسے جائیں گے؟ بے شک معلوم تھا۔ بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ تمام اعوان و انصار اعزا حتیٰ کہ شش ماہہ بچہ بھی باقی نہ رہے گا۔ مردوں میں سوائے ایک بیمار فرزند کے کوئی نہ بچے گا۔

سب دوپہر کے عرصہ میں قتل ہو جائیں گے۔ یہ بھی یقینی تھا۔ کہ بنی امیہ آپ کے قتل کو مختلف لباس پہنا کر دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گے کہ آپ کا قتل مذہبی قوانین کے لحاظ سے قابلِ اعتراض نہیں بلکہ اصول کے مطابق ہے۔ اور یہ کہ حسینؑ خلیفۂ وقت پر خروج کے باعث اس کے مستحق تھے کہ ان کو قتل کیا جائے۔ عراق میں امیر المومنینؑ کی چند روزہ خلافت ظاہریہ کی بدولت اہل بیت رسولؐ کو پہچاننے والے کچھ نہ کچھ تعداد میں موجود تھے۔ لیکن شام نے اسلامی دنیا میں آنکھ کھول کر سوائے اموی سلاطین اور ان کے جاہ وحشم کے کچھ نہ دیکھا تھا، ان کے کان علی بن ابی طالبؑ پر سب وشتم کو نماز کے وظائف اور جمعہ کے خطبوں میں سننے کے عادی تھے اور ان میں سے بیشتر افراد اس مقدس ہستی اور خاندانِ رسولؐ کے محترم افراد کو پہچانتے بھی نہ تھے۔ ان میں سے ایسے بھی تھے کہ جب ان سے پوچھا جاتا تھا یہ کون شخص ہے جس پر بعد نماز سب وشتم کی جاتی ہے۔ تو وہ کہتے تھے (اراہ لصا من لصوص العرب) میرے خیال میں تو یہ عربستان کے ڈاکوؤں میں سے کوئی شخص ہے (عقد فرید) ان حالات کی موجودگی میں کوئی شبہ نہیں کہ اِدھر حسینؑ قتل ہوئے اُدھر واعظین اور خطبأ کی زبانیں خلیفۂ وقت کے طرزِ عمل کو سراہنے اور اس کے حق بجانب ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتیں اور اس وقت غزالی کا رسوائے زمانہ مقولہ (قتل الحسین بشرع جدہ) بالکل عام افراد مسلمین کی نظر میں حقیقت کا لباس پہن لیتا۔ اس صورت میں سید الشہدأ نے اپنی جان ومال، اولاد سب کو شرع اسلامی کے احیاء اور اپنی مذہبی خودداری کی نگہداشت میں صرف کیا۔ لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخ کے

ورق اور کتب سیر کے صفحات نے یزید کو دشل دیگر جنگ آزما ستیوں کے، غازی اور مجاہد کا لقب دے دیا۔ اور پیکر حقیقت، روح صداقت امام بالحق حسینؑ بن علیؑ دنیا میں ہمیشہ کے لیے مجرم اور باغی مستحق قتل سمجھ لیے گئے۔ کیا حسینؑ کا تدبر اس کی اجازت دے سکتا تھا؟ کیا وہ اپنی جان کو ہاتھ سے دیتے ہوئے مقصد کو بھی ہاتھ سے دے دیتے۔

یہ قتل صرف قتل حسینؑ نہ تھا۔ بلکہ ان کی تحریک، ان کے مقصد، ان کی ہر دلعزیزی، ان کی پاک دامنی اور نفسانی صفات و خصوصیات دین اسلام اور شریعت حقہ کے قتل کا مترادف تھا اور اس سے بڑھ کر سیدالشہداء کی شکست کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

امام کے لیے اپنے قتل کے بعد اس مقصد کی حفاظت کا کون سا ذریعہ تھا؛ کس پر وہ اعتماد کرتے کہ وہ ان کی شہادت کے فلسفہ اور ان کی حقانیت وصداقت کی تبلیغ کے حق کو ادا کرے گا؟ کیا وہ اپنے اعزہ اور انصار پر بھروسہ کرتے؟ وہ تو سب ان کے سامنے قتل ہو جانے والے تھے۔ کیا وہ بیمار فرزند زین العابدینؑ پر اعتماد کرتے؟ وہ خود بھی طوق و زنجیر میں گرفتار اور شدید مرض میں مبتلا تھے۔ اور ان کا قتل کرنا سخت دل دشمنوں کے لیے معمولی بات تھی۔ پھر کون تھا جو امام کے بعد اس اہم فریضہ کا ذمہ دار ہو؟؟ کون دنیا کے سامنے حقانیت وصداقت کو بے نقاب کر کے دشمنوں کی حکمت عملی اور حیلہ سازی کو مکمل شکست دیتا اور بھرے ہوئے مجمعوں میں بازاروں کے اندر پُرزور مدلل تقریروں سے ناواقف افراد کے سامنے حقیقت کو واضح کرتا؟

اس وقت کو دیکھو اور ان حالات پر غور سے نظر ڈالو جو ایسے ہولناک مواقع ایسے نہ تھے کہ کسی بڑے سے بڑے مرد کے قدم وہاں ٹھہر جاتے، فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی مسلمان اپنی جان پر کھیل کر اس موقع پر کھڑا ہوتا تو کیا اس کو اتنی مہلت بھی دی جاتی کہ وہ اپنے فرض کو ادا کر سکے؛ کون تھا جو حسینؑ کے مقصد کی تکمیل کرتا؟ بے شک اس مقصد کو پورا کیا تو ان ہی بے والی و وارث عورتوں نے جو قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرائی جا رہی تھیں، جن کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی۔ جن کی رگوں میں علوی و فاطمی خون جوش کھا رہا تھا۔ جن کی زبانوں سے نبوی بلاغت اور علوی فصاحت الفاظ کی صورت میں موجزن تھی۔ انہوں نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے پُرجگر مردوں سے نہ ہوتا اور ایسے سخت مواقع پر فریضۂ تبلیغ کو ادا کیا۔ جن میں بہادروں کے دل چھوٹ جاتے، فرزندِ رسولؐ کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے اور جتنے یگانے بیگانے آپ کے ساتھ ہیں سب شہید ہوں گے اور مردوں میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جو اسلامی افراد کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کر کے ان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹائے۔ آپ اگر اس پہلو سے چشم پوشی کرتے اور اپنے بعد کے لیے اس مقصد کا کوئی سرانجام نہ کرتے تو یقیناً آپ کی قربانی غیر مکمل اور عبث رہتی۔ اور اس سے جو اصلی مقصد تھا وہ حاصل نہ ہوتا۔ اس نصب العین کی تکمیل کے لیے حضرت کو مخدراتِ عصمت کا اپنے ساتھ رکھنا ضروری معلوم ہوا۔

حضرت کو اس امر کا احساس تھا کہ بنی امیہ اسلامی احکام و قوانین اور عربی عادات و اخلاق سے جتنا بھی تجاوز کریں لیکن یہ نہیں ممکن کہ ان کو بے

والی و وارث عورتوں کے قتل کی ہمت ہو، نہیں ممکن کہ وہ ایک مصیبت زدہ غم رسیدہ عورت کو قتل کریں جس کا قصور صرف اتنا ہو کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اس نے کچھ الفاظ زبان سے نکالے ہوں۔ روز عاشورہ اگرچہ دشمنوں کے ہاتھ سے بعض عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے لیکن معرکۂ جنگ کی خصوصیات دوسرے اوقات سے مختلف ہیں۔ ابن زیاد اپنے تمام ظلم و جور اور طغیان و سرکشی کے باوجود ہرگز اس امر پر قادر نہ تھا کہ وہ غیر معرکۂ جنگ میں ایک بے کس و بے بس عورت کا خون بہاتا جو اس کے سامنے ایک قیدی کی صورت میں کھڑی ہو۔

ملکی قوانین کی سے شرعاً شرعی یا عوام کے جذبات کے خیال سے ہی لیکن وہ کسی عورت کو قتل کرنا تو درکنار بہ ظاہر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دیکھو جب مخدرۂ رسالت زینب کبریٰؑ نے اپنی باطل شکن تقریر سے اس کے بلکہ تمام اموی حکومت کے کفر و فسق اور خبث و شقاوت کو طشت از بام کر دیا۔ اور تمکنت اور املاء یا ابن مرجانہ کے تعریفیہ کلمہ نے دنیا کو اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک بنا دیا۔ تو اس نے چاہا کہ ہاتھ اٹھائے اور زینب کبریٰؑ سے ان کے جگر سوز الفاظ کا بدلہ لے لیکن اسی کے لشکر کا بڑا سردار عمرو بن حریث سامنے آگیا اور اس نے ابن زیاد کو یہ کہہ کر روک دیا کہ عورت کو اس کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی سزا نہیں دی جاتی۔ ابن زیاد کو یہ کہہ کر ساکت ہو جانا پڑا کہ (اما تراہا کیف تجرات علی) تو نہیں دیکھتا کہ زینب نے میرے ساتھ کتنی بڑی جسارت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ اور انصار حسینؑ نے کربلا میں وہ یادگار نمونہ پیش کیا جس کی مثل ناممکن ہے۔ انھوں نے شجاعت و جرأت

کا مجسہ بن کر ثبات قدم و استقلال کے وہ جوہر دکھلائے جن کی نظیر تاریخی صفحات میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ ستر آدمی ستر ہزار کے مقابل میں کھڑے ہوئے پھر ان کو کوفہ و شام سے برابر مدد پہنچنے کی توقع اور ان کو کسی امداد کی امید نہیں۔ وہ نہر کے کنارے سیر و سیراب اور یہ ریگستان میں دو تین دن کے پیاسے آفتاب کی گرمی، لو کی تپش، زخموں کی کثرت، آنکھوں کے سامنے بچے پیاس سے جان بلب ان تمام حالات کے باوجود پائے ثبات میں تزلزل آنا تو کیا، چہروں پر شکن بھی نہ آئے۔ بلکہ جتنا وقت سخت ہوتا جاتا تھا ان کے چہروں کی بحالی، رگوں میں خون کی روانی، ارادوں کی پختگی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ یقیناً بڑا حیرت انگیز دہشت ناک موقع تھا۔ جس میں ٹھہرنا ان ہی بہادروں کا کام تھا لیکن اگر غور کرو تو اس سے زیادہ عظیم اور دہشت انگیز وہ موقف تھا۔ جہاں خاندانِ رسالت کے مخدرات عصمت و طہارت کو ٹھہرنا پڑا تھا اور وہ یزید ابن زیاد کا دربار ہے۔

ذرا دیکھو تو سہی! کوفہ میں قصر دارالامارہ کے اندر دربار آراستہ ہے ابن زیاد تخت حکومت پر فتح و ظفر کے نشہ میں سرشار بیٹھا ہے تمام ارکانِ دولت، رؤسائے قبائل، عمالِ حکومت حاضر ہیں اور سامنے عام ملازمین بارگاہ صف در صف دم بخود ایستادہ ہیں۔ دنیا اپنی تمام ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مجسم صورت میں موجود ہے۔ اس حالت میں اسرائے اہل بیتؑ اور سر ہائے شہداء لائے جاتے ہیں ان ہی قیدیوں میں عقیلہ حرار زینب کبریٰؑ بھی ہیں۔ اور وہ ایک گوشے میں عام نظروں سے ذرا ہٹ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ابن زیاد کی

کمینہ نفسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ بلند ہمت ذاتین کی صورت سے دشمن پر ظفر پانے کے بعد معاف کرنے۔ یا کریم النفس اور با وقار افراد کے طریقہ پر سکوت سے کام لے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی فتح وظفر کا زبانی اظہار کر کے اُن دکھے ہوئے دلوں کو دکھائے۔ عظمت و جلالت چھپائے سے نہیں چھپتی۔ اس نے حضرت زینبؑ کو قرائن سے پہچانا۔ اور ضرور پہچانا لیکن صرف بخیال خود ہتک حرمت کے لیے (جس کا نتیجہ خود اس کی سبکی اور ہتک کی صورت میں ظاہر ہوگا) پوچھنے لگا۔ کہ یہ کون عورت ہے جو لوگوں کی نظر بچا کر دور بیٹھی ہے کسی نے کہا کہ یہ زینبؑ دختر علیؑ ہیں۔ اب ابن زیاد کو اپنی فتح و ظفر کے مظاہرے اور زینبؑ کی شماتت اور دل آزاری کا موقع پیدا ہو گیا۔

ابن زیاد۔ کیوں زینبؑ! دیکھا خدا نے تمہارے بھائی اور ان کے باغی ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس سوال کا جواب ایک ستم رسیدہ عورت جو قیدی کی صورت میں ہو کیا دے سکتی ہے! کیا اس کے دل میں اتنی طاقت، زبان میں اتنی قوت باقی رہ سکتی ہے کہ وہ جواب سنجیدگی کے ساتھ دے۔ لیکن ذرا ان لفظوں میں غور کرو جو زینب کبریٰؑ نے جواب کی صورت میں کہے۔ ان میں کہیں اضطراب، خوف، بے صبری، ناسمجھی کی جھلک ہے؟ میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر قتل ہونا خط تقدیر نے لکھ دیا تھا۔ وہ اپنے پیروں سے اپنے مقتل کی طرف گئے اور وہ دن دور نہیں کہ جب خدا کے سامنے تیرا اور ان کا مقابلہ ہوگا۔

اور تجھ کو جواب وہی کرنا ہوگی۔ اس وقت دیکھنا کہ فتح کس کی ہے؟

زینبؑ کے یہ جملے معانی کا دفتر اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں فلسفہ مظلومیت کے تمام نکات و اسرار ان چند کلموں میں مضمر اور عقیدۂ معاد اور دارِ آخرت کی تبلیغ ان کا مخصوص جوہر ہے۔

ابن زیاد کے لیے سنجیدہ بحث کا دروازہ بند تھا۔ اس کی زبان رک چکی تھی۔ اس کی تمام ظاہری شان وشوکت، دولت و ثروت ان الفاظ کا جواب دینے کے لیے کام آنے والی نہیں تھی اس کو سب وشتم اور عامیانہ گفتگو کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا۔

ابن زیاد۔ "خدا کا شکر کہ تم لوگوں کو قتل کیا، تمہیں رسوا کیا، اور تمہاری باتوں کا جھوٹ ظاہر کر دیا۔" اسکے جواب میں کیا زینبؑ بھی ایسی ہی غیر سنجیدہ اور انسانیت سے گری ہوئی تقریر کرتیں؟ لا واللہ! زینبؑ کی شان اس سے ارفع و اجل تھی، وہ اس موقع پر باطل کا مقابلہ حق سے لغو باتوں کا جواب دلیل و برہان سے دے رہی تھیں، انھوں نے کتنے شاندار لفظوں میں جواب دیا۔ جن پر بلاغت نثار ہو رہی ہے؛

" رسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق ہو اور جھوٹ اس کا کھلتا ہے جس کو سچائی کا لحاظ نہ ہو اور وہ ہم نہیں ہمارا غیر ہے۔" حسینؑ اور انصار حسینؑ نے ظہر عاشور دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے ہاتھوں میں چلتی ہوئی تلواریں تھیں۔ ان کے دوش پر بادہ اور نیزے تھے، عزت ان پہ سایہ فگن اور شرف ان کے ہمرکاب تھا۔ ان میں سے ایک اس وقت تک قتل ہوتا تھا جب وہ دشمنوں میں سے سیکڑوں کو قتل کر لیتا تھا، وہ خوش تھے، ان کے لبوں پر تبسم تھا۔ صرف اس خیال سے کہ تھوڑی دیر میں وہ دنیوی آلام سے نجات حاصل کر کے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت الفردوس میں جا کر قیام کرنیوالے ہیں۔ یہ اس موقف کی صورت تھی جہاں شہدائے کربلا کو کھڑا ہونا پڑا تھا۔ لیکن وہ موقع جو زینب کبریٰ اور ان کے ساتھ کی مخدرات عصمت کو برداشت کرنا پڑا، اس سے مختلف ہے وہ دربار ابن زیاد میں قیدی کی صورت میں کھڑی تھیں، جدھر نظر اٹھا کر جدھر دیکھتی تھیں، سوائے شماتت کرنے والے دشمنوں اور ہنس ہنس کر طعن و تشنیع کرنے والے اشقیار کے کوئی نظر نہ آتا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے وہ جفاکار اشخاص موجود تھے، جن کی تلواروں نے ان کے جوان فرزندوں، بھائی بھتیجوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا وہ اپنے تئیں ایک ایسے مقام پر قیدی کی صورت میں دیکھ رہی تھیں، جہاں وہ ایک وقت میں سلطنت کر چکی تھیں۔

یہ تمام باتیں وہ ہیں جو انسان کو بے قابو، عقل و حواس مختل اور زبان و دل کو بے طاقت بنا دیتی ہیں۔ جن کی موجودگی میں شجاع ترین انسان ایک کلمہ زبان سے کہنے کے قابل نہیں ہوا کرتا۔

زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کے ان خصوصیات و حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کسی شخص کو یہ کہنے میں جھجک ہو سکتی ہے۔ انہوں نے دربار ابن زیاد میں جس منزل کو طے کیا وہ اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھی، جس کو انصار سید الشہداؑ نے کربلا کے میدان میں قطع کیا؟ تاریخی حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان طاقت ربا اور ہمت شکن حالات کی موجودگی میں ابن زیاد کے سامنے زینبؑ کی زبان میں لکنت یا ان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب یا ان پر کسی طرح کے خوف و دہشت کا اثر تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انہوں نے اس موقع

پر ایسی پرحقائق تقریریں کیں جن کو اگر ایک فارغ البال اور مطمئن شخص کئی رات دن کی فکر میں تیار کرتا تب بھی وہ اپنی نوعیت میں یادگار کی حیثیت نہ رکھتیں۔ پھر جناب زینبؑ نے تو ہزاروں اشخاص کے مجمع میں ایسے موقع پر ان خطبوں کو ارشاد فرمایا تھا جب وہ مصائب اور شدائد کے بتیس دانتوں میں زبان کی طرح گھری ہوئی تھیں جبکہ مظالم کی چکی ان پر چل رہی تھی۔ اور ان کی زندگی کا مشکل ترین موقع تھا۔ آخر ابن زیاد نے جب پوری طرح سمجھ لیا کہ زینب پر اس کی سطوت و شوکت کا ذرہ برابر اثر نہیں ہے۔ اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ ان کی باتیں رائے عامہ کو اس کے خلاف منقلب نہ کر دیں۔ اور اس کی رسوائی اور فضیحت میں نقاب خفا کے جو تھوڑے بہت تار باقی ہیں۔ وہ بھی معدوم نہ ہو جائیں تو اس کو تقریر کا رخ بدلنا پڑا اور آخری الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے (لعمری انہا لسجاعۃ ولقد کان ابوھا اسجع منہا) خدا کی قسم زینبؑ بڑی عبارت آرائی کرنے والی ہیں اور ان کے باپ تو ان سے زیادہ عبارت آرائی میں کامل تھے۔

نہیں نہیں اے ابن مرجانہ! زینبؑ صرف عبارت آرائی کرنے والی نہیں ہیں۔ وہ ثبات و استقلال کا مجسمہ حقانیت و صداقت کا پیکر ہیں۔ وہ حکومت جابرہ اور سلطنت ظالمہ کے مقابل حق کی آواز بلند کرنے کی امانتدار ہیں۔ وہ علی بن ابی طالبؑ کی یادگار ہیں جنہوں نے دنیا کو فصاحت و بلاغت اور شجاعت و جرأت کا سبق دیا۔ وہ معصومۂ کبریٰ فاطمہ زہراؑ کی بیٹی ہیں۔ جن کی عصمت و طہارت

پر آیۂ تطہیر نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ دمر جانہ اور ہیدیا ہند جگر خوارہ حسین کے رسوائے عالم واقعات سے تاریخ کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہے۔

زینب کی یہ شجاعت وجرأت ایک مرتبہ دو مرتبہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا ظہور ہر اس موقع پر ہوتا رہا کہ جب مشکلات کا ہجوم، اور مصائب کا اژدہام تھا۔ جبکہ تماشائیوں سے بازار، کوٹھے، برآمدے مملو تھے۔ کوفہ میں داخلہ کے وقت اور کوفہ سے نکلنے کے موقع پر، راستے میں، بازار شام کے اندر ہر مناسب موقع پر زینب کی زبان فریضۂ تبلیغ میں گویا تھی۔ انھوں نے حق کے واضح کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ انھوں نے ہر موقع پر جو کسی ایسے خطیب سے بھی ناممکن ہے جس کے لیے تمام خاطر جمعی اور راحت واطمینان کے اسباب موجود ہوں۔ ایسی موثر تقریریں کی جس نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

قیدیوں کا قافلہ کوفہ میں پہنچا۔ اس صورت میں کہ جس سے پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ زنان کوفہ نے فطرتاً بے چین ہو کر رونا شروع کیا۔ سید سجادؑ نے ضعف و مرض کے باعث تھرائی ہوئی آواز میں کہا: "تم ہی لوگوں نے تو ہمارا خون بہایا۔ اب تمہاری عورتیں ہمارے حال پر روتی ہیں۔ ہمارا تمہارا فیصلہ روز جزا خدا کے سپرد ہے۔"

پھر ذرا واقعہ کی درد انگیزی بڑھی اور مرد و زن ہم آواز ہو کر رونے لگے۔ امامؑ نے فرمایا: "تم لوگ ہمارے لیے روتے، نوحہ کرتے ہو۔ پھر آخر ہم کو قتل کس نے کیا ہے؟"

بشر بن خزیم اسدی ناقل ہے کہ اس موقع پر زینب بنت علیؑ

نے مجمع کی طرف رُخ کیا۔ اور تقریر شروع کی۔ میں نے آج تک کسی پردہ نشین عورت کو اتنی پُر زور تقریر کرتے ہوئے نہ سنا تھا گویا علیؑ بن ابی طالبؑ کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے لوگوں کی طرف سکوت کا اشارہ کیا۔ جس کے ساتھ ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ انھوں نے کہا:-

"حمد کا مستحق خدا ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمد مصطفےٰ اور ان کی عترت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اے اہلِ کوفہ، اے اہلِ مکر و دغا تم روتے ہو؟ خدا کرے ان آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور ان نوحہ و فریاد کی آواز دل میں سکون نہ ہونے پائے (آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ فرمایا) کیا تم سچ مچ آنسو بہا رہے ہو اور چیخیں مار مار کر رو رہے ہو؟ بے شک تم اسی کے مستحق ہو جتنا ممکن ہو، زیادہ رونا اور ہنسی کو کم آنے دو۔ تم سمجھے بھی کہ رسولِ خدا کے جگر کو کیسے تم نے چاک کر دیا۔ اور ان کے گھرانے کی کیسی عزیز خواتین کو تم نے بے پردہ کیا۔ اور ان کا کیسا خون تم نے زمین پر بہایا۔ اور ان کی کتنی بڑی ہتک حرمت تم نے کی۔ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان سے خون برسا؟ یہ تو کچھ نہیں! آخرت کا عذاب بہت سخت ہے اور اس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ اس چند روزہ مہلت کے زمانہ سے مغرور نہ ہونا۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ نہ موقع نکلنے کا خوف ہے۔ وہ یقیناً تمہاری تاک میں لگا رہے گا۔"

راوی ناقل ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا بے ہوش و حواس دانتوں میں انگلیاں دبائے ہوئے رو رہے تھے۔ اور ایک بڈھے کو میں نے روتے ہوئے دیکھا وہ کہہ رہا تھا۔ میرے ماں باپ تم لوگوں پر نثار، تمہارے بڈھے تمام دنیا

کے بوڑھوں سے بہتر اور تمہارے جوان تمام جوانوں سے بہتر اور تمہاری عورتیں تمام عورتوں میں افضل و بہتر۔ اور تمہاری نسل تمام جہان کی نسل سے بہتر ہے نہ وہ کبھی ذلیل ہو سکتی ہے نہ رسوا۔"

پھر ام کلثومؑ نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ کہا اور ان کے بعد فاطمہ بنت الحسینؑ نے تقریر کی (الحمد للہ عدد الرمل والحصیٰ وزنۃ العرش الی الثریٰ الخ)

یہ اسوقت کا تذکرہ ہے جب یہ قافلہ بے پردہ محمل و کجاوہ کے اندر کوفہ میں جا رہا تھا یا دربار ابن زیاد میں لایا گیا تھا۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھ کر دربار یزید پر ایک نظر ڈالو اور دیکھو یہ قافلہ اس دربار میں کس طرح لایا جاتا ہے۔

یزید سریر حکومت پر دو نشوں میں سرشار بیٹھا ہے۔ ایک نشۂ شراب دوسرے نشۂ فتح و ظفر۔ اور اس کے گرد طواغیت بنی امیہ و بنی عبد الشمس ارکانِ دولت طلائی و نقرئی کرسیوں پر حریر و دیبا کے لباسوں میں ملبوس مجتمع ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں اور دولت و ثروت طرب و نشاط کا نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ اس حالت میں خاندانِ رسالتؐ کی عورتیں اور بچے رسیوں میں بندھے ہوئے دربار میں لائے جاتے ہیں "اس وقت یزید کے مسرت و نشاط کا پارہ ذرا اونچا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس بات کی آرزو کرنے لگتا ہے کہ کاش جنگِ بدر میں لشکرِ اسلام کے ہاتھوں سے قتل ہونے والے اس کے بزرگ ہوتے اور وہ دیکھ لیتے کہ خاندانِ رسالت سے ان کا بدلہ کس طرح لیا گیا (لیت اشیاخی ببدر شھدوا الخ) یہ موقع وہ تھا کہ معصومہ صغریٰ زینب کبریٰؑ کھڑی ہوئیں اور وہ تقریر شروع کی جس نے یزید کے تمام جاہ و جلال کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ ان الفاظ کو غور سے سنو اور دیکھو ان الفاظ اور ان کے معانی کی شان و شوکت اور پُر زور طاقت کس طرح یزید کو اس کے تمام جبروت سمیت پرکاہ سے زیادہ بے وقعت ثابت

کردیتی ہے۔ زینب سلام اللہ علیہا کھڑی ہوئیں اور کہا۔ کتنا سچا ہے میرے پروردگار کا ارشاد (ثم کان عاقبۃ الذین اساءوا السوٓئی کذبوا بآیات اللہ وکانوا بھا یستھزءون) آخر میں ان لوگوں کی جنہوں نے برے اعمال کیے یہ نوبت پہنچی کہ انھوں نے آیاتِ خدا کی تکذیب کی، اور وہ ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔" تو نے اے یزید کیا یہ گمان کیا کہ جب تو نے ہم پر زمین و آسمان کے تمام راستوں کو بند کر دیا اور ہماری حالت یہ پہنچی کہ تیرے سامنے قیدیوں کی طرح لائے جائیں تو اس سے خدا کی نظر میں ہماری حقارت اور تیری کچھ عزت ہو گئی اور یہ کہ تیری کامیابی تیرے رفعت مراتب کے باعث تھی؛ اس خیال سے تیری ناک چڑھ گئی اور تو خوش ہو کر (غرور و تکبر کے ساتھ) اپنے شانوں پر نظر ڈالنے لگا جب تو نے دیکھا کہ دنیا تیرے حکم کی پابند اور امور مملکت منظم و مرتب ہیں اور ہماری سلطنت و حکومت تیرے لیے تمام خطرات سے صاف ہو گئی۔ کیا تو بھول گیا قولِ خدا کو کہ ر نہ خیال کریں، وہ لوگ جنھوں نے کفر اختیار کیا کہ ہم جو ان کو مہلت دیتے ہیں وہ ان کے لیے اچھی بات ہے۔ ہم تو ان کو مہلت دیتے ہیں اس لیے کہ وہ خوب دل کھول کر گناہ کریں اور آخر ان کے لیے حقارت آمیز سزا مقرر ہے، کیا انصاف کا اقتضا یہی ہے کہ تو اپنی عورتوں، کنیزوں کو تو پردے میں رکھے ہوئے ہے اور دخترانِ رسول کو قیدیوں کی صورت میں دربدر پھراتا ہے پھر اس پر بڑی بیبا کی اور جرأت کے ساتھ کہتا ہے (لأ ھلوا واستھلوا فرحا) اگر بدر میں مارے جانے والے بزرگ اس کو دیکھتے تو خوشی کے مارے چیخ اٹھتے۔

تو اپنے بزرگوں کو بخیالِ خود پکارتا ہے، گھبرا نہیں تھوڑے ہی دن میں تو بھی اسی گھاٹ پر پہنچے گا اور یقیناً اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش

تیرے ہاتھ شل اور زبان گنگ ہوتی اور تو نے جو کچھ کہا اس کو نہ کہتا اور جو کیا اس کو نہ کرتا۔ تیرے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خدا فیصلہ کرنے والا اور محمد مصطفٰے تیرے مقابل میں مدعی اور روح الامین ان کی پشت پناہ اور مددگار ہوں گے۔ اس وقت ان لوگوں کو بھی جنہوں نے تیرے افعال کی تائید کی اور تیرا ساتھ دے کر مسلمانوں کی گردنوں پر مسلط کیا معلوم ہوگا کہ ظالمین کو کیسا برا بدلہ دیا جاتا ہے۔"

کیا کسی مصور یا مضمون نگار کا قلم یزید کی حالت اور فتح وظفر کے باعث اس کے خوشی ونشاط اور غرور وتکبر کی تصویر بر موقع اس موثر انداز سے کھینچ سکتا ہے جس صورت سے زینب کبریٰ نے اس مختصر وقت میں کھینچی تھی؟ کیا کسی واعظ شیریں زبان اور مبلغ کی یہ طاقت تھی کہ وہ اس موقع پر یزید کے بڑھتے ہوئے سرکشی وتمرد کے پارے کو اس صورت سے گھٹاتا؟

کیا اپنے طاقتور اور مالک تاج وتخت دشمن کے مقابل میں اپنی عظمت و جاہ وجلال کا بیان اس وقت پر ممکن تھا کہ جب ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے عزت واحترام کے تمام حیثیات مفقود اور ذلت واہانت کے تمام اعتبارات موجود ہیں۔ یہ حق کی طاقت تھی جس نے اس وقت یزید کے سر کو خم کر دیا۔ حضرت زینبؑ نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ چاہا کہ خود اس کو اور اس کے ہم نشین اہلِ دربار کو حق کا جاہ وجلال اور باطل کی ہیچی بے وقعتی اور کم قدری مجسم صورت سے دکھلا دیں اور یہ کہ کس طرح جو ہرِ حقیقت کی مالک ہستیاں قوت وسلطنت اور خوف وہیبت کے اسباب کی طرف ذرہ برابر پروا نہیں کرتیں۔ انہوں نے چاہا کہ خود یزید کو اس کی کم قدری اور بے حقیقتی پستیِ فطرت اور بے بضاعتی حسب ونسب کی پستی کا احساس کرا دیں اور دکھلا دیں کہ وہ خود اس سے اجل و

ارفع ہیں کہ اس سے بات تک کرنا پسند کریں، ارشاد ہوتا ہے:۔

"اگرچہ انقلابات زمانہ نے یہ نوبت پہنچا دی کہ میں تجھ سے بات کر رہی ہوں۔ حالانکہ میں تیری قدر و منزلت کو بہت کم جانتی ہوں اور تیری توبیخ و سرزنش کو اپنے لیے بڑی مصیبت سمجھتی ہوں۔ لیکن کروں کیا کہ دل بھرا ہوتا ہے۔ اور کلیجہ میں آگ لگی ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ خدا پرست افراد شیطانی لشکر کے ہاتھوں قتل ہوں!!!

اس کے بعد حضرت زینب نے چاہا کہ صریحی طور پر فلسفۂ مظلومیت اور اس کے نتائج اور ظاہری فتح میں شکست اور شکست میں فتح کا پہلو اور ظاہری اسباب کا انجام کی حیثیت سے معکوس نتیجہ واضح کر کے بیان کردیں اور بتلا دیں کہ مقصد میں کامیابی اور نتیجہ کی خوشگواری ان کے لیے تمام مشکلات کو آسان کیے ہوئے ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ جس کے بیان میں اہل قلم بسیط سے بسیط مضامین لکھتے ہیں اور جس پر حسینی سیاست کی حقانیت و صداقت کا دارومدار ہے۔ فرماتی ہیں:۔ اچھا! اے یزید تجھ کو قسم ہے، تو کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھ اور اپنی پوری کوشش کو صرف، اپنی تمام جد و جہد کو ختم کر دے لیکن (یاد رکھ) خدا کی قسم تو ہمارے ذکر کو محو، ہماری زندگی کو فنا نہیں کر سکتا اور نہ ہمارے اصلی مقصد تک تو پہنچ سکتا ہے۔ اس واقعہ کا ننگ و عار تجھ پر قیامت تک باقی رہے گا اور تو کبھی اس کو دھو نہیں سکتا۔ تیری رائے یقیناً غلطی پر، تیرے ایام زندگی بہت محدود، تیرے اردگرد کا مجمع بہت جلد تتر بتر ہونے والا ہے، وہ دن بہت نزدیک ہے۔ جب منادی کی آواز بلند ہوگی الا لعنۃ اللہ علی الظالمین۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے پیشرو بزرگوں کا انجام سعادت کے ساتھ اور ہمارے آخری بزرگ کا انجام شہادت و رحمت کے ساتھ مقرر کیا۔

اور وہ ہمارے لیے کافی اور بہترین ناصر و معین ہے۔"

یہ مختصر اقتباسات تھے اس طویل خطبہ کے جو بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے۔ اس کے الفاظ کی طاقت اور عبارت کا لطف و انجام ہماری اردو زبان میں کہاں، ہم اس کے معنوی مفاد کو اپنے لفظوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ اس تقریر کا ہر ہر فقرہ یزید کے لیے ہزار ہزار تلواروں اور نیزوں کے زخم سے زیادہ سخت تھا اور کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ خطبہ اور اس کے ایسے دیگر خطبے جن کو تاریخ نے ہم تک پہنچایا ہے یا نہیں وہی ایسے پُر طاقت اسلحہ تھے جنہوں نے یزید اور بنی امیہ کے تخت حکومت کو الٹ کر ان کو نیست و نابود کر دیا۔

کیا واقعہ نہیں کہ امام حسینؑ اور ان کے انصار و اقارب کے قتل ہو چکنے کے بعد ان مخدراتِ عصمت کا ایسے ایسے ہولناک موقعوں پر قیام اور ان کے حقائق و واقعات سے مملو خطبے نہ ہوتے تو حسینؑ کا قتل بالکل بے اثر اور اُن کا خون رائگاں ہو جاتا۔ نہ اسلامی دنیا میں اس کی کوئی اہمیت ہوتی نہ کسی شخص میں جذبۂ انتقام پیدا ہوتا۔

ان کا قتل بالکل عبداللہ بن زبیر اور اس کے بھائی مصعب کے قتل کی صورت اختیار کر لیتا جس سے نہ کوئی مقصد حاصل ہوا نہ اس کا بدلہ لیا گیا لیکن حسینؑ کے قتل نے عالم اسلامی میں آگ لگا دی۔ ان مخدرات عصمت کا قید سے رہا ہو کر مدینہ پہنچنا تھا کہ اموی سلطنت میں انقلاب کے اسباب پیدا ہونے لگے، کوفہ میں جمعیت توابین سلیمان بن صرد خزاعی اور ان کے ساتھیوں سے لے کر بعد کے واقعات

سب اسی اثر کا نتیجہ تھے جو اہلِ حرم کے درود کوفہ کے بعد سے لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو گیا۔ یزید و ابن زیاد کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہُوا۔ اموی سلطنت نیست و نابود ہوئی اور اس طرح کہ قیامت تک کوئی اس کا نام لیوا پیدا نہ ہوگا۔

حسینؑ بن علیؑ زندہ ہیں۔ ان کی تحریک بھی قیامت تک زندہ ہے لیکن یزید و اعوان یزید فنا ہوئے اور ان کے نام و نشان بھی ہمیشہ کے لیے محو ہو گئے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے سید الشہداء اہل حرم کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور یہی وہ عظیم ربانی سیاست اور انجام بینی تھی جس نے ایک مرتب و منظم سلطنت کی بنیادوں کو چند روز کے اندر متزلزل کر دیا۔

دنیا نے حسینؑ کو اب تک نہیں پہچانا۔ وہ ان کے تدبر اور سیاسی سوجھ بوجھ کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ اہل حرم کے اس سفر میں اپنے ساتھ لانے کو ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن تاریخی حقائق میں غور و فکر ایسے اعتراضات کو پادر ہوا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

کربلا میں حسینؑ بن علیؑ کا طرزِ عمل عظیم حکم و اسرار کا سرمایہ دار تھا۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سمجھنے کے لیے دل کی ضرورت ہے۔

ہلاکت اور شہادت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاہِرِیْنَ۔

انسان کی زندگی کن مقاصد سے وابستہ ہے۔ جب تک اس کا تعین نہ ہو، اُس وقت تک انسان کی قربانی کا صحیح مصرف متعین نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ جتنا مقصد بلند ہو اتنی شے میں بلندی اور جتنا مقصد پست ہو، اتنی پستی ہوتی ہے۔

دنیا میں مختلف پیشے اور کاروبار ہیں۔ ہر ایک کا درجہ اُس کے مقصد کے لحاظ سے ہے۔ معمار کا کام عمارت بنانا اور معلّم کا کام علوم کی تدریس کرنا ہے۔ پہلے کا تعلق اینٹ گارے سے ہے اس کا مقصد پست ہے اس لئے تمام عقلاء کے نزدیک اس کا درجہ پست اور دوسرے کا کام علم کے جوہر سے آراستہ کرنا ہے۔ اس کا تعلق جوہر روح کے ساتھ ہے۔ جس کا درجہ بلند ہے۔ اس لئے خود اس کام کا درجہ بلند ہے۔

چونکہ مقصد خود ذریعہ سے اہم ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ مقصد سے ذریعہ پست ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی نے زندگی کا مقصد نیچا رکھا ہے تو زندگی نیچے آئیگی اور اگر مقصد بلند رکھا ہے تو زندگی میں بلندی پیدا ہوگی

انسان نے عالم مشاہدہ میں کائنات کی چیزوں پر نظر کی، پہاڑوں کی بلندی کو دیکھا، سمجھا کہ یہ مجھ سے مافوق ہیں اونچے اونچے درختوں کو دیکھا تو اپنے کو نارسا سمجھا۔ حیوان کے ساتھ بہت سی اپنی ضرورتوں کو وابستہ دیکھا تو اپنے کو ان کا مرہونِ احسان سمجھ لیا۔ اس طرح اس میں احساس کمتری پیدا ہوتا گیا۔ اور اپنے کو سب سے پست سمجھ لیا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ ان میں سے کسی کے استعمال کا حق نہیں رکھتا بلکہ وہ خود ان میں سے ہر شے کی خدمت کرنے کیلئے رہ گیا۔ اسے اب تو پوری زندگی ان سب کی پوجا میں صرف کردینا چاہئے۔ اس طرح اس کی نگاہ پست ہوگئی اور نگاہ کے ساتھ معیارِ اخلاق پست ہوا۔ بلندیٔ اخلاق کے لئے ضرورت ہے کہ انسان کو اس کا صحیح درجہ بتایا جائے۔ اس طرح اس کے مقاصدِ حیات بلند ہوں گے اور پھر اس کی زندگی بھی بلند ہو جائے گی۔

اس کے لئے قرآنِ کریم نے افرادِ انسان کو آواز دے کر بتایا خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کہ ارگاہِ عالم میں جتنی کائنات ہے وہ سب تمہارے لئے ہے" پہاڑ کتنے ہی بڑے ہوں، درخت کتنے ہی بلند ہوں حیوان کتنے ہی خیر و برکت کا سرچشمہ ہوں، تصرف کا حق ان سب میں تم کو ہے۔

اب جب تمام کائنات انسان کے لئے ہوگئی تو اسے احساسِ بلندی ہونا چاہئے۔ اب اس کا مقتضا یہ ہے کہ یہ پہاڑوں، درختوں اور حیوانات کے آگے نہ جھکے۔ یہ لَا إِلٰهَ کی منزل ہے۔ یہاں پر تمام کائنات سے معبود ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک انسان پہنچ گیا۔ اب

انسان سے مافوق ہستی کا اگر تصور نہ ہوا تو زندگی بے مقصد ہوگی اور غلط مقصد میں صرف ہونے والی زندگی ہی کی طرح اخلاقی طور پر بے مقصد زندگی بھی پست ہوگی۔

اپنے ہی کو اپنا مقصد اگر بنا لیا تو بے کاری، تن آسانی اور سہولت پسندی کی زندگی بسر ہوگی۔ اس کا نظریہ یہ ہوگا کہ عیش کرو مزے سے زندگی بسر کرو اور ممکن سے ممکن آرام اور ہر طرح کے لذائذ نفس حاصل کرو۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہو بس تم ہی ہو۔

اب اس نصب العین کی صورت میں تصادم بھی ناگزیر ہے۔ کیونکہ مادرِ فطرت کے بطن سے کوئی ایک ہی فرد تو پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ افرادِ انسانی بکثرت ہیں۔ اب اگر نوعِ انسانی میں سے ہر فرد نے اپنے لطف اور لذتِ نفس ہی کو نصب العین قرار دے لیا تو ہر ایک کے جینے کی راہ میں دوسرے کی زندگی حائل ہوگی۔ اس طرح کوشش ہوگی کہ دوسرے کی زندگی سے اپنی زندگی کو مقدم سمجھا جائے اور اس کا نتیجہ یہی ہے کہ قوی ضعیف کو اور دولت مند غریب کو کھا جائے۔ اپنے کو اپنا مقصد بنا لینے کا تقاضائے عقلی یہی ہے کہ جو شخص اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اسے پہنچانا چاہئے اور جو نہیں فائدہ پہنچا سکتا وہ بدقسمت ہے اور اسے استحقاقِ حیات ہی نہیں ہے اسی سے "طاقتِ حق ہے" کا نظریہ قائم ہوتا ہے۔

اس ذہنیت کا علاج صرف یہ ہے کہ اس انسان کو اس سے مافوق قوت کا تصور قائم کرایا جائے اور وہ قوت بھی ایسی جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ اب جب اس کی رضا جوئی مطلوب ہوگی، جو تمام کائنات کا پروردگار ہے تو دوسرے کی زندگی کو بھی اپنی ہی زندگی کی طرح عزیز رکھنا ہوگا۔ اسی تصور کے لئے لَا اِلٰہَ کے بعد اِلَّا اللہُ کی

منزل پر پہنچنا لازم ہے۔

اب سلسلہ یوں مرتب ہوگیا کہ ماسوائے انسان سب انسان کے لئے اور خود انسان خالق انسان کے لئے ۔۔۔ پہلے جزو کو قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا "تمہارے لئے سب کو خلق کیا" اور دوسرے جزو کو کبھی ان لفظوں میں کہ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونَ "جن وانس کی خلقت اس لئے ہے کہ وہ میری رضا جوئی کریں" اور کبھی اس طرح کہ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

تمہارا قول یہ ہونا چاہئے۔ الفاظ نہیں بلکہ مقولہ۔ نظریہ اور اصول کے معنی میں۔ یعنی تمہارا اصول زندگی یہ ہونا چاہئے کہ میری زندگی اور موت سب اللہ کے لئے ہے۔ اب جب اللہ کے لئے ہے تو اللہ کے کام میں صرف ہونا چاہئے مگر اللہ کا کام خود اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ غنی مطلق ہے۔ بلکہ یہ کام اس کی مخلوق ہی سے وابستہ ہوگا۔ ان سب کا مفاد جن کا اللہ سے رشتہ ہے اللہ کا کام ہوگا۔ اسی لئے مَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ کہنے کے بعد رب العالمین کا لفظ کہا گیا۔ یعنی اللہ کا وصف یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمام عالمین کا پروردگار ہے، اور اس طرح ہمہ گیر طور پر حقوق انسانی کے تحفظ کیلئے قربانی کا تصور پیدا کیا

جبکہ کچھ فرقوں نے ایسا خیال قائم کر لیا تھا کہ اللہ ہمارا ہے اور کسی کا نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں" مگر مسلمانوں کو تعلیم دی گئی کہ وہ کہیں هُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ "وہ ہمارا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی پروردگار ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال"

اسی وسعت کو رب العالمین کے لفظ سے ظاہر کیا گیا کہ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس صورت میں اس کے مقاصد بھی محدود نہیں ہو سکتے۔ اس کو ہر ایک کا فائدہ مد نظر ہوگا۔ اب اگر انسان نے خالق کی رضا کیلئے اس کے مخلوق کو کوئی اہم فائدہ پہنچانے میں جان دیدی تو یہ اس کی راہ میں قربانی قرار پائے گی۔

انسان کی زندگی فقط اپنے لئے ہوتی تو ایثار اور قربانی کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا۔ جیسا کہ موجودہ زمانے میں "روٹی" کا نعرہ شدت سے لگایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جیتے جی کون ہوگا جو روٹی کی اہمیت سے انکار کرے مگر یاد رہے کہ روٹی کی اہمیت ذریعۂ حیات کی حد تک ہے اور صاف بات ہے کہ مقصد ذریعہ سے اشرف ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روٹی کی اہمیت سے زیادہ خود حیات کی اہمیت ہے۔ اب اگر ہماری حیات کا بھی کوئی مقصد ہے تو وہ مقصد خود حیات سے زیادہ مقدم ہوگا۔ پھر روٹی سے مقدم کیونکر نہ ہوگا۔ لہٰذا روٹی کی اہمیت ضرور ہے مگر اس حد تک کہ مقصدِ حیات کو نقصان نہ پہنچے۔ لیکن اگر روٹی کا حصول مقصدِ حیات کے پامال کردینے سے وابستہ ہو جائے تو وہ روٹی کا خیال ترک کر دینے کے قابل ہے۔ اکلِ حلال اور اکلِ حرام کی تفریق یہیں سے پیدا ہوتی ہے۔ کون ذریعۂ معاش حلال ہے اور کون ذریعۂ معاش حرام۔ ایک مزدور سر کا پسینہ ایڑی تک بہا کر بھی روٹی کھاتا ہے اور ایک چور اور ڈاکو بھی محنت سے روٹی حاصل کرتا ہے۔ مگر وہ روٹی مقصدِ حیات کے ساتھ سازگار ہے اور یہ نہیں ہے اس لئے وہ حلال ہے اور یہ حرام۔

اگر روٹی زندگی اور مقصدِ زندگی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر رہے تو روٹی والے نظام اور مذہب سے کسی اصولی تصادم کا

سوال پیدا نہ ہو۔

"خوردن برائے زیستن" بالکل درست ہے مگر "زیستن برائے چہ؟" بھی ایک مستقل سوال ہے۔ دنیا کا کوئی بھی اقتصادی نظام ہو وہ پہلے ہی مرحلہ کی تنظیم کرتا ہے اور مذہب دوسرے مرحلہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

وہ غذا جس کے کھانے سے آدمی مر جائے گا۔ ہے تو وہ بھی روٹی مگر چونکہ ذریعہ ہونے کے بجائے مغنیِ حیات ہے اسی لئے نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ اسی طرح مبلغہ، اولیٰ وہ روٹی۔ جو مقاصدِ حیات کے لئے تباہ کن ہو نظر انداز کرنے کی مستحق ہوگی۔

ضبطِ نفس، صبر و تحمل، قناعت، ایثار اور قربانی کا سنگِ بنیاد یہی تفریق ہے کہ کچھ چیزیں انسان کی خاطر ہیں اور کوئی چیز وہ ہوتی ہے جس کی خاطر انسان ہے۔ جب انسان ان مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی یا زندگی سے وابستہ کسی چیز کو تج دیتا ہے تو اس کا نام ہوتا ہے قربانی اور اسی زندگی سے ہاتھ دھونے کا نام ہوتا ہے "شہادت"۔

اس طرح قربان ہونے والا بظاہر فنا ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ زندگی جاوید حاصل کرتا ہے اور یہ انسان سے مخصوص نہیں، بلکہ تمام نظامِ کائنات اسی قربانی پہ قائم ہے۔

زمین جمادات میں داخل ہے۔ بے جان چیز ہے مگر یہ زمین دو قسم کی ہوتی ہے، ایک کو کہتے ہیں زمین مردہ اور دوسری کو زمین زندہ۔ مردہ زمین وہ اوسر یا بنجر زمین ہے جس میں نباتات کے روئیدہ کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور زمین زندہ وہ ہے جس میں نشو و نما کی طاقت ہو تھوڑے سے بیج بوئے اور ان سے ایک ایسا سایہ دار درخت ہو گیا جو ایک قافلہ کو اپنی چھاؤں میں پناہ دے سکتا ہے۔ اور تھوڑے سے دانے سپردِ زمین کئے

اور ان سے ایک لہلہاتا ہوا کھیت ہو گیا۔ جو ایک خاندان کی پرورش کر سکتا ہے اس نشوونما کا راز کیا ہے۔ اس کے متعلق چھان بین کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود زمین میں قدرت نے ایسے اجزاء ودیعت کئے ہیں جو اپنے سے مافوق یعنی نباتات کے جزو بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زمین ان اجزاء کو امانتداری کے ساتھ محفوظ رکھتی ہے کسی حقدار کے آنے کے انتظار میں جب وہ حقدار آ جاتا ہے تو زمین ان اجزاء کو اس کی خاطر نذر کر دیتی ہے پھر کچھ فیض ہوا سے کچھ فیض آب سے اور کچھ فیض آفتاب سے۔ اجزاء شریک ہوتے جاتے ہیں مگر بنیادی اجزاء وہی ہیں جو زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب یہ زمین کے ذرات اپنے حدود وجود میں فنا ہو گئے یعنی خاک میں وہ نہ رہ گئے لیکن یہ فنا بلند تر بقاء کا ذریعہ ہوئی۔ وہ زمین مردہ ہے جس میں اس قربانی کی صلاحیت نہ ہو اور وہ زمین زندہ ہے جس میں اس ارتقاء کی گنجائش ہو۔

اس کے بعد یہ درختوں کے پتے، یہ سبزہ، یہ پھل پھول کیا چھوڑ دیئے جائیں تو یوں ہی باقی رہیں گے؟ کبھی نہیں، تمازتِ آفتاب، بادِ سموم اور کچھ نہ ہو تو امتدادِ زمانہ سے ختم ہو جائیں گے اور ان صورتوں سے ختم ہوں تو خاتمہ ہی ہے لیکن اگر کسی جاندار کی غذا بن جائیں تو فنا تو ہوئے لیکن یہ فنا ایک بلند تر بقاء کا ذریعہ ہے۔ یعنی اب وہ ایک جاندار کے جسم میں لہو بن کر دوڑنے لگے۔

یہاں تک تو عقلائے زمانہ میں کوئی اختلاف نہیں، یعنی جمادات نباتات کی خاطر اور نباتات حیوانات کی خاطر قربان ہوں تو کسی کو اعتراض نہیں مگر اس کے بعد ہے حیوان اور انسان کی منزل۔ یہاں پہنچ کر بعض جماعتوں میں جذبۂ ترحم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حیوان کی قربانی کو انسان کی

خاطر ظلم قرار دیتے ہیں۔

جہاں تک جذبات کا تعلق ہے بلاشبہ یہ رحم کا جذبہ قابلِ قدر ہے بشرطیکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جو جانور کی جان لینا پسند نہیں کرتا وہ انسان کی جان لینا کیونکر گوارا کر سکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اصول جذبات کے پابند نہیں ہوتے۔ یہ سنجیدگی سے طے کرنے کی بات ہے کہ انسان دیگر حیوانات سے بالاتر ہے یا نہیں اور جبکہ یہ بالاتر یقیناً ہے تو جمادات، نباتات کے کام آئے تو ظلم نہیں ہوا، نباتات حیوانات کے جزو بدن ہوئے ظلم نہیں ہوا تو پھر اگر حیوان انسان کے کام آئے تو کیوں ظلم قرار پائے گا؟

ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ زمین اور درختوں میں احساس نہیں ہے۔ حیوان میں احساس ہے اس لئے یہ ظلم ہے مگر میں کہوں گا کہ کیا ظلم کا معیار احساسِ تکلیف ہے؟ یعنی قاتل مقتول کو اس کے ہوش و حواس کی حالت میں قتل کر دے تو جرم ہوگا اور اگر بیہوشی سنگھا کر اور بیہوشی کی حالت میں قتل کر دے تو جرم نہ ہوگا؟ یہ قطعاً غلط ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم میں شعور اور بے شعوری کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ظلم کا معیار اقدامِ ناحق ہے۔ وہ اقدامِ ناحق باشعور کے ساتھ ہو تو ظلم ہوگا اور بے شعور کے ساتھ ہو تو ظلم ہوگا۔ لہٰذا اگر پست کا بلند کے کام آنا ظلم ہے تو زمین میں کھیتی کرنا بھی ظلم ہے نباتات سے غذا حاصل کرنا بھی ظلم ہے۔ اور اگر پست کا بلند کے کام آنا ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے مقصدِ وجود کی تکمیل ہے تو پھر حیوان کی قربانی کو ظلم نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اسلام اس حیوان کو بھی جس کی قربانی ہو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے مَیتہ نہیں قرار دیتا۔ یعنی اگر اپنی موت سے مرتا تو وہ مَیتہ (مُردہ) ہوتا لیکن جب اپنے سے بالاتر یعنی انسان کے کام میں آنے کے قابل ہوا تو حالانکہ وہ مر گیا ہے مگر اس کا نام مَیتہ نہیں بلکہ ذبیحہ ہے

اور صرف نام کا فرق نہیں بلکہ احکام کا بھی فرق ہے۔ اگر میتہ ہو تو نجس یعنی زندگی میں وہ جانور پاک تھا۔ مگر اب مرنے سے نجس ہو گیا۔ لیکن اگر ذبیحہ ہے تو پاک ہے۔ اور وہی اجزا پاک نہیں جو زندگی میں پاک تھے بلکہ خون متعارف بہنے کے بعد جو خون اجزائے گوشت میں پیوست رہ جائے وہ خون بھی پاک و حلال ہے۔ یہ عزت ہے اپنے سے افوق کی خاطر قربان ہونے کی۔ پھر جبکہ حیوان اپنے سے بلند کے کام آئے تو وہ میتہ نہیں ہے تو انسان بھلا جب اپنے سے بلند کے کام آئے تو مردہ ہوگا؟ ناممکن ہے۔ بے شک وہ جسمانی حیثیت سے مر گیا۔ لیکن اگر وہ اپنی موت مرتا تو میت ہوتا اور جب اس نے اپنے سے بالاتر کی خاطر جان دی تو اب وہ میت نہیں ہے۔ بلکہ شہید ہے اور فقط نام کی تفریق نہیں بلکہ احکام کا بھی فرق ہے۔ اگر میت ہے تو نجس یعنی کتنا ہی صاحب اوصاف، بلند مرتبہ انسان ہو۔ مرنے کے بعد اس کا جسم شریعت اسلامی کی رو سے نجس قرار پاتا ہے اسی نجاست کے دور کرنے کے لئے غسل میت قرار دیا گیا ہے جب غسل ہوگا۔ تب جسم پاک ہوگا۔ لیکن اگر شہید ہے تو مرنے کے بعد غسل کی ضرورت نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں نجاست کا گذر ہوا ہی نہیں۔ بلکہ کفن کی بھی ضرورت نہیں اور لباس سے معرکۂ جنگ میں بہے ہوئے خون کے چھڑانے اور اس کپڑے کو پاک و صاف کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اسی خون بھرے لباس میں دفن کر دینا چاہئے۔ کیونکہ خون مردانِ راہ خدا کی زینت ہے۔

مگر یہ درجہ جس کا نام شہادت ہے اسی وقت حاصل ہوگا کہ جب اپنے سے بالاتر کی خاطر جان دی جائے لیکن دنیا والے عموماً جن جن چیزوں کی خاطر جان دیا کرتے ہیں۔ وہ سب پست ہیں مثلاً دولت کے لئے اگر جان دی تو دولت کیا چیز ہے۔ انسان سے کئی درجے پست۔ اصل دولت کا معیار نقد ہے یعنی

سونا - جس ملک کے پاس سونا زیادہ وہ ملک مالدار - یہ کاغذ (نوٹ) تو قیمتی اسی وقت ہے کہ جب اس کے بدلے کا سونا محفوظ ہو - اب سونا کہ جو اصل دولت ہے وہ حقیقت و اصلیت میں کیا چیز ہے، جو ٹھوکروں میں آنے والے پتھروں یعنی جمادات، جسے قدرت نے ذرا شوخ رنگ کا بنا دیا، اسے دنیا لعل و یاقوت و زمرد کہنے لگی، اسے قیمتی سمجھا جانے لگا کیونکہ قیمتی ہونے کا معیار اس بازار دنیا میں کسی شے کا کارآمد ہونا نہیں بلکہ کمیاب ہونا ہے حالانکہ خالق حکیم کے نظام فطرت میں جو شے کمیاب ہے وہ زندگی کے لئے بیکار ہے - اس نے جو شے زیادہ ضروری ہے اتنی ہی زیادہ پیدا کی ہے، سب سے زیادہ ضروری چیز زندگی کے لئے ہوا ہے، وہ سب سے زیادہ پیدا کی گئی اور ہر جگہ - یہاں تک کہ اگر ہم اس سے بھاگنا بھی چاہیں تو وہ ساتھ نہ چھوڑے گی - دوسرے درجہ پر حیات کیلئے ضروری پانی ہے تو وہ پیدا بھی اسی تناسب سے کیا گیا - وہ موجود ہر جگہ ہے مگر محتاج ذرائع ہے - ہوا کے حاصل کرنے کے لئے ڈول، رسی کی ضرورت نہیں بلکہ خود ہمارے نظام حیات میں نفس کی آمد و شد ہی صالح ہوا کے جذب اور فاسد کے دفع کا کام دیتی ہے اس طرح ضرورت حیات کی تکمیل کو جزو حیات بنا دیا گیا ہے مگر پانی کو حاصل کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ سعی و عمل کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر ہوا کے ہم تھوڑی دیر بھی زندہ نہیں رہ سکتے - لیکن پانی کئی وقت بھی نہ ملے تو زندہ رہ سکتے ہیں تیسرے درجہ پر غذا ہے اس لئے غذا کی خلقت بھی اسی صورت پر ہوئی پانی کے حصول سے زیادہ اسکی پیداوار ذرائع کی محتاج قرار دی گئی - جو چیزیں روزمرہ کے ضروریات سے بالکل غیر متعلق اور اس حیثیت سے بیکار تھیں انہیں پہاڑوں کے اندر رکھ دیا - سمندر کے تہ میں چھپا دیا - مگر یہ انسان کا معیار انتخاب ہے کہ وہ جب کوہ کنی اور غوطہ زنی کر کے ان نہفتہ اشیاء کو حاصل کر

لیتا ہے تو انہی کو سب سے زیادہ قیمتی قرار دے لیتا ہے اور ضروریات زندگی کی چیزیں اس کے نزدیک کم قیمت ہیں۔ اسلئے کہ فیاض خالق نے انہیں کثرت کے ساتھ پیدا کر دیا ہے۔ مگر اصل قیمت کا حال اس وقت کھلتا ہے جب ضروری حیات چیز کسی وقت کمیاب ہو جاتی ہے۔ لق و دق صحرا ہو اور خزانہ پاس ہو مگر پانی نایاب ہو اس وقت دیکھنا ہے کہ خزانہ زیادہ قیمتی ہے یا پانی۔ اسی دولت کی خاطر جو حقیقت کے لحاظ سے بے قیمت شے ہے انسان جان دے دیتا ہے تو یہ جو ہر نفس انسانی کی قربانی اپنے سے تین درجے پست شے کے لئے ہوئی جو جمادات میں داخل ہے۔ یہ قربانی مقتضائے فطرت کے خلاف ہے کیونکہ سنتِ کائنات یہ تھی کہ پست بلند کی خاطر قربان ہو اور چونکہ شریعت بمقتضائے فطرت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ جان دینا انسان کیلئے جرم ہے۔ اس کا نام ہے "ہلاکت"

اسی طرح کچھ لوگ شہرت کی خاطر جان دیتے ہیں، جو کوئی اصلیت رکھنے والی چیز ہی نہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت کی خاطر جو بالکل اعتباری شے ہے جب تک لوگ سمجھ رہے ہیں بادشاہ ہے اور لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا "تو آدمی وہی ہے مگر بادشاہ نہیں رہا۔

اسی طرح وہ جس کے لئے بازاری محاورات میں جان دینے اور مرنے کا لفظ مخصوص ہو گیا ہے یعنی کسی جمال فانی کو مقصدِ قربانی بنانا تو اس سے بقا کیونکر ملے گی۔ جب مرکز قربانی خود فانی ہے تو اس کی خاطر جان دینا تو فنا در فنا ہوگا۔ بقا اس وقت مل سکتی تھی جب فنا فی البقاء ہوتی۔

یہ سب خود اپنی قیمت نہ جاننے کا نتیجہ ہے کہ آدمی اپنے کو ایسی پست چیز پر قربان کرے۔ اس قربانی کو شہادت نہیں کہہ سکتے

یہ عوام کی غلط ذہنیت ہے کہ وہ زمین پر بہتے ہوئے خون اور خاک و خون میں غلطاں لاش کو دیکھ کر شہید سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مدفن کو شہید کا مزار قرار دے لیتے ہیں۔ شہادت کا تعلق مقصد کی بلندی کے ساتھ ہے۔ انسان کو مقصد قربانی اپنے سے مافوق قرار دینا لازم ہے اگر وہ پست مقصد کی خاطر جان دیگا تو وہ ہلاکت کا مصداق ہو گا۔ شہادت کا نہیں۔

عالمِ ممکنات میں ہر شے انسان سے پست ہے۔ اس سے بالاتر صرف خالقِ کائنات کی ذات ہے۔ اس لئے اس کی قربانی شہادت اسی وقت ہوگی کہ جب خالق کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسی لئے قرآن مجید نے حیاتِ جاودانی کی نوید دیتے ہوئے صرف قتلوا نہیں کہا جس کے معنی یہ ہوتے کہ جو قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ قید لگائی کہ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ۔ معلوم ہوا کہ حیاتِ جاودانی اسی وقت ملے گی کہ جب مقصدِ قربانی اللہ کی طرف راجع ہو۔

مگر یہاں ذہن کو ایک دشواری محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جو بھی کسی دوسرے کے لئے قربان ہوتا ہے تو وہ دوسرا ہوتا ہے۔ محتاج اور مرکز آفات۔ جب ہی قربانی کا تصور درست ہوتا ہے۔ مثلاً زمین پودوں کے کام آئی تو پودے محتاج تھے۔ وہ ضرورت زمین سے پوری ہوئی پودے حیوانات کے کام آئے۔ حیوانات محتاج غذا تھے۔ اگر غذا نہ ملتی تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ پودوں نے اس ضرورت کو پورا کیا۔ اور اسی طرح حیوان کی قربانی انسان کے لئے ہوئی۔ کیونکہ انسان بھی غذا کا محتاج تھا۔ حیوانات و نباتات سے وہ ضرورت پوری ہوئی لہٰذا قربانی کا تصور صحیح ہوا مگر انسان سے مافوق جو ذات ہے وہ غنی بالذات ہے اور

فنا و تغیر سے بری ہے پھر اس کے لئے قربانی کا امکان کس طرح ہے؟

مگر قرآن مجید نے اس مشکل کو ایک لفظ سے حل کیا ہے۔ مقصدِ قربانی کے اظہار کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ فی سبیل اللہ "راہِ خدا میں" ظاہر ہے کہ راستہ عین منزل نہیں ہوتا۔ راستہ اور ہوتا ہے، منزل اور ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصد قربانی ذاتِ الٰہی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جو اسے پسند ہیں۔ ان مقاصد کے لئے جان دی جائے تو "شہادت" قرار پائے گی اور جو پست مقاصد کے لئے جان دی جائے وہ "ہلاکت" ہے۔

اسے زیادہ صاف لفظوں میں یوں سمجھا جا سکتا ہے، کہ ہلاکت اور شہادت کے مابین دو درجوں کا فرق ہے اس لئے کہ درمیان کی منزل سمجھنا چاہئے فطری موت کو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص مقصد کی خاطر اختیاراً جان نہیں دی بلکہ بیمار ہوئے، کوئی اتفاقی حادثہ پیش آیا، یا عمر طبعی پوری ہو گئی۔ مر گئے۔ یہ درمیان کا درجہ ہے۔ باین معنی کہ اس میں نہ ترقی ہے نہ تنزل، نہ ثواب اور نہ عذاب۔

غلط فہمی نہ ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اعمال کا ثواب و عذاب نہ ہوگا بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس موت کا کوئی ثواب یا عذاب نہیں۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں مر گئے اور نہ یہ کہ بڑا کام کیا مر گئے۔ یعنی نہ ملامت نہ شکریہ یہ تو ہوئی وسط کی منزل۔ اس کے نیچے ہے ہلاکت یعنی باختیار پست مقصد کی خاطر جان دینا اس میں عذاب ہے اور اس کے اوپر ہے شہادت یعنی باختیار بلند مقصد کے لئے جان دینا جس میں حیاتِ جاودانی ہے اور بیش قرار اجر و ثواب۔

اب جس وقت کہ ہلاکت اور شہادت میں اتنا بڑا فرق ہے، تو کسی شہید راہِ خدا کے اقدامات عملی کے مقابل میں یہ آیت پیش کرنا

ہرگز درست نہیں ہے کہ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ (یعنی اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔

یہ سوال کبھی درست نہ ہوگا۔ کہ قرآن میں ہلاکت کی طرف جانے سے روکا ہے پھر حضرت امام حسینؑ جانتے تھے کہ کربلا میں کیا ہوگا۔ تو عراق کی طرف کس لئے آئے؟ یا جانتے تھے کہ میدان میں تیرِ ستم کا اندیشہ ہے، تو علی اصغرؑ کو کیوں لے گئے۔ یا جانتے تھے کہ آپ اور آپ کے تمام ساتھ والے مجاہدین شہید ہو جائیں گے تو اہل حرم کو اپنے ساتھ کیوں لائے

یہ سوال بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن نے جو روکا ہے وہ ہلاکت کی طرف جانے سے روکا ہے۔ شہادت کی طرف جانے سے نہیں منزلِ شہادت کی طرف جانے والا خطرہ کو سمجھتا ہے اور اگر خطرہ محسوس نہ کرے تو صبر و ثباتِ قدم کی قیمت ہی کیا ہوگی۔ وہ اتفاقی حادثہ قرار پائے گا۔ مگر وہ نگاہِ فرض شناس کی ترازو میں جان اور مقصد کی اہمیت کا موازنہ کرتا ہے اور پھر مقصد کو جان کے مقابلہ میں ترجیح دے کر بقدم اختیار آگے بڑھتا ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے "شہادت"

اب یہ ہمت دل اور مقصد کی قدر کے مراتب ہیں کہ کوئی اپنی ہی جان دے اور کوئی اپنے دل کے ٹکڑوں کو، وابستہ افراد کو اور اپنے سے متعلق ہر عزیز چیز کو مقصد پر نثار کر دے۔

واقعۂ کربلا اس باب میں منفرد نظر آتا ہے۔ ہر معرکہ میں معین کر کے بتا سکتے ہیں کہ یہ قربانی پیش کی گئی۔ لیکن کربلا میں تو یہ سوچنا ہے کہ کیا چیز نہیں قربان کی گئی۔ یہاں جو بھی شے کسی شخص کو عزیز ہو سکتی ہے۔ وہ مقصد کی راہ میں نثار کر دی گئی بلکہ حضرت امام حسینؑ نے ایسا انتظام کیا کہ قربانی آپ کی زندگی تک محدود نہ رہے سو آپ اپنے ساتھ ایک قربانیوں کا لشکر

للئے مجھے جو عصر کے ہنگام تک جہاد کرتا رہا۔ اور ایک قربانیوں کا خاموش قافلہ ا سے تھے حسین کا جہاد عصر کے بعد سے شروع ہوا دنیا والے کہتے تھے کہ آپ جاتے ہیں تو عورتوں اور بچوں کو کیوں لئے جا رہے ہیں ۔ مگر حضرت امام حسینؑ تو اپنی قربانی کو مقصد کی بلندی کے مطابق رکھنا چاہتے تھے ۔ آپ محسوس فرماتے تھے کہ اسلامی احساسات پر کتنی شدید غشی چھائی ہوئی ہے اور اس کے لئے کتنے تیز چھینٹے کی ضرورت ہے ۔ آپ کو دشمنوں کی شقاوت کا بھی صحیح اندازہ تھا۔ اور اس کے نتائج بھی پوری طرح پیش نظر تھے اور اس سب کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے اپنی قربانی کے اجزاء مرتب فرمائے تھے جو مقصد الٰہی کے تحفظ کے لئے ضروری تھے ۔

اب واقعہ کربلا کی روشنی میں ہلاکت اور شہادت کا فرق بہت صاف محسوس ہو جاتا ہے ۔ ادھر کم از کم تیس ہزار اور ادھر صرف بہتر یا زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو ۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ادھر والے بالکل مطمئن تھے ۔ نہیں وہ بھی جانیں دے رہے تھے ان میں سے ہر فرد کو خطرہ کا احساس تھا ۔ اس لئے کہ اس کے قبل کے بدر و احد اور خندق و خیبر یا پھر جمل و صفین اور نہروان کے تذکرے ابھی دماغوں سے بالکل محو تو نہیں ہوئے تھے اور پھر ماضی قریب میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ کوفہ میں تن تنہا مسلم بن عقیلؑ نے جنگ میں وہ کارِ نمایاں انجام دیا کہ محمد بن اشعث کو اپنے ساتھ کافی جمعیت رکھتے ہوئے ابن زیاد سے کمک منگانا پڑی اور جب ابنِ زیاد نے کہا کہ ایک آدمی کے مقابلہ کے لئے اتنی فوج کیا کافی نہیں ہے ۔ تو محمد بن اشعث نے جواب دیا کہ کیا مجھے کوفہ کے کسی بنیے بقال سے مقابلہ کے لئے بھیجا ہے ؟

ارے یہ محمدؐ کی تلواروں میں ایک تلوار ہے ساب دیکھیے کہ کوفہ میں تو صرف ایک تلوار تھی لیکن کربلا میں کم از کم اٹھارہ تلواریں تھیں اور جو انصار حسینؑ تھے وہ بھی کوئی معمولی افراد نہ تھے - ان کے لئے سرداران فوج یزید کے یہ الفاظ تھے کہ یہ سب کوفہ کے مخصوص شہسوار ہیں جو ہمارے مقابلہ میں نبرد آزما ہیں۔ یہی کا نتیجہ ہے کہ ان قلیل افراد کے قدم تو ایک دفعہ بھی پیچھے نہیں ہٹے لیکن تیس ہزار فوج نے کئی مرتبہ میدان چھوڑا - اس کے بعد یہ ماننا ضروری ہے کہ ادھر والے بھی جانیں دے رہے تھے۔ لیکن کاہے کے لئے؟ وہ مقصد ان کے سالار (عمر سعد) کے اس اعلان سے ظاہر ہے جو اس نے تیر چلّہ کمان میں جوڑتے ہوئے بلند آواز سے کہا تھا۔ اور فوج والوں کو مخاطب کرکے کہا تھا کہ گواہ رہنا کہ پہلا تیر فوج حسینؑ کی طرف میں نے لگایا ہے - بس واقعۂ کربلا کا پورا پس منظر اس ایک جملہ میں مضمر ہے عمر سعد نے فوج والوں کو گواہ کیا ہے - کہاں کے لئے؟ دربار حکومت میں گواہی دینے کے لئے - یعنی تمام کارنامہ کا مقصد حکومت وقت کی رضا جوئی اور جائزہ و انعام کی ہوس ہے - اب اس راہ میں جو جانیں گئیں انہیں ہلاکت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

دوسری طرف حضرت امام حسینؑ نے بھی ایک وقت اپنے عمل پر گواہی چاہی - وہ کب؟ جب فرزند جوان مرنے کے لئے روانہ ہو رہا تھا بوقت رخصت علی اکبرؑ، حسینؑ نے ہاتھ اٹھائے - بارگاہِ الٰہی میں کہا پروردگارا گواہ رہنا کہ اب وہ جا رہا ہے، جو صورت و سیرت، رفتار اور گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے - جب ہم مشتاقِ زیارت رسولؐ ہوتے تھے تو اپنے اس فرزند کو دیکھ لیتے تھے۔"

چونکہ عمر سعد کا مقصد عمل خود واقعہ کا نگران نہیں تھا - اس لئے دوسرے

کی گواہیاں درکار ہوئیں۔ لیکن حسینؑ کا مقصدِ قربانی خود حاضر و ناظر تھا۔ لہٰذا دوسرے کو گواہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ خدا ہی کے سامنے اپنی وارداتِ قلب پیش کر دی۔

یہ تھی وہ قربانی جو مرکزِ اعلیٰ کی خاطر پیش ہو رہی تھی۔ اس لئے وہ شہادت کا مصداق ہوئی جو حیاتِ جاوید کی ضامن ہے۔

یوں تو اس حیاتِ جاوید اور اس کے بالمقابل فنا کی حقیقت ہی دوسری ہے۔ مگر ظاہری آثار کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو کربلا میں ہلاک ہونے والے کتنے تھے۔ وہ یقیناً شہید ہونے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ کربلا کے مجاہدین میں سے ہر ایک کے ہاتھ سے کئی کئی آدمی قتل ہوئے۔ بعض مجاہدین کے حال میں ہے کہ ضجت الاعداء من کثرۃ القتلیٰ بینهم" فوج دشمن کثرتِ مقتولین سے چیخ اٹھی" مگر ان بے شمار مرنے والوں کا نام و نشان بھی قطعاً موجود نہیں۔ یہ ہے ہلاکت جس کا نتیجہ حقیقی معنی میں مٹ جانا ہے۔ اور امام حسینؑ کے ساتھ والے قیامت تک کی زندگی رکھتے ہیں یہاں تک کہ ۶ مہینے کی جان علی اصغر جو باپ کے ہاتھوں پر شہید ہو گئے ان کے لئے وہ چھ مہینے کی زندگی اس مصرف میں صرف ہونے کے بعد اس طولانی حیات میں تبدیل ہو گئی جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

یہ شہید ہونے والے ایسے تھے جنہوں نے مقصد کی بلندی کو دیکھ کر اپنی جانیں باختیار خود نذر کر دیں۔ شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً باختیار۔ اسے یوں ہی دیکھ لیجئے کہ کربلا میں انکارِ بیعت جس وقت بھی اقرار سے بدل جاتا اسی وقت جانیں خطرہ سے محفوظ ہو جاتیں لیکن انکار انتہا تک رہا۔ بڑوں کا کیا ذکر کسی بچہ تک نے امام

سے نہیں کہا کہ بس اب مصائب نہیں اٹھتے۔ اب بیعت کر لیجیے۔

یہاں تک کہ جب امامؑ شہید ہو گئے اور اہلِ حرم رہ گئے۔ تو ان میں سے کبھی کسی کے ذہن میں بیعت کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ یزید ظلم کرتے کرتے عاجز ہو گیا اور آخر میں جب احساسِ شکست ہوا تو پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کے بعد کسی ان کے یہاں کے غلام یا کنیز یا آج تک ان کے کسی نام لیوا تک کو پشیمانی نہیں ہوئی۔

وہ پشیمانی کیا تھی؟ اپنی موت کا احساس تھا۔ جس میں غلط مقصد میں کوشش کرنے والے کو مبتلا ہونا ہے۔ خواہ وہ کچھ عرصہ تک دنیا میں زندہ رہے تو وہ زندگی بھی اس کی موت ہے اور خواہ اس راستے پر مرجائے تو وہ مرنا بھی ہلاکت ہے۔ جو دائمی ہے اور موت سے بدتر ہے۔

اور کارنامۂ حسینیؑ پر نازش و پایندگی کا سبب صرف حیاتِ جاودانی کا احساس ہے۔ جو شہادت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جتنا شہادت کا مرتبہ رفیع ہوگا۔ اتنے ہی زندگی کے نقوش زیادہ نمایاں ہوں گے۔ جیسا کہ شہید کربلا حضرت امام حسینؑ جو سید الشہداءؑ تھے۔ ان کی شہادت سے حاصل شدہ زندگی بھی ہر زندگی سے زیادہ درخشاں اور پائدار ہے۔

واقعۂ کربلا کی تبلیغی شان
حسینؑ سر سے خون تک ہر قطرہ ایک مبلغ مذہب تھا

کربلا مبلغ اعظم

کربلا کے مبلغ حضرت امام حسینؑ نے مدینہ سے لے کر کربلا تک جو اقدام بھی کیا وہ تبلیغی شان لئے ہوئے تھا۔ یہی تو وجہ ہے کہ دنیا پر امام حسین اور یزید کا کردار نہ صرف واضح ہوگیا بلکہ حق و باطل میں امتیاز کرنے کا سامان مہیا ہوگیا

شبیر کا نشان قدم شمع بن گیا　　انسانیت کی تیرہ و تاریک راہ میں

جس وقت باطل کا پورا زور ہوگیا تھا۔ مذہب کا چراغ جھلملا رہا تھا اور بجھنے کے قریب تھا، دین خدا کا نقشہ بگاڑ دیا گیا تھا اس طرح کہ پہچانا نہ جاتا تھا، معصیت پروردگار کی آندھیاں چل رہی تھیں اور ملت حقہ کی کشتی باد مخالف کے تھپیڑوں سے ڈوبنے کے قریب تھی، ضرورت تھی ایک مبلغ مذہب اور داعی الٰہی کی جو ایک مرتبہ عالم کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کردے اور وہ پردے جو دنیا کی آنکھوں پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کو اٹھا دے (ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر)

حسین بن علیؑ کے سوا کون تھا جس کو اس فریضہ کا احساس ہوتا۔ کسے غرض تھی کہ وہ اپنی راحت و زندگی سے ہاتھ دھو کر اپنی جان کو خطرے میں ڈالے اور ملت اسلامیہ کی حفاظت کرے، بڑے بڑے خلفا زادے، صحابہ رسول، ارباب طاقت

واقتدار یزید کی بیعت کر چکے تھے۔

شام سے لے کر مصر، مصر سے لے کر عراق، عراق سے حجاز، فارس، یمن سب اس نوجوان شہوت باد شاہ کی حکومت کو تسلیم کر چکے تھے اور باوجود اس کے کہ یزید کے ننگ انسانیت حرکات اور حیا سوز افعال سے کم سے کم شام و عراق حجاز کا چپہ چپہ واقف تھا اور مصر بھی کچھ زیادہ اجنبیت نہ رکھتا لیکن احساسات فنا اور غیرت وحمیت خیر باد کہہ کر رخصت ہو چکی تھی۔ شام کے حاکم کی مثال ایک ایسے گلہ بان کی تھی جس کے زیر اقتدار ایک کثیر جمعیت حیوانات کی ہو اور وہ ان کو اپنی مرضی کے موافق جس طرف چاہے لے جائے۔ حسین مختلف وجوہ سے حق رکھتے تھے کہ وہ ان حالات سے متاثر ہوں۔ خلافت الٰہیہ کے حقیقی مالک ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرو۔ تب بھی اسلام اور محسوس شریعت کے مخصوص ورثہ دار ہونے کی جہت سے جتنا علاقہ اسلام کو حسینؑ کی ذات سے تھا کسی اور ہستی سے وہ علاقہ نہ ہو سکتا تھا چنانچہ امام حسینؑ نے اپنے فرض کا احساس کیا اور مدینہ سے اس بات کا بیڑا اٹھا کر نکلے کہ دنیا کے سامنے حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیں اور اگرچہ ظاہری اسباب کی حیثیت سے امام نے اپنی جان کو حفاظت کے لئے مدینہ کو وداع کیا مگر حقیقتاً آپ انجام سے واقف تھے اور عظیم ترین فریضۂ تبلیغ کو ادا کرنے کے لئے اپنے جذبات کے پکے اور ثابت قدم رفقاء کی معیت میں راستہ طے کر رہے تھے۔

حسین کی ہر فعل و حرکت اور جنبش و سکون میں تبلیغ مذہب کے اہم اسرار مضمر نظر آتے ہیں اور اگر ایک ناقد خاطر جمعی سے ان رموز پر غور کرے تو ایک مفصل کتاب لکھنے کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔

امام کا مکہ معظمہ میں قیام کرنا سطحی نظر سے اس غرض کے لئے کہ اس مقام مقدس میں خون بہانا حرام ہے لہٰذا ان کی زندگی دشمنوں کے خطرے سے محفوظ رہے گی۔ لیکن ہم اس مقصود کو ایسے شخص کے لئے تسلیم کر سکتے ہیں جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ کہ جو مرنے پر کمر باندھ چکے تھے اور پورے طور سے آخر

تک ہونے والے واقعات سے واقف تھے۔ ان کی نسبت اس خیال کو کہاں تک وقعت دی جا سکتی ہے۔

مکہ معظمہ قلب جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا مرکز تھا، اطراف و جوانب کے قافلے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت شہر حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ علاوہ آمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کے باطل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی عرب کے اس خطہ کے تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا وہ مشہور بازار جو شعر و سخن اور خرید و فروخت وغیرہ کے عظیم مرکز تھے جن میں سے عکاظ، ذوالمجاز اور شوق المجنہ خاص اہمیت رکھتے تھے، ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوا کرتے تھے۔

امام حسین کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسین کو ان کے ذاتی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسول کا نواسہ سلطان حجاز و عراق کا فرزند ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی و جواد جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا بزرگ خاندان یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

حسین نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا۔ مکہ میں اپنے قیام کے لئے تجویز کیا، ہمارا مقصد اس سے یہ نہیں ہے کہ حسین اپنے لئے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ رابطہ بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کرنے کا خیال رکھتے تھے ہرگز نہیں! اگر حسین ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ امام کیلئے مکہ

میں ایک بڑا لشکر جمع نہ ہو جائے، یمن بالکل نزدیک تھا۔ جس کا اسلام بھی علی بن ابی طالب کا رہین منت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو علی بن ابی طالب اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی، طائف بھی کچھ اولادِ رسول کا مخالف نہ تھا لیکن فرزند رسول کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا وہ اپنے تئیں ایک عظیم بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے۔

حسین کا قیام مکہ معظمہ میں صرف اس لئے تھا کہ افراد مسلمین کے آئندہ صورتحال کی طرف ایک توجہ پیدا ہو جائے اور کم از کم یزید کے افعال و اعمال کا چرچا ہونے لگے۔ حسین کے قتل کے لئے حجاج کے لباس میں شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا ان کو حضرت کے پابہ زنجیر کر لینے کی ہدایت کی گئی ہو۔ بہرحال نامعلوم اسباب و علل کے تحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہو جانا اور زمانہ حج کے گذرنے کا انتظار بھی نہ کرنا اس کو امام کے تبلیغی مقاصد میں پورا دخل ہے۔

ایکا ایکی خلاف توقع حسین کا حج کو ترک کر دینا اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑا ہونا، ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک لہر دوڑا دی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ حسینؑ بن علی کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہیں کیا؟ آخر تمام اہل و عیال، اقرباء کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ یزید کے خوف سے، کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے، بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ فرزند رسول اور یزید ایسے شراب خوار اور زناکار فاسق و فاجر کی بیعت کر لے! اچھا پھر، مکہ معظمہ میں کیوں قیام کیا؟ کس لئے حج بھی ترک کر دیا؟ وہاں کا خطرہ تھا شاید مکہ میں حسینؑ کے قتل کرنے کے لئے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے، توبہ، توبہ اس سے بڑھ کر سفاکی اور ظلم کیا ہوگا کہ فرزند رسول کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے۔

یہ تذکرے وہ تھے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر باخبر قبائل کے حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جاری ہے۔

وہ زمانہ کہ جب طرق مراسلت و مخابرت مسدود تھے۔ تار ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسین کی نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا اس کا یہ نتیجہ نہیں تھا کہ امام کے لیے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے جیسا کہ بعض محترم ارباب تصنیف کا خیال ہے لیکن مطلب صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت سے حسین کی شہادت قبائل عرب میں نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہ پائے کہ اہل شام کو اپنے دل سے اس کے لیے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے اور حسین کی مظلومیت و حقانیت مخفی ہو جائے۔ یقیناً اگر امام کی طرف سے ان طرق نشر و اشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو کس طرح کے لباس پہنائے جاتے اور وہ لوگ جن کو افترا بندی و فریب کاری میں خدا کا خوف نہ ہو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے کسی واقعہ کو غلط وجوہ پر مبنی بتانے میں کب تامل کر سکتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسین کا خون رائیگاں چلا جاتا۔ با ایں معنی آپ اپنی جان بھی ہاتھ سے کھوتے اور کوئی ہمدردی بھی افراد بشر کے قلوب میں چھوڑ کر نہ جاتے اور نہ وہ مقصود جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ امام شہید ہوئے اور پوری دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ ناحق قتل کیے گئے۔ شام کا حاکم اور اس کے انسانیت کش وزرا اور اس کے ساتھی ان تہمت تراشنے کا موقع بھی نہ پا سکے اس کو یوں تو خداوند عالم کی قوت قاہرہ سے تعلق ہے مگر بہت کچھ حسین کے تدبر اور اپنے اسباب و علل شہادت کی نشر و اشاعت سے بھی تعلق ہے۔ حسین نے

اپنی نقل و حرکت کے وجوہ کو زندگی ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو خم کرا لیا اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ اور کیا ہو سکتی ہے۔

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا، عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آرہے تھے ادھر امام حسینؑ اپنے اہل و اقربا، انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ تمام اسباب ساتھ لئے ایک قافلے کی صورت میں مکے سے جا رہے تھے، عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا قافلہ بھی نظر آئے تو تشویش ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آتے ہیں! پھر کہاں امام حسینؑ کا شاندار قافلہ اور اصحاب و اعوان کا مختصر لشکر اس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے ہوں مکہ معظمہ کی طرف سے آرہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لئے متوجہ ہے، یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور جالب توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کئے ہیں، چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں، فرزدق کی ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر ہوئی تھی اور عبداللہ بن مطیع و عمر بن عبدالرحمان مخزومی بھی خلاف توقع راستہ میں امام سے دوچار ہو گئے اور پھر جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسین بن علی اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانہ خدا کو بمجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر مجبور کر دیتا تھا۔

زمین کربلا پر امام کا خطبہ اور تبلیغ مذہب

راستے کے تمام اہم واقعات کو چھوڑتے

ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کربلا کی سرزمین پر حسین سے ظاہر ہوئی وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام کا راستہ بند کر دیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب بلکہ انسانیت و غیرت کو خیر باد کہہ کر فرزند رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی ان کا اپنی گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسین اس بات سے واقف تھے لیکن ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کر دے اور تبلیغ دعوت میں کوتاہی نہ کرے۔ امام نے اپنے حق کو خوب ادا کیا۔ اطراف و جوانب کے رہنے والے بنی اسد جن کے حقیقت سے بے خبر ہونے کا احتمال ہو سکتا تھا۔ ان میں تبلیغ کے لئے شب عاشورا اپنے مصاحب خاص حبیب ابن مظاہر کو روانہ کیا اور ان کی تبلیغ کافی اثر سے روشناس ہوئی اور اگرچہ وہ لوگ جو حسین کی حمایت کے لئے حبیب کے ساتھ ہوئے تھے۔ لشکر شام کے سدراہ ہو جانے سے امام تک نہ پہنچ سکے لیکن ان کے دل پر حسین کی عظمت و شرافت اور ان کی حقانیت کا اثر قائم ہو گیا تھا اور تبلیغ کی غرض سے اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوا کرتی۔ اسی کا نتیجہ بعد میں دفن شہدا کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ السلام علی من تولی دفنہ اہل القریٰ

عاشورا کی صبح سے لیکر عصر تک کے واقعات اگر ہم لکھنا چاہیں تو یہ مضمون کافی نہیں ہو سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حسینی فوج کا ہر ایک نوجوان مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بریر ہمدانی کا خطبہ حبیب بن مظاہر کا مکالمہ، زہیر بن قین کا مباہلہ اور تمام انصار و اقربا کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسینی شہادت کے اسباب و علل بیان کرنے میں ایک مبلغ کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر ہوا یا نہ ہو لیکن ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت کشمکش موقعوں پر اور دشوار گذار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کرے اور جو حق اظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔ حر بن یزید ریاحی کا ضلالت چھوڑ کر راہ ہدایت پر آنا بھی ان ہی مواعظ و تبلیغات کا اثر تھا۔

حسینی فوج کے تمام جوان دادِ شجاعت دے کر رخصت ہو چکے۔ ہاشمی خاندان کے شیر بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آ گئے صرف مظلوم حسین باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے ان پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا تاریک ہے مگر وہ الٰہی مبلغ ربانی، داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک سیکنڈ کے لئے غافل نہیں ہے وہ خطبہ پڑھتا ہے تقریریں کرتا ہے، صحابۂ رسول کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے کیا اس امید پر کہ یزیدی لشکر حسین کی حالت پر رحم کھائے گا وہ درہم ودینا کی جلوہ آرائی اور روپیہ اشرفیوں کی جھنکار اور حکومت وسلطنت کی طمع وحرص سے، سرشار ہو کر حق کے راستے سے باز آ جائے گا؟ لا واللہ حسین معاذاللہ ناعاقبت اندیش نہ تھے وہ خوب جانتے تھے مگر بنی نوع بشر کو حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے ان کا مقصود یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کوئی بے خبری اور عدم اطلاع کی وجہ سے اس عظیم گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر رہے گی وہ تبلیغ کے فریضہ سے اپنے کو سبکدوش بنانا چاہتے تھے انھوں نے کوئی دقیقہ اظہارِ حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخری نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے اس وقت بھی جب شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفےٰ کے قریب آ چکا تھا اور امامت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسین نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کی اور اپنے نانا کی صداقت وحقانیت کو ثابت کر دکھایا۔ اے شمر ذرا اپنے چہرے سے نقاب اٹھا شمر نے نقاب ہٹائی حضرت نے فرمایا صدق اللہ جدی میرے نانا رسول نے سچ کہا تھا کہ اے حسین تیرا قاتل ایک ابرص (کوڑھی) شخص ہوگا۔

روحی الفداء! اے حسین بن علی آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق زیرِ خنجر بھی ثابت کر دی آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا آپ کی مظلومیت کا مرثیہ خواں اور ملتِ اسلامیہ کا واحد مبلغ تھا

حسین کی شہادت کے بعد

فاطمہ زہرا کا چاند غروب ہو چکا ہے اور دشمن اپنے مقصد میں ظاہری صورتوں میں کامیاب ہو

چکے ہیں۔ اب کوفہ وشام کے بازار اور بنی ہاشم کے گھرانے کی معزز خواتین ہیں اور نیزوں پر کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں کے سر نصب ہیں سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہل بیت رسول کے لئے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہیں اور دشمنوں کے خیال کے مطابق واقعہ بھی یہی ہے۔ لیکن یہ وہ موقع ہے کہ حسین کی تبلیغ منتہائے شباب پر پہنچ گئی ہے اور دعوت مذہب کا دائرہ عمل سابق کی نسبت وسیع ہو گیا ہے اگر چشم حقیقت بین سے نظر کرو تو نیزہ پر حسین کی پیشانی پر سجدۂ معبود کا نشان پڑا ہوا ہے۔ (سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود) چہرے سے نور ساطع ہے ہونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں (ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا) دوسری طرف مخدرات عصمت جو ان نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنعہ سے محروم ہونے کے بعد بھی غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدی کی تصویر، طہارت و عفت کے اندر ملبوس اور ان کے وہ حقائق و دقائق سے مملو خطبے کانما تفرغ عن لسان ابیھا زینب گویا علی ابن ابی طالب کی زبان میں کلام کر رہی تھیں۔

یہ چیزیں وہ ہیں جنھوں نے شریعت اسلامیہ میں روح پھونک دی۔ دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا۔ عالم کو مشرق سے لے کر مغرب تک حسین بن علی کا مرثیہ خواں اور یزید کے اعمال و کردار سے بیزار بنا دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا اور ہے کہ آج عالم کے گوشے گوشے اور دنیا کے ہر چپہ میں حسین کا نام ہے اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کروڑوں افراد کے دلوں پر قیامت کے لئے حکومت کر رہا ہے اور بنی امیہ کے حریف دعوت کا چراغ ہمیشہ کے لئے اس طرح گل ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے۔ عالم نے دیکھ لیا ہے کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم، ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی شان کیا ہے؟

مقصودِ کعبہ

حیرت انگیز ولادت

اور

عقول کی حیرت انگیز ٹھوکریں

واقعہ اپنی نوعیت میں نرالا ہو تو کچھ تعجب نہیں کہ اس کے رموز میں سطحی نظریں ٹھوکریں کھاتی پھریں اور ناقص عقلیں اس کی تہہ تک پہنچنے کی فکر میں تاریکی و غموض کے پرپیچ راستوں کے اندر ہاتھ پاؤں مارتی رہیں اور پھر جب کہ اس غور و فکر کے اندر کوئی ذاتی جذبہ بھی کارفرما ہو۔

جس طرح پہلی تاریخ کے چاند پر غور کرنے والا شخص بسا اوقات اپنی قوتِ متخیلہ کی امداد سے بہت سے ایسے چاند دیکھ لیتا ہے جن کا وجود نہیں ہے اور کبھی یقین بھی کر لیتا ہے کہ بیشک میں نے چاند دیکھا، حالانکہ چاند کا پتہ نہیں اور کسی کے انتظار میں دروازہ کی کھٹکھٹاہٹ پر کان لگانے والا ہر مرتبہ اس کا احساس کرتا ہے کہ کوئی پکار رہا ہے، یا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح کسی خاص جذبہ کے ماتحت عقل پر زور دینے والا بہت سی باتوں کو حقیقت کے لباس میں دیکھنے لگتا ہے۔

حالانکہ ان کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

بے شک جس طرح پہلے کا علاج یہ ہے کہ وہ نظر کو گاڑ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جس کو چاند سمجھ رہا ہے وہ ایک خط وہمی ہے اور پورے طور سے دھیان کرکے سنے تو معلوم ہو کہ اس کی سنی ہوئی آواز خود اسی کے کانوں کی پیداوار ہے اسی طرح اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ہر قسم کے جذبات سے صاف کرکے حقیقت پر بغیر کسی لگاوٹ کے غور کرے اور اپنے خیالات کا عقلی و نقلی مسلمہ معتقدات کے معیار کے مطابق جائزہ لے تو معلوم ہو جائے گا کہ جسے وہ حقیقت سمجھتا تھا وہ سرابِ خیال ہے۔

۱۳ رجب اور امیر المومنینؑ کی ولادت خانہ کعبہ کا واقعہ خود اپنی نوعیت میں بے نظیر تھا اور پھر عام اعتقادات نے ظاہری ترتیبِ خلافت کو ترتیب فضیلت کا معیار قرار دے کر ذہنیتوں میں جو جمود پیدا کر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کی ہر فضیلت پر جو حضرت کی ذات سے مخصوص ہے اسی جذبہ کے تحت میں نظر کی گئی کہ وہ اپنے ذاتی خیالات و جذبات میں رخنہ انداز ہے۔ لہٰذا کوشش سے ایسے وجوہ کی تلاش کی جائے جو اس فضیلت کو پامال یا کم سے کم مشکوک بنا دینے کا ذریعہ ہو سکیں۔ چنانچہ ولادت امیر المومنینؑ کے متعلق بھی طرح طرح کے اعتراضات پیش کرکے پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن پر اسلامی احادیث و سیر کی روشنی میں منصفانہ نظر ڈالنا تحقیق پسند انسان کا فرض ہے۔

maablib.org

پہلا اعتراض

کعبہ کے احترام پر گستاخانہ حملہ

"امیر المومنینؑ کی ولادت خانہ کعبہ کے وقت کعبہ قبلہ نہ تھا بُت خانہ تھا تو ایک بُت خانہ میں پیدا ہونا کون سے شرف کی بات ہے"

اس اعتراض کی جو نوعیت ہے وہ درحقیقت بیت اللہ الحرام خانہ کعبہ کی توہین اور اس کی عظمت وجلالت کی سبک اندیشی پر مشتمل ہے۔

اعتراض سے صاف ظاہر ہے کہ کعبہ کو جو کچھ شرف حاصل ہوا وہ قبلہ ہونے کے بعد سے اور اس کے قبل وہ عام بُت خانوں کے مثل ایک بُت خانہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکل تاریخ وحدیث اور اسلامی آثار سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ سرزمین مکہ کا یہ مقدس گھر جس کا نام کعبہ ہے، اپنے احترام وجلالت میں کسی خاص وقت وزمانہ کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ اوّل مبداء تکوین ہی سے اس کی جلالت قدر اور رفعت وعظمت محفوظ تھی۔ وہ وقت کہ جب بنی آدم کا وجود نہ تھا اور ورقِ عالم وجودِ انسان کے نقش سے سادہ تھا اسی وقت یہ گھر اپنے مرتبہ وعظمت میں مخصوص امتیاز کا مالک تھا اور اسی وجہ سے جب بنی آدم کا وجود ہوا تو ان کے لئے طواف وعبادت کے واسطے یہی گھر منتخب ہوا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

انّ اوّل بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین فیہ اٰیات بیّنات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان اٰمنا وللہ علی

الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین (سورۃ آل عمران پ۴)

"یقین جانو کہ سب سے پہلا گھر جو بنی آدم کے لئے قرار دیا گیا، وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے، وہ مبارک ہے اور تمام عالم کی ہدایت (کا باعث) ہے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، جیسے مقام ابراہیم، جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے اور خدا کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج واجب ہے، اس شخص پر جو اس کی قدرت رکھتا ہو اور جو شخص کفر اختیار کرے (کرنے) خدا تمام عالم سے بے نیاز ہے۔"

تفسیر بیضاوی میں جو اہل سنت کی مستند کتاب ہے، آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

ھو اول بیت بناہ آدم فانطمس فی الطوفان ثم بناہ ابراھیم وقیل کان فی موضعہ قبل آدم بیت یقال لہ الضراح ولطوف بہ الملٰئکہ فلما اھبط آدم امر بان یحجۃ ولطوف حولہ ورفع فی الطوفان الی السماء الرابعۃ یطوف بہ ملٰئکۃ السماء (طبع اسلام ۱ صـ۱۸۱)

"یہ سب سے پہلا گھر ہے جس کو آدمؑ نے تعمیر کیا، لیکن طوفانِ نوح میں وہ بے نشان ہو گیا۔ پھر حضرت ابراہیمؑ نے اس کی تعمیر کی۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ پر حضرت آدمؑ کے پہلے ایک گھر تھا جس کا نام تھا "ضراح"، اور ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے، جب آدمؑ زمین پر اتارے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ اس کا حج کریں اور اس کے گرد طواف کریں اور طوفانِ نوح میں آسمانِ چہارم پر اٹھا لیا گیا کہ ملائکۂ آسمان اس کا طواف کریں۔"

دوسری آیت:۔ واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد امنا

واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام رب انہن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم یشکرون۔ (سورۃ ابراہیم پ ۱۳)

"اور جبکہ کہا ابراہیمؑ نے پروردگار اس شہر کو جائے امن قرار دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بچا۔ اس بات سے کہ ہم بتوں کی پوجا پاٹ کریں۔ پروردگارا! یہ بُت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوئے ہیں۔ تو جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے ہے۔ اور جو میری نافرمانی کرے تو مغفرت و رحم تیرا کام ہے۔ پروردگارا! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو ساکن کیا ہے ایسی وادی میں جو بے زراعت ہے تیرے محترم گھر کے پاس۔ بارالہا تاکہ یہ نماز کو قائم کریں۔ اب تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف موڑ دے اور ان کو میووں کے ساتھ رزق پہنچا۔ اس لئے کہ یہ تیرا شکر ادا کریں"

علامہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:۔

عند بیتک الذی حرمت التعرض لہ والتھاون بہ اولم یزل معظما ممنعا تھابہ الجبابرۃ او منع منہ الطوفان فلم یستول علیہ ولذالک سمی عتیقا ای اعتق منہ۔

"تیرے محترم گھر کے پاس یعنی وہ گھر جس سے تعرض کو اور جس کی توہین کو تو نے حرام قرار دیا ہے یا جو ہمیشہ سے معظم و محترم رہا ہے کہ بڑے بڑے اہل

جبروت اس سے خوف کرتے تھے یا طوفانِ نوح کو اس سے روک دیا گیا کہ اس پر غلبہ نہ پا سکا۔ اسی وجہ سے اس کا نام عتیق ہوا یعنی یہ طوفان سے آزاد کیا گیا ہے۔"

ان تینوں آیتوں سے بضمیمہ تفسیر چند باتوں کا انکشاف ہوتا ہے:۔

۱۔ کعبہ عالم کے مکانات میں سب سے پہلے خلق ہوا ہے۔

۲۔ وہ خدا کی طرف سے متبرک قرار پایا ہے۔

۳۔ آدمؑ کو سب سے پہلے اس کے طواف و حج کا حکم ہوا اور طوفان کے زمانہ میں ملائکہ اس کا طواف کرتے رہے۔

۴۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا تھی "عند بیتک المحرم" "تیرے محترم گھر کے پاس" اس سے ظاہر ہے کہ خلیل اللہ کے زمانہ سے کعبہ کا احترام بجائے خود ثابت ہے

۵۔ طوفانِ نوح جو تمام عالم کو محیط ہو گیا تھا وہ بحکمِ خدا اس مقام سے علیحدہ تھا اور خانۂ کعبہ اس سے محفوظ تھا۔

اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کی تعمیر جس اہتمام اور جن ہاتھوں سے ہوئی وہ اس گھر کی جلالت و عظمت ثابت کرنے کیلئے بہت کافی ہے۔

سب سے پہلے معمار اس گھر کے ملائکہ مقربین ہیں کہ انہوں نے خدا کے حکم سے آکر اس کی تعمیر کی جس کا تذکرہ علامہ قطب الدین حنفی کی کتاب الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام (مطبوعہ مصر صـ۱۳) میں موجود ہے۔

دوسری تعمیر حضرت صفی اللہ آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی (صـ۱۳ کتاب الاعلام) تیسری تعمیر اولادِ آدم کے ہاتھوں ہوئی اور چوتھی تعمیر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھوں سے ہے۔ جس کے متعلق علامہ قطب الدین حنفی لکھتے ہیں:۔

کان ابراهیم علیه الصلوٰة والسلام یبنی واسمٰعیل ینقل له الاحجار علی عاتقه فلما ارتفع البنیان قرب له المقام

فکان یقوم علیہ ویبنی ویحوله لہ اسمعیل فی نواحی البیت حتی انتہیٰ الی موضع الحجر الاسود فقال ابراھیم لاسماعیل یا اسمٰعیل ایتنی بحجر اضعہ ھنا یکون علما للناس یبدؤن منه الطواف فذھب اسمٰعیل فی طلبه فجآء جبرئیل علیہ السلام الی سیدنا ابراھیم بالحجر الاسود وکان اللہ عزّ وجل استودعه جبل ابی قبیس عند طوفان نوح فوضعه جابرئیل علیہ السلام فی مکانه وبنی علیہ ابراھیم وھو حینئذ یتلألا نورا فاضاء بنورہ شرقا وغربا ویمینا وشمالا۔

"حضرت ابراہیمؑ تعمیر کرتے تھے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے کاندھے پر پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ جب دیوار بلند ہوگئی تو حضرت ابراہیمؑ پتھر پر کھڑے ہوتے اور تعمیر کرتے تھے اور اسمٰعیلؑ مختلف اطراف میں اس پتھر کو منتقل کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حجرِ اسود کی جگہ تک پہنچے۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر لاؤ تاکہ اس کو یہاں رکھ دوں، وہ لوگوں کے لئے علامت رہیگا کہ اسی سے طواف کی ابتداء کریں۔ اسمٰعیلؑ تو پتھر ڈھونڈنے کیلئے گئے، ادھر جبرئیلؑ ابراہیمؑ کے پاس حجرِ اسود کو لے کر آئے۔ خدا نے طوفانِ نوحؑ کے زمانہ میں اسے کوہ ابو قبیس میں ودیعت کر دیا تھا۔ جبرئیلؑ نے اس کی جگہ پر رکھا، اور ابراہیمؑ نے اس پر تعمیر کی اور حجرِ اسود اس زمانہ میں اپنے نور و ضیا سے چار طرف دنیا کو روشن کئے ہوئے تھے" (کتاب الاعلام صفحہ ۳۲)

اس انتظام و اہتمام سے خدا کے حکم سے جس گھر کی تعمیر ہوئی ہو، اس کے شرف و عظمت کا کیا پوچھنا؟ بلکہ اس صورتِ حال سے صاف ظاہر ہے کہ کعبہ کا شرف اور اس کی عظمت قبلہ مسلمین ہونے کے بعد سے نہیں ہے۔ بلکہ روزِ اوّل جب کہ قسّامِ ازل فضل و شرف کی تقسیم کر

رہا تھا اس وقت تمام امکنۂ عالم میں کعبہ معزز و ممتاز ہو گیا تھا اور اس کو شرف و عظمت حاصل ہو چکا تھا۔ کعبہ میں بتوں کے رکھ دینے سے کعبہ کی عظمت گھٹ نہیں سکتی بلکہ یہ کفار مکہ کی نافہمی اور ناقدرشناسی تھی کہ انہوں نے ایسے متبرک و باعظمت مقام کو اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کیلئے منتخب کیا اور درحقیقت اگر غور کیا جائے تو اس کا باعث بھی کعبہ کی عظمت و شرف ہی تھا۔ چونکہ تمام انبیاء و رسل کی زبان سے کعبہ کی عظمت گوش زد ہو کر دلوں میں راسخ ہو گئی تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اپنے معبودوں کے لئے اس گھر سے بہتر کوئی جگہ نہ پائی لیکن اس کی وجہ سے کعبہ کی عظمت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

فتح مکہ ۸ھ میں ہوئی ہے اور بتوں کا اخراج اسی سال ہوا ہے۔ یہ رسولؐ کی زندگی کا تقریباً آخری دور تھا۔ معترض کے مذاق کے موافق اس کے پہلے کعبہ بت خانہ تھا اور بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تحویل قبلہ اس سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ایک بتخانہ کو قبلہ مسلمین بنا دیا؟

اسی طرح وجوب حج کی آیت بھی ۵ھ میں اتری ہے جو بت شکنی کے تین سال پہلے کا واقعہ ہے تو کیا خدا نے بتخانہ کا حج و طواف مسلمانوں پر واجب کیا تھا؟

عبدالمطلبؑ کے زمانہ میں ابرہہ کا حملہ اور اصحاب فیل کی یورش اور قدرت خدا سے ابابیل عسکر کے ہاتھوں اس کی تباہی قرآن مجید کے صفحات پر موجود ہے۔ کیا خدا کی طرف سے ایک بتخانہ کی حفاظت یوں ہی کی جاتی ہے؟

معلوم ہوا کہ بتوں کے رکھ دینے سے کعبہ کا شرف گھٹ نہیں گیا تھا۔ اسی وجہ سے کعبہ کے قبلہ بنانے اور اس کا حج واجب کرنے میں بتوں کے ہٹنے کا انتظار نہیں کیا گیا اور ابرہہ کے حملے سے حفاظت بھی اخراج اصنام پر موقوف نہیں رہی۔

کعبہ بیت اللہ الحرام تھا جس کا حج و طواف ہمیشہ سے واجب ہے اور چونکہ تمام امکنۂ عالم میں افضل و بہتر تھا خدا کی طرف سے امیرالمومنینؑ کی ولادت کیلئے منتخب ہوا اور اس نے اپنی قدرت و حکمت سے بند دروازہ کو چھوڑ کر نیا در بنایا اور اپنے بندۂ خاص کی ولادت کیلئے اپنے خاص گھر کو خالی کر دیا اور لطف یہ ہے کہ کعبہ کے دامن پر بتخانہ کے نقطہ کو کہ جو دھبہ لگایا گیا تھا اس کے چھڑانے کا سہرا بھی اسی مولود کے سر بندھا اور دوش نبیؐ پر قدم رکھ کر کسر اصنام اسی ہستی کے دفترِ فضائل کا ایک مختصر باب ہے۔

دوسرا اعتراض

"پیدائش کے وقت زچہ جس طرح کے نجاسات سے آلودہ ہوتی ہے، وہ کسی طرح کعبہ کی طہارت و عزت سے مناسبت نہیں رکھتے لہٰذا یہ روایت ماننے کے قابل نہیں ہے"

یہ سوال درحقیقت خداوندِ عالم پر اعتراض کی شان رکھتا ہے بعد اس کے کہ شیعہ وسنی دونوں فریق کی کتابوں سے یہ مطلب بالکل ثابت ہے کہ امیرالمومنین علیؑ کی ولادت خداوندِ عالم کے حکم سے کعبۂ مشرفہ کے اندر ہوئی۔ اور فاطمہ بنت اسد کو خداوندِ عالم نے اپنی قدرتِ کاملہ کے ساتھ کعبہ کے اندر جگہ دی، تو اب اس سوال کا موقع ہی نہیں رہتا کہ کعبہ مطہر ہے اور ولادت کے وقت زچہ نجاست سے آلودہ ہوتی ہے۔

معترض کی نظر میں شاید نظامِ عادی غیر ممکن التبدل اور خداوندِ عالم اس کے تغیر و تبدل سے عاجز ہے اور خدا کا دائرہ قدرت و اختیار تنگ ہے۔ جن جن چیزوں کا

وجود عقلاً محال ہے ان سے تو بیشک قدرت کا تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن جو چیزیں عقلاً محال نہ ہوں اور امکانی حدود کے اندر ہوں ان کا نظام عادی کے خلاف واقع ہونا کسی عقلی بداہت یا نظریہ کے خلاف نہیں ہے۔

ولادت کے وقت عورتوں کا معمولی نجاسات سے ملوث ہونا نظام عادی کے مطابق سہی مگر عقلاً ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی عقلی فیصلہ موجود ہے۔ ایسی صورت میں جناب خداوند عالم نے فاطمہ بنت اسد کو اپنے حکم سے کعبہ کے اندر داخل کیا اور اس ولادت کو وہاں واقع ہونے دیا تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس نے اپنے معزز و محترم گھر کی طہارت کا خیال رکھا ہے۔

اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ مولود تھا جس کی طہارت کا خداوند عالم اپنی قوت قاہرہ کے ساتھ ضامن ہو چکا تھا اور اس کی پاکیزگی پر نہ ٹلنے والا ازلی ارادہ قائم تھا اور اسی بناء پر اسلامی کتب احادیث میں ایسے تصریحات موجود ہیں جو اس مقدس ذات کی غیر معمولی طہارت کا پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شادی مصری نے کنوز الدقائق میں جناب رسالتمآبؐ سے روایت کی ہے۔ لا ینبغی لاحد ان یجنب فی المسجد الا انا و علی "کسی شخص کو جائز نہیں کہ وہ مسجد میں جنب ہو سوائے میرے یا علی کے"

اور ابوسعید خدری کی روایت ہے۔ قال رسول اللہ یا علی لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری و غیرک

حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ اے علیؑ کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس مسجد میں جنب ہو، سوائے میرے اور تمہارے۔"

اور شیخ سلیمان بلخی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں روایت کی ہے

کہ حضرت رسولؐ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا:۔

ان علیاً منی بمنزلۃ ھٰرون من موسیٰ وھو منی ولا یحل لاحد ان ینکح فیہ النساء الا علی وذریتہ

اس قسم کے بہت سے احادیث کتب اہل سنت میں موجود ہیں اور ان کے علاوہ اگر ان احادیث پر نظر کی جائے جن میں جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بتول نام ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے تو صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی طہارت اس حد پر تھی کہ وہ اوقات جن میں عام افراد نجس سمجھے جاتے ہیں ان میں بھی ان حضرات کی طہارت اپنی حالت پر باقی رہتی تھی اور ان حضرات کے دامن تک نجاست کا گزر نہ تھا۔

پھر ان احادیث کو دیکھتے ہوئے جو مستند اسلامی کتب میں موجود ہیں خانہ کعبہ میں امیر المومنینؑ کی ولادت میں کونسا استبعاد ہو سکتا ہے؟ مولود جب اتنا مطہر و معصوم تھا تب ہی خالق کائنات کی جانب سے خانہ کعبہ کو جس کی تطہیر کا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو حکم ہو چکا تھا اور طہرا بیتی کہہ کر اس کی طہارت میں اہتمام کا اظہار کر دیا گیا تھا اس ولادت کے لئے خالی کر دیا گیا اور بیت اللہ میں ولی اللہ کی ولادت ہوئی۔

تیسرا اعتراض

"یہ روایت کتب اہل سنت میں منقول نہیں ہے"

اس کے لئے ان اجلہ علمائے اہل سنت کا نام لکھ دینا کافی ہے جن کا ذکر کرنا اس روایت کو اس کے صحت و اعتبار کا ضامن ہے۔

ابن مغازلی شافعی مصنف کتاب مناقب، علامہ بدخشی مصنف نزل الابرار، کمال الدین

محمد بن طلحہ شافعی مصنف مطالب السئول، ملا محمد صالح ترمذی کشفی مصنف مناقب مرتضوی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی مصنف مدارج النبوۃ، مولوی محمد مبین فرنگی محلی مصنف وسیلۃ النجاۃ، سبط ابن جوزی مصنف تذکرۃ خواص الائمہ علی بن برہان الدین شافعی مصنف انسان العیون، موفق بن احمد خوارزمی مصنف کتاب مناقب، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب ازالۃ الخفاء۔

مؤخر الذکر بزرگ یعنی بیہقی ہند حضرت محدث دہلوی نے تو صاف صاف اس روایت کے تواتر کی گواہی دی ہے اور تحریر فرماتے ہیں :۔

قد تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المؤمنین علیا فی جوف الکعبۃ فانہ ولد یوم الجمعۃ الثالث عشر من شہر رجب بعد عام الفیل بثلثین سنۃ فی الکعبۃ ولم یولد فیہا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ۔

اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے امیر المومنینؑ کی ولادت عین کعبہ کے اندر واقع ہوئی اور آپ روز جمعہ ۱۳ رجب عام الفیل سے تیس برس کے بعد کعبہ میں پیدا ہوئے اور کعبہ کے اندر کوئی شخص آپ کے قبل اور آپ کے بعد پیدا نہیں ہوا۔"

اس عبارت سے جہاں اس واقعہ کا تواتر ثابت ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت حضرت سے مخصوص ہے اور آپ کے قبل و بعد کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا مگر کیا کہا جائے تعصب کو کہ جب امیر المومنینؑ کی اس فضیلت کا انکار نقش بر آب ہوا اور اسلامی تاریخ نے دشمنوں پر ہاتھ رکھ دیا تو یہ قول تراشا گیا کہ یہ فضیلت امیر المومنینؑ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حکیم بن حزام بھی جاہلیت میں کعبہ کے اندر پیدا ہوا تھا۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایسے متبحر عالم اپنی کتاب میں کیوں لکھ دیتے ہیں کہ لم یولد فیہا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ "علیؑ کے پہلے اور ان کے بعد کوئی شخص کعبہ میں پیدا نہیں ہوا"

اور اخطب خوارزم مناقب میں لکھتے ہیں لم یولد فی البیت قبلہ احد وھی فضیلۃ خصہ اللہ بہا اجلالا لہ واعلاء لمرتبتہ۔

"علی کے قبل بیت اللہ میں کوئی شخص پیدا نہیں ہوا اور یہ وہ فضیلت ہے جس کو خدا نے اجلال واحترام کی غرض سے آپ کے ساتھ مخصوص قرار دیا"

کیا یہ لوگ جاہل تھے؟ تنگ نظر تھے؟ یا شیعہ تھے؟ یا تاریخ وحدیث سے بے خبر تھے؟ یقیناً ان مستند علماء کے تصریحات کے بعد اس خیال کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

معراجِ انسانیت
سیرتِ مرتضوی کی روشنی میں

رسولؐ کے بعد دوسری معیاری شخصیت جو ہمارے سامنے ہے وہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی ہے۔ آپ کی دس سال کی عمر ہے، جب پیغمبرؐ مبعوث برسالت ہوتے ہیں اور علیؑ ابن ابی طالبؑ ان کی رسالت کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہ پہلے ہی سے رسولؐ کی آغوشِ تربیت میں تھے اب اسی آغوش میں دعوتِ اسلامی کی پرورش شروع ہوئی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام نے آنکھ کھول کر انہیں دیکھا اور ان کی نگاہ وہ تھی کہ علاوہ رسالت کے پہلے رسولؐ کی رسالت کو دیکھے رہے تھے۔ خود اپنے بچپن کی کیفیت نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں بتائی ہے کہ کنت اتبعہ اتباع الفصل اثر امہ" میں رسولؐ کے پیچھے پیچھے یوں رہتا تھا، جیسے ناقہ کا بچہ ناقہ کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔ اشم ریح النبوۃ واری نور الرسالۃ" نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا اور رسالت کی روشنی دیکھتا تھا۔"

اب ظاہر ہے کہ ان کو رسولؐ سے کتنا انس ہونا چاہیے۔ وہ قرابت کی محبت الگ، جو بھائی ہونے کے اعتبار سے ہونا چاہیے اور وہ الگ جو بحیثیت ایک گھر میں رہنے کے ہونا چاہیے اور وہ اس کے علاوہ جو اپنے مربی سے ہونا چاہیے اور وہ اس کے ماورا جو ان سے بحیثیت رسول اللہؐ اور ان کے پیغام سے بحیثیت حق و صداقت ہونا چاہیے

ابھی اگرچہ ۱۰ برس کی عمر ہے، مگر عرب اور بنی ہاشم اور وہ بھی اس وقت کے دس برس کے بچے کو اپنے ہندوستان کا ایسا دس برس کا بچہ نہ سمجھنا چاہئے اور پھر وہ بھی علیؑ کا ایسا بچہ پھر اس وقت تو دس ہی برس کی عمر ہے مگر اس کے بعد ۱۲ برس رسولؐ کے مکہ میں گزرتے ہیں اور یہی انتہائی پُرآشوب اور تکالیف و شدائد سے بھرا ہوا دور ہے۔ ہجرت کے وقت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی عمر ۲۲ برس کی ہوئی۔ دس برس سے ۲۳ برس کا درمیانی وقفہ وہ ہے جس میں بچپنا قدم بڑھاتا ہوا مکمل شباب کی منزل تک پہنچتا ہے۔ یہ زمانہ جوشش و خروش کا ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ولولہ وامنگ کا ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی حرارت شباب کی یہ منزلیں اس دور میں گزر رہی ہیں۔ عام انسانوں کے لئے یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں نتائج وعواقب پر نظر کم پڑتی ہے۔ انسان ہر دشوار منزل کو سہل اور ہر ناممکن کو ممکن تصور کرتا ہے اور مضرتوں اور اندیشوں کا خیال تک دماغ میں کم لاتا ہے۔ یہاں یہ دور اس عالم میں گزر رہا ہے کہ اپنے مربی کے جسم پر پتھر مارے جا رہے ہیں۔ سر پر خس و خاشاک پھینکا جاتا ہے۔ طعن و تشنیع و شماتت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ پھر فطری طور پر ایسی سب طعن و تشنیع و شماتت ہر اس شخص کو جو رسولؐ سے وابستہ ہے اپنی ذات کے لئے بھی سننا پڑتی ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ رسولؐ کے ہم عمر یا مقابل پھر بھی سن رسیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ہم عمر جو مخالف جماعت میں تصور کئے جا سکتے ہیں وہ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ سن و سال کے لحاظ سے بھی ہر خفیف الحرکاتی پر ہر وقت آمادہ سمجھے جا سکتے ہیں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ وہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کی جو رسولؐ سے اتنی شدید وابستگی رکھتے تھے کیسی کیسی دل آزاری کرتے تھے۔ کیا کیا طعنے اور کیا کیا زخم زبان پہنچتے تھے۔ اسے کوئی راوی نہ بھی بیان کرے

تو بھی عقلی طور سے بالکل یقینی ہے۔

اب ممکن ہے ابھی دنیا علی بن ابی طالبؑ کو بالکل نہ سمجھتی ہو کہ وہ کیا ہیں مگر اب اس وقت تو تاریخ کے آئینہ میں علیؑ بن ابی طالبؑ کی وہ تصویر بھی محفوظ ہے جو ہجرت کے ایک سال بعد بدر میں اور پھر دو سال بعد اُحد میں اور پھر خیبر اور خندق اور ہر معرکہ میں نظر آتی ہے۔

جذبات کے لحاظ سے، قوتِ دل کے اعتبار سے، جرأت و ہمت کے حیثیت سے ۲۲ سال اور ۲۳ سال اور ۲۴، ۲۵ سال میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

یقیناً علیؑ جیسے ہجرت کے ایک دو اور تین سال بعد بدر و احد اور خندق و خیبر میں تھے ایسے ہی ہجرت کے وقت اور ہجرت کے دو چار سال پہلے بھی تھے۔ یہی بازو، یہی بازوؤں کی طاقت، یہی دل اور یہی دل کی ہمت، یہی جوش، یہی عزم غرض کہ سب کچھ یہی تھا جو اب بعد میں نظر آرہا ہے۔ اب اس کے بعد قدر کرنا پڑے گی کہ اس ہستی نے وہ ۱۳ برس اس عالم میں کیونکر گزارے ۔ اور کوئی غلط سے غلط روایت یہ نہیں بتاتی کہ کسی وقت علیؑ نے جوشش میں آکر کوئی ایسا اقدام کر دیا ہو، جس پر رسولؐ کو کہنا پڑا ہو، کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یا کسی وقت پیغمبرؐ کو یہ اندازہ ہوا ہو کہ یہ ایسا کرنے والے ہیں اور پلٹ کر روکا ہو کہ ایسا نہ کرنا۔ مجھے اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔ کسی تاریخ اور کسی حدیث میں غلط سے غلط روایت ایسی نہیں حالانکہ حالات ایسے ناگوار تھے کہ کبھی کبھی سن رسیدہ افراد کو جوش آگیا اور انہوں نے رسولؐ کے مسلک کے خلاف کوئی اقدام کر دیا اور اس کی وجہ سے انہیں جسمانی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ سے کسی سے تصادم ہو گیا ہو۔ اس کے متعلق جھوٹی سے جھوٹی روایت پیش نہیں

کی جا سکتی۔

یہ وہ غیر معمولی کردار ہے جو عام افرادِ انسانی کے لحاظ سے یقیناً خارقِ عادت ہے۔ یہ کسی جذباتی انسان کا کردار نہیں ہو سکتا۔ یہ ۱۳ برس کی طولانی مدت اس عمر میں جو ولولوں کی عمر ہے۔ حوصلوں کی عمر ہے بھلا ممکن ہے اس سکون کے ساتھ گزاری جا سکے۔

اس کے بعد ہجرت ہوتی ہے۔ ہجرت کے وقت وہ فداکاری پیغمبرؐ کا فرمانا کہ آج رات کو میرے بستر پر لیٹو۔ میں مکہ سے روانہ ہو جاؤں گا پوچھا حضور کی زندگی تو اس صورت میں محفوظ رہے گی۔ فرمایا ہاں مجھ سے وعدہ ہوا ہے۔ میری حفاظت ہوگی ۔۔ یہ سن کر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے سر سجدہ میں رکھ دیا۔ کہا۔ شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اپنے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا چنانچہ رسولؐ تشریف لے گئے اور آپ پیغمبرؐ کے بستر پر آرام کرتے رہے اس کے بعد چند روز مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ مکہ میں مشرکین کی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کیں اور پیغمبرؐ کی امانتیں ساتھ لیں۔ یعنی مخدرات کاشانۂ رسالت جن میں فواطم یعنی فاطمہؑ بنت محمدؐ، فاطمہؑ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر بن عبدالمطلب تھیں۔ ان کو لے کر روانہ ہوئے۔ خود مہارِ شتر ہاتھ میں لی اور حفاظت کرتے ہوئے پیادہ پا مدینہ پہنچے۔ یہاں آنے کے ایک سال کے بعد اب جہاد کی منزل آ گئی۔ اور پہلی ہی جنگ یعنی بدر میں علیؑ ایسے نظر آئے جیسے رسولؐ کے نبرد آزما معرکے سر کیے ہوئے اور کڑیاں میدان کی جھیلے ہوئے۔ اب ولولۂ حرب و ضرب یہ تھا کہ طے کر لیا تھا کہ مشرکین کے کسی علمدار کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ ادھر یہ کوشش کہ علم زمین پر نہ گرنے پائے ادھر ایک علمدار کا ہاتھ کٹتا تھا اور فوراً دوسرا ہاتھ علم پر آ جاتا تھا اور ادھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کسی علمدار کو بغیر وار کیے

ہوئے چھوڑتے نہ تھے۔ آخر علمِ کفر سرنگوں ہوا۔ علم کا گرنا دلیلِ شکست ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اُدھر کے سب سے بڑے تین سورما عتبہ شیبہ اور ولید ان میں سے صرف عتبہ کو جناب حمزہؓ نے تہ تیغ کیا۔ شیبہ اور ولید دونوں کا حضرت علیؑ بن ابوطالبؑ کی تلوار سے خاتمہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ کارنامہ جنگ کی فتح کا ضامن تھا۔ وہ تو صرف نفسیاتی طور پر عامۂ مسلمین میں قوتِ دل پیدا کرنے کے لئے اس جہاد میں فرشتوں کی فوج بھی آگئی۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ گھبرانا نہیں۔ وقت پڑے گا تو فرشتے آجائیں گے۔ حالانکہ اس کے بعد پھر کسی غزوہ میں ان کا آنا ثابت نہیں ہوا۔ اس کے باوجود احد میں علیؑ بن ابی طالبؑ نے تن تنہا بگڑی ہوئی لڑائی کو بنا کر اور فتح حاصل کر کے دکھا دیا کہ بدر میں بھی اگر فوجِ ملائکہ نہ آتی تو یہ دست و بازو اس جنگ کو بھی سر کر ہی لیتے۔ اس کے بعد خندق ہے۔ خیبر ہے حنین ہے یہاں تک کہ ان تمام کارناموں سے علیؑ کا نام دشمنوں کے لئے مرادف موت بن گیا۔ خیبر و خندق ذوالفقار اور علیؑ میں دلالت التزامی کا رشتہ قائم ہو گیا کہ ایک کے تصور سے ممکن ہی نہیں دوسرے کا تصور نہ ہو۔ یہ وہی ۱۳ برس تک خاموش رہنے والے علیؑ ہیں اور دس برس کے اندر جن کا عالم یہ ہے، مگر اسی دوران میں حدیبیہ کی منزل آتی ہے۔ اور وہی ہاتھ جس میں جنگ کا علم ہوتا تھا یہاں اس میں صلح کا قلم ہے۔ جو صاحبِ سیف تھا، وہی صاحبِ قلم نظر آتا ہے۔ اور ان شرائطِ صلح کو جن پر فوجِ اسلام کے اکثر افراد میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور اسے کمزوری سمجھا جا رہا ہے بلا کسی بے چینی اور بغیر کسی تردد و تذبذب کے حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ تحریر فرما رہے ہیں جس طرح میدانِ جنگ میں قدم میں تزلزل اور ہاتھ میں ارتعاش نظر نہیں آیا اسی طرح آج عہد نامۂ صلح کی تحریر میں ان کے

قلم میں کوئی تزلزل اور انگلیوں میں کوئی ارتعاش نہیں ہے۔ ان کا جہاد تو وہی ہے جس میں مرضیٔ پروردگار ہو۔ جس کی راہ میں تلوار چلتی تھی اسی کی راہ میں آج قلم چل رہا ہے۔ اور صلحنامہ کی کتابت ہو رہی ہے۔

اسی زمانہ میں ایک ملک بھی فتح کرنے بھیجے گئے تھے اور وہ یمن ہے۔ گروہ شمشیر زن اور صاحب ذوالفقار ہوتے ہوئے یہاں تلوار سے کام نہیں لیتے۔ انہوں نے اسلامی فتح کا مثالیہ پیش کر دیا۔ پورے یمن کو صرف زبانی تبلیغ سے ایک دن میں مسلمان بنا لیا۔ ایک قطرۂ خون نہیں بہا۔ دکھا دیا کہ فتح ممالک اسی طرح کرو۔ ملک پر قبضہ کے معنی یہ ہیں۔ اہلِ ملک کو اپنا بنا لو یہی ملک تمہارا ہو گیا۔

بہرحال ان دو شانوں کو چھوڑ کر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی زندگی کے اس دور میں بہت سے مواقع پر تلوار نمایاں نظر آئے گی۔ لا فتیٰ الّا علی لا سیف الّا ذوالفقار میں آپ کی شان مضمر معلوم ہو گی۔ مگر اب پیغمبرِ خدا کی وفات ہو جاتی ہے اس وقت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کی عمر ۳۳ برس کی ہے۔ اسے اواخر شباب بلکہ عہدِ جوانی کا زمانہ سمجھنا چاہئے۔ مگر اس کے بعد پچیس سال کی طولانی مدت حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ یوں گزارتے ہیں کہ تلوار نیام میں ہے اور آپ کا مشغلہ عبادتِ الٰہی اور آذوقہ کی فراہمی کے لئے محنت و مزدوری کے سوا بظاہر کچھ اور نہیں۔

یہ ایسی وادیٔ پُرخار ہے جس میں ذرا بھی کھل کر کچھ کہنا تحریر کو مناظرانہ آویزشوں کا آماجگاہ بنا دینا ہے۔ یہ مسلمانوں کی جنگ آزمائیوں کا زمانہ اور فتوحاتِ عظیمہ کا دور ہے جس میں اسلام قبول کرنے کے بعد گمنام ہو جانے والے افراد سیف اللہ اور فاتح ممالک اور غازی بن رہے ہیں۔ مگر کیا یہ حیرت ناک نہیں کہ جو تلوار ہر مقام پر عہدِ رسولؐ میں کار نمایاں کرتی نظر آتی تھی وہ اس دور میں کلیتہً نیام کے اندر ہے آخر کیا بات ہے کہ وہ جو ہر میدان کا مرد تھا اب گوشۂ عافیت میں گھر کے اندر ہے

اگر اس کو بلایا نہیں جاتا تو کیوں؟ اور اگر بلایا جاتا ہے اور وہ نہیں آتا تو کیوں دونوں باتیں ایک تاریخ کے طالبعلم کے لیے عجیب ہی ہیں ایسا بھی نہیں کہ وہ بالکل غیر متعلق رہے۔ نہیں اگر کبھی کوئی مشورہ اس سے لیا جاتا ہے تو وہ مشورہ دے دیتا ہے۔ کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور اس کے حل کرنے کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ حل کر دیتا ہے، مگر ان لڑائیوں میں جو جہاد کے نام سے ہو رہی ہیں اسے شریک نہیں کیا جاتا نہ وہ شریک ہوتا ہے ــــ ۲۵ سال کی طولانی مدت گزری اور اب حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی عمر ۵۸ سال کی ہو گئی۔ یہ پیری کی عمر ہے ــــ جس طرح مکہ کی ۱۳ برس کی خاموشی کے درمیان بچپنا گیا تھا اور جوانی آئی تھی۔ اسی طرح اس ۲۵ برس کی خاموشی کے دوران میں جوانی گئی اور بڑھاپا آیا۔ گویا ان کی عمر کا ہر دور صبر و تحمل اور ضبط و سکون ہی کے عالم میں آ تا رہا۔ بھلا اب کیسے تصور ہو سکتا ہے کہ جس کی جوانی گزر کر بڑھاپا آ گیا اور اس نے تلوار نیام سے نکالی وہ اب کبھی تلوار کھینچے گا اور میدان جنگ میں حرب و ضرب کرتا نظر آئے گا۔ عالم اسباب کے عام تقاضوں کے لحاظ سے تو اس پچیس برس کے عرصہ میں ولولہ و امنگ کی چنگاریاں تک سینہ میں باقی نہیں رہیں۔ رہبت کے سوتے خشک ہوئے اور اب دل میں ان کی نمی تک نہیں رہ گئی۔ اب نہ دل میں وہ جوش ہو سکتا ہے نہ بازوؤں میں وہ طاقت نہ ہاتھوں میں وہ صفائی اور نہ تلوار میں وہ کاٹ۔ مگر ۵۸ سال کی عمر میں وہ وقت آ گیا کہ مسلمانوں نے باصرار زمام خلافت آپ کے ہاتھ میں دے دی آپ نے بہت انکار کیا مگر مسلمانوں نے تضرع و زاری کی حد کر دی اور حجت ہر طرح تمام ہو گئی مگر جب آپ سریر خلافت پر متمکن ہوئے اور اس ذمہ داری کو قبول کر چکے تو کئی جماعتوں نے بغاوت کر دی۔ آپ نے ہر ایک کو پہلے تو فہمائش کی کوشش کی اور جب حجت ہر طرح تمام ہو گئی تو دنیا نے دیکھا کہ وہی

تلوار جو بدر و احد، خندق و خیبر میں چمک چکی تھی۔ اب جمل، صفین اور نہروان میں چمک رہی ہے۔ یہ نہیں کہ فوجیں بھیج رہے ہوں اور خود گھر میں بیٹھیں بلکہ خود میدانِ جنگ میں موجود اور بنفسِ نفیس جہاد میں مصروف۔ اب ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی نوجوان طبیعت جو مقابل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے چین ہو۔

چونکہ حضرت کی ہیبت فوجِ دشمن کے ہر سپاہی کے دل پر تھی اس لیے صفین میں جب آپ میدان میں نکل آتے تھے تو پھر مقابل جماعت کا پابند ہو جاتا تھا اور کوئی مقابلہ کو باہر نہ آتا تھا۔ اسے دیکھ کر آپ نے یہ صورت اختیار فرمائی تھی۔ کہ دوسرے اپنے ہمراہیوں کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے تھے۔ چونکہ جنگ کا لباس خود و مغفر اور زرہ و بکتر وغیرہ پہننے کے بعد چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے لباس بدلنے کے بعد پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ کون ہے اور آپ کبھی عباس بن ربیعہ اور کبھی فضل بن عباس اور کبھی کسی اور کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے اور اس طرح بہت سے نذرِ تیغ ہو جاتے تھے۔

لیلۃ الہریر میں طے کر لیا کہ فتح کے بغیر جنگ نہ رکے گی۔ چنانچہ پورے دن لڑائی ہو ہی چکی تھی۔ سورج ڈوب گیا تب بھی لڑائی نہ رکی۔ پوری رات جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ نقشہ جنگ بدل گیا اور صبح ہوتے ہوتے فوجِ شام سے قرآن نیزوں پر بلند ہو گئے۔ جن سے التوائے جنگ کی درخواست مقصود تھی اور یہ جنگ میں شکست کا کھلا ہوا اعلان تھا۔

یہ ۶۰ برس کی عمر میں جہاد ہے اور یہی وہ ہیں جو تیئیس برس کی عمر سے ساٹھ برس کی عمر تک کی مدت یوں گزار چکے ہیں جیسے کہ سینہ میں دل ہی نہیں اور دل میں ولولہ اور جنگ کا حوصلہ ہی نہیں۔

اب ایسے انسان کو کیا کہا جائے جنگ پسند یا عافیت پسند ماننا پڑے

سکا کہ یہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو فرائض کے پابند ہیں۔ جب فرض ہوگا خاموشی کا تو خاموش رہیں گے چاہے شباب کی حرارت اور اس کا جوش و ولولہ کچھ بھی تقاضا رکھتا ہو۔ اور اس وقت وہ کتنے ہی صبر آزما مشکلات پیش آتے رہیں اُن پہ صبر کریں گے۔ اور گھبرائیں گے نہیں اور جب فرض محسوس ہوگا کہ تلوار اٹھائیں تو تلوار اٹھائیں گے۔ چاہے بڑھاپے کا انحطاط جو تمام افراد میں اس عمر میں ہوا کرتا ہے۔ کچھ بھی تقاضا رکھتا ہو۔ اب حرب و ضرب کی سختیوں کا مقابلہ کرنے میں وہ جوانوں سے آگے نظر آئیں گے۔

یہی وہ معراجِ انسانیت ہے جہاں تک طبیعت، عادت اور جذبات کے تقاضوں میں گرفتار انسان پہنچا نہیں کرتے ہیں۔

رباعی

کروں توصیف کن الفاظ میں آقائے قنبر کی
نرالی شان دیکھو اللہ اللہ زورِ حیدر کی
ہلایا اور اکھاڑا پھر اٹھایا تول کر پھینکا
حقیقت کھول کر رکھ دی علیؑ نے بابِ خیبر کی

رباعی

خیبر میں یہ ہے دھوم کہ جرار آیا
افواجِ محمدؐ کا علمدار آیا
فی النار ہوا کفر تو کا فرار آیا
میدان میں جب حیدرِ کرار آیا

مقالاتِ سیّد العلماء

علّامہ سیّد علی نقی النقوی

حصہ ۳ سوم

مرتبہ
محمد وصی خان

رحمت اللہ بک ایجنسی
بالمقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰
فون ۲۴۳۱۵۷۷

سابق اہلحدیث اور عظیم اسکالر

حکیم سیّد محمود گیلانی

کے

تحقیقی مقالات

ناشر: رحمت اللہ بک ایجنسی
[illegible]